دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

# سب رنگ ڈائجسٹ





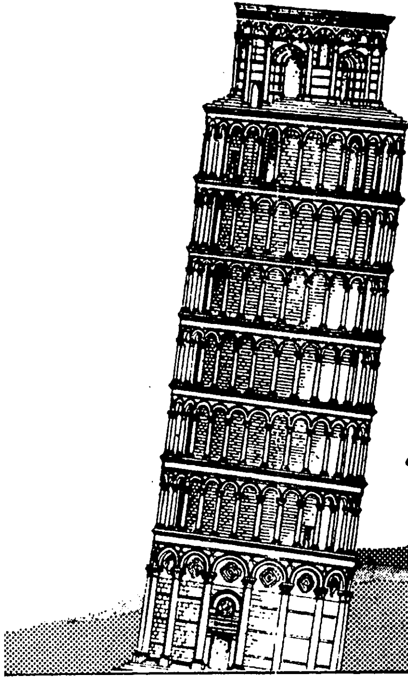


خوش ذوق قارئین کیلیے


فی پرچہ : ۲ رُوپے — شمارہ : ۳
زرِ سالانہ : ۲۱ رُوپے — جلد : ۱۰
سرِ ورق طباعت :- ایلیٹ پبلشرز لمیٹیڈ۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی
پبلشر شکیل عادل زادہ نے قاسم نورانی کے اہتمام میں "پاکستان ہیرالڈ پریس" ضیاءالدین روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵ سی ، ۴/۱۳ ناظم آباد کراچی ۱۸ سے شائع کیا



پتا :-
۴۷ — ۴۸ پریس چیمبرز ، آئی۔ آئی چندریگر روڈ ، کراچی
فون :- ۲۲۵۸۴۴
ذیلی دفتر :-
لطیف ہاؤس ، کرشن پورہ ، پشاور



# اس عجوبہ عالم کا جھکاؤ
# ہر وقت مضبوط بنیادوں
# کی اہمیّت کا احساس
# دلاتا رہتا ہے

# خود گزیدہ

جو علیحدگی کی باتیں کر رہے ہیں اور اس ملک کی ایک بڑی وحدت ختم کر کے چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے قیام کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ اپنے ساتھ بڑی زیادتی کر رہے ہیں' ہمیں ایسے لوگوں پر رحم آتا ہے' عجب کہ وہ دیوانے خود اپنے دست و بازو قلم کرنے کے درپے ہیں۔ یہ ملک ختم ہو جائے گا تو کیا باقی رہے گا؟ وہ لوگ بھی ختم ہو جائیں گے جو اب تک کسی نہ کسی طرح اپنے سر' اپنے آستانے اور اپنی بیٹیاں بچاتے ہوتے ہیں' پھر سب کچھ ختم ہو جاتے گا۔

افراد اور قوموں پر ایسے لمحے آتے ہیں جب وہ شدید ذہنی اور سماجی انتشار میں انتہا پسندانہ ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خود اپنی جڑیں کاٹنا، اپنی بنیادیں کھوکھلی کرنا اور اپنے وجود کی نفی کرنا ایسی بیماری ہے جو ان دنوں متعدی امراض کی طرح پھیلتی ہے' اس ملک میں' خوف' تشکیک' نا اعتباری' عدمِ اعتماد اور زندگی سے مایوسی کی وبا پھیل گئی ہے' کتنی افسوسناک حقیقت ہے کہ اب یہاں لوگ اس قسم کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ ملک چند مہینوں اور چند سالوں کا مہمان ہے' ہمارے ذہین اور محنت کش عوام مایوس ہو کر غیر ممالک بھاگ رہے ہیں' ہر شخص دوسرے سے ڈرتا اور شک کرتا ہے وہ پچھلے دنوں کی تمام حسین یادیں بھول گئے ہیں۔

اصل میں بات کیا ہے۔ بات ایسی نہیں جو مشکل سے سمجھ میں آئے' ہمارے قومی امراض کا علاج ہمیں خود معلوم ہے لیکن اس دھما چوکڑی اور بھاگ دوڑ میں تمام باتیں ذہن سے نکلی جا رہی ہیں' ہمارے رہبرانِ گرامی نے گزشتہ طویل مدت میں غلط سمتوں میں ہماری رہنمائی کی' ہم پچیس سال سے شدید معاشی و سماجی مسائل سے دو چار رہے، گنتی کے چند خاندانوں نے ملک کے تمام وسائل پر قبضہ کر لیا۔ ترقی اور تعمیر کے عظیم الشان منصوبوں میں ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس عرصے میں دنیا کی دوسری قومیں آگے نکل گئیں اور ہم اُن کی صورت دیکھتے رہے' ابتدا ہی میں کچھ غلطیاں ہو گئیں یہ سب کچھ افراتفری میں شروع ہوا اور افراتفری کی نذر ہو گیا، ہمارے ہاں کے مفاد پرستوں اور چالاک لوگوں نے تازہ آزاد قوم کے سادہ دل لوگوں کو ورغلایا اور شاندار ایوان تعمیر کر لیے جو ہم غریبوں کا مذاق اُڑانے کے لیے شان و شوکت سے ہماری شاہراہوں پر ایستادہ ہیں' ہم نے تین جنگیں لڑیں اور نتیجے میں گھاٹے میں رہے۔ حکومتیں رنگ بدلتی رہیں اور عجب عجب قسم کے لوگ ہم پر اپنے احکام کی یورش کرتے رہے' ہمارے ایک علاقے نے دوسرے علاقے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ایک کو دوسرے سے شکایت ہو گئی' ہم نے اپنے صوبوں میں متوازن ترقی کا عمل جاری نہیں رکھا اور پھر سب سے بڑا سانحہ یہ رونما ہوا کہ ہم سے ہمارے ملک کا ایک بڑا حصہ چھن گیا، ہمارے اپنے غیر ہو گئے۔

انتشار کی وجوہ موجود ہیں' لیکن غلطیوں کا اعادہ کرنا دوسری سنگین غلطی ہے' یہ ملک چند رہنماؤں نے نہیں بنایا تھا' اس میں سب کی آواز' سب کا لہو اور سب کا درد شامل ہے۔ ہر ترقی پزیر ملک میں ایسے مرحلے آتے ہیں تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انتشار' جنون کی شکل اختیار کر لے، اس میں ہم' عوام اپنا زیاں کر رہے ہیں' ہم خود کو کھو رہے ہیں' یہ چند سرمایہ دار اور عاقبت نا اندیش رہنما موقع پر ملک سے بھاگ کر کسی محفوظ جگہ پناہ لے لیں گے۔ جہاں ان کے قدموں کے آگے مخملیں فرش بچھایا جائے گا اور تھپکیاں دی جائیں گی، مگر لوگو! تمھارا ہمارا کیا ہو گا؟ ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے' تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا؟ تم نے بہت اُن کی آوازوں سے آوازیں ملائیں مگر کچھ سوچا کہ کیا سے کیا ہو جائے گا؟ رنگ' نسل' زبان' فرقے' علاقے کے فساد اور عناد' جدید عہد کے مہذب لوگوں کو زیب نہیں دیتے۔ یہ کس سے آزادی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟ تم کس سے آزادی کے خواہاں ہو؟ یہ کہو کہ ہمیں سرمایہ داری نظام سے آزادی' نوکر شاہی سے آزادی' تعصب سے آزادی اور شر سے آزادی درکار ہے' ایسی آزادی کے لیے جنگ کرو' چاہیے تم کسی زبان میں گفتگو کرو مگر کچھ تو خیال کرو۔ حقوق غصبی' ناانصافی' غلط فہمی دور کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں ہے کہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لو۔ اپنی زمینیں سرخ کر دو اور اپنے لہو سے نہاؤ۔

# ذاتی صفحہ

محنت عبادت ہے۔ شارٹ کٹ سے ترقیاں عارضی ہوتی ہیں۔ جس کی نیت میں فتور ہوگا، وہ کب تک کسی کو اپنے دامِ الفت میں گرفتار رکھے گا؟ سب رنگ نے جس روایت کی طرح ڈالی تھی، اُسے تین سال ہونے کو آئے۔ اِسے روایت یوں کہیے کہ سب رنگ نے جو مزاج، انداز اور تیور اختیار کیا تھا، اس نے کچھ ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ چہار سمت اس کا اتباع ہونے لگا۔ اتباع کوئی بُری چیز نہیں، پر لوگوں نے بھیڑوں کے گلّوں کی روش اختیار کی۔ وہ یہ سمجھے کہ یہی کلیدِ کامیابی ہے مگر آپ نے دیکھا کہ ان میں کتنے لوگ اپنے قدم جما سکے اور کتنے اب ڈول رہے ہیں؟ لفظ جاننا بڑی بات نہیں، لہجہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک جیسے ساز ہوتے ہیں، پر انھیں بجانے کے فن میں سبھی طاق نہیں ہو جاتے۔ محنت سبھی کرتے ہیں مگر تقلید اور اجتہاد میں فرق ہے۔ میں نے ہر ماہ اپنے اُس اضطراب کا حال رقم کیا ہے جس نے میری جان ہلکان کر دی ہے۔ یہ لفظوں کی ارزانی کی بات نہیں کہ محنتوں اور مشقتوں کا شدید اظہار کر دیا جائے، کچھ اپنی داستانِ غم بیان کی جائے۔ کچھ اپنی رودادِ اشک و خوں لکھی جائے، جو تشکیل عادل زادہ کرتا ہے۔ یہ کاغذ جو میں لکھتا ہوں پھاڑ دیتا ہوں، کیا یہ مجھ پر اعتماد کرنے والوں کے ساتھ کوئی فلرٹ ہے؟ کیا یہ صرف باتیں ہیں؟ لوگ تین سال سے کسی فریبِ نظر کا شکار ہیں؟ اتنی مدت ہو گئی، اب یہ اعتراف کھلے دل سے کر لینا چاہیے کہ سب رنگ میں اعلا درجے کے انتخاب، سلیکشن کی ندرت، موضوع کا تنوع اور اقدام کرنے کی کوئی خوبی موجود ہے۔ اس کا اپنا ایک لہجہ ہے، اس کے رنگ اپنے رنگ ہیں۔ اس ساز کا موجد بُرا بھلا جیسا بجاتا ہے مگر یہ اس کا اپنا راگ ہے۔ سب رنگ کی ہر چیز نقل ہو سکتی ہے مگر اس کی رُوح کیسے منتقل کیجیے گا۔

مشکل یہ ہے کہ لوگ لہجوں کی نقل کرتے ہیں، رنگوں کو اڑا لے جاتے ہیں۔ انھیں اعتماد نہیں ہوتا اور وہ سب رنگ کی غلطیوں کا بھی اتباع کر لیتے ہیں اور جب یہ تمام چیزیں بھی کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں کرتیں تو دل آزاری پر اتر آتے ہیں۔ داد نہیں دی جا سکتی تو یہ مردم آزار رویہ بھی اختیار نہ کیا جائے، اس سے تو کام کرنے والوں کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ میری تین سال کی محنت رائیگاں چلی جائے، یہ پرچہ بند ہو جائے جس نے اردو صحافت میں کچھ ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ چنانچہ وہ جو جی میں آتا ہے، سب رنگ کے خلاف لکھتے ہیں وہ ادب کا واویلا مچاتے ہیں اور کبھی ادب کے دائرے کا تعین نہیں کرتے۔ وہ سب رنگ پر طنز کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ سب رنگ میں عالمی ادب کے شہپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔ سب رنگ نے دُنیا کے متعدد ادیبوں کی شاہکار کہانیاں اپنے قارئین کو پڑھوائی ہیں۔ سب رنگ نے جوہر تلاش کیے ہیں اور لوگوں سے خوشامد اور جبر کر کے لکھوایا ہے۔ سب رنگ نے ایک ایک سطر پر توجہ دی ہے۔ اور خالص ادبی پرچوں میں شائع ہونے والی تحریروں کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ ایک دلچسپ بات ہے کہ جب ہم برِصغیر کے افسانہ نگاروں کو شائع کرتے ہیں، چاہے وہ بیدی، منٹو اور عصمت کی نکیلی، کٹیلی اور زہریلی کہانیاں ہوں، تو ہم سے کہا جاتا ہے اب تم ادب کی طرف مائل ہو۔ حالانکہ ہم پہلے ہی سے عالمی ادب شائع کر رہے ہیں۔ وہ پُراسرار سلسلوں کی نفی کرتے ہیں مگر مجنوں گورکھپوری کی "سمن پوش" اور رائیڈر ہیگرڈ کی "عذرا" اور "عذرا کی واپسی" پوری دلچسپی سے پڑھتے اور شائع کرتے ہیں۔ انھی لوگوں نے برام اسٹوکر، ڈینس وھیٹلے کو تمام کا تمام اپنے رسالوں میں اپنے ناموں سے منتقل کر دیا ہے۔ اب وہی لوگ مصلح اور محبِ وطن بن گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں وہ کس زبان سے ہمارے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ یہ کیسی رقابت، یہ کیسا حسد ہے؟ کیا عشقیہ اشعار، رومانی افسانے، جرائم کی فلمیں، کیا ٹیلیویژن کے بوس و کنار کے مناظر، کیا شارعِ عام پر نظر آتے والا جدید فیشن، کیا اخبارات میں مار دھاڑ، شرمناک جرائم اور اغوا کی خبریں ذہن پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتیں؟ کیا ہمارے پڑھنے والے یہ خبریں نہیں دیکھتے اور پڑھتے؟ کیا وہ تمیز بھی نہیں کرتے کہ فکشن کیسا ہوتا ہے؟ کیا تخیل پر موضوع کی کوئی قید لگائی جا سکتی ہے؟ کیا خالص ادب کے سوا وقت گزاری اور تفریح کے لیے کچھ چیزیں پیش کرنا جرم ہے؟ تمام دُنیا میں ایسے ادب کی بھرمار ہے اور شاید ساری دنیا مُجرم ہے۔ ایک شخص کو زک پہنچا کر وہ رَو، مطالبے اور تقاضے نہیں دبائے جا سکتے جو جدید عہد کا لازمہ ہیں۔

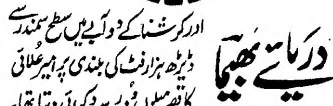
بہر حال میں آپ کو مژدہ سُناؤں کہ اس ماہ سب رنگ کی اشاعت پاکستان میں شائع ہونے والے اب تک کے تمام جریدوں کی معیاری اشاعت سے آگے نکل گئی ہے۔ یہ باتیں دل جلاتی رہیں گی تاہم میرے رفقا اور میں محنت میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم اپنی خامیاں دُور کرتے رہیں گے اور ستھرا، اور نکھرا، اور خوب صورت پرچہ نکالیں گے۔ ہم کام کرتے رہیں گے کہ اب تک ہم نے یہی کیا ہے۔

اس شمارے میں دلچسپ اور خوب صورت کہانیوں کی وہی اوسط ہے جو گزشتہ ماہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اچھی چیزیں پڑھنے والے یہ مجموعہ بھی پسند کریں گے۔

محبت ناموں میں صرف اظہارِ محبت ہی نہیں ہوتا، کچھ اور باتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں نے شکووں کا دفتر کھول دیا۔ وہ شکوے آپ سے نہیں تھے، آپ سے تو یہ کہنا تھا کہ آپ کی محبت میں کہاں کہاں رُسوا ہونا پڑ رہا ہے۔ کیسے کیسے لوگ پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور خنجر لیے کھڑے ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ مر جائے گا، اس کا گریبان چاک ہے۔ خنجر آزمائیے مگر اس کی جنوں خیزیاں کہاں کم ہوں گی؟ کچھ اور سر پھرے میدان میں آ جائیں گے۔

الیاس صاحب کا اصرار ہے کہ میں اپنی باتیں ختم کروں۔ میں رُخصت ہُوا، اب صفحہ اُلٹیے اور الیاس صاحب نے تاریخوں سے جو اخذ کیا ہے، اُسے پڑھیے۔

# اندر کا آدمی



**دریائے بھیا**

اور کرشنا کے دوآبے میں سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ کی بلندی پر امیر عُلائی کا قصر میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا۔

بیجاپور کا یہ حصہ جہاں یہ قصر کھڑا تھا، قدیم مندروں اور عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ علائی امیرانِ صدہ سے تعلق رکھتا تھا بیجاپور کی یہ جگہ اسے اتنی پسند آئی کہ اس نے یہیں مستقلاً اقامت اختیار کرلی اور زرِ کثیر صرف کر کے اپنے لیے سنگِ سماق سے یہ محل تعمیر کرایا۔ اس کے گرداگرد مضبوط پتھروں کی دیواریں کھڑی کردی گئیں اس سنگین چہار دیواری کے اندر دور تک کنارے کنارے خدمتگاروں اور سپاہیوں کے لیے رہائش گاہیں اور بیرکیں بنی ہوئی تھیں، درمیان میں سبزہ اور پھولدار درختوں کا تختہ تھا، اس حد سے گزر کر ایک پھاٹک کی راہ سے آپ اس حصے میں داخل ہوں گے جہاں امیر عُلائی کے عزیز و اقارب رہتے تھے، پھر ایک مسجد ملے گی، مسجد سے ملحق سنگِ مرمر سے زیادہ نرم و نازک اور سفید پتھر کا وہ قصر ہے جس میں امیر عُلائی رہتا تھا۔

امیر کی طبیعت میں تلوّن اور بے قراری بہت زیادہ تھی، احساس کمتری مرض کی حد تک داخل تھا۔ اس کے لیے یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی تلوّن مزاجی اور بے چین طبیعت کی وجہ سے کسی بھی عورت سے پائدار محبت نہیں کرسکتا۔ حسین سے حسین عورت آتی اور کچھ ہی دنوں بعد طبیعت سے اُتر کر یا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں غائب ہوجاتی یا پھر کسی خدمت گار اور مقربِ بارگاہ کو بخش دی جاتی۔ حسین عورتوں کی سواریاں جب قصر میں داخل ہوتیں تو خدمت گاروں اور سپاہیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی، جو ذرا منتقی ہوتے دل ہی دل میں افسوس کرتے کہ درندہ ان بیچاریوں کے دامن عصمت کو بھی چاک کردے گا، جواں تماشوں کو دیکھنے کے عادی ہوچکے تھے اور خود بھی حسین عورتوں کے لیے ہوا و ہوس رکھتے تھے، دعائیں مانگ مانگ کر دن گزارتے کہ خدا کرے ان میں سے ایک آدھ انھیں بھی انعام میں عطا ہوجائے۔

امیر عُلائی کے تلوّن کی طرح اس کی سفاکی اور بربریت بھی مشہور تھی، خفگی اور ناراضی کا اظہار عموماً قتل کی صورت میں ہوتا تھا، اس کی سپاہ خدمت گار اور مقربین بارگاہ نہایت ہوشیاری، چالاکی اور اعلیٰ درجے کی چاپلوسی میں شب و روز گزارتے تھے، ممکن تھا اس کی سفاکی اور بربریت کا خوف لوگوں کو اس سے دور کردیتا لیکن امیر عُلائی میں کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جو کشش رکھتی تھیں، جس پر مہربان ہوتا، توقع سے زیادہ نواز دیتا۔ اس نوازش میں مال دولت اور زر و جواہر ہی کی قید نہ تھی بلکہ حسین عورتیں تک تقسیم کردی جاتی تھیں، دشوار گزار پہاڑیوں میں گھرا ہوا قصر عُلائی بظاہر تغلق حکومت کا باجگزار تھا لیکن اپنے جملہ معاملات میں آزاد اور خود مختار تھا، امیر عُلائی کی سواری اسی تزک و احتشام سے گزرتی جس طرح شاہوں کی سواریاں گزرا کرتی ہیں، اس کی رعایا گزرگاہ کے آس پاس اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں کھڑی رہتی، اس میں ان کی خوشیوں کی جگہ جبر اور خوف کو زیادہ دخل حاصل ہوتا۔

حرم سرا کے گرد بنی ہوئی غلام گردشوں میں مسلح خواتین گشت لگاتی رہتیں۔

بڑے بڑے تناور اور گھنے درختوں کے درمیان سے عُلائی کی شاہانہ سواری گزر رہی تھی، جلو میں خونخوار نیزہ بردار اور بھیانک تلوار باز عریاں شمشیریں لہراتے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، امیر عُلائی کی نظریں سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے تماشائیوں پر پڑ رہی تھیں، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی یکایک امیر عُلائی کا داہنا ہاتھ اٹھا اور کرخت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، وحشت ناک چہروں والے خدام ایک دم مستعد ہوگئے اور ان کی نظریں امیر عُلائی کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر ٹک گئیں، ہاتھ کو حرکت ہوئی اور گلاب کا ایک پھول ہوا میں اڑتا ہوا ایک دوشیزہ کے سر پر جا گرا۔ خدام دوڑے اور اس دوشیزہ کو مجمع سے کھینچ کر امیر عُلائی کے رتھ تک لیے چلے گئے۔ سہمی ہوئی، خوفزدہ اور آہ و بکا کرتی ہوئی دوشیزہ کو زبردستی امیر عُلائی کے آغوش میں ڈال دیا گیا۔ مجمع میں معمولی سی، خوفزدہ اور سہمی سہمی سی ہلچل مچی اور پھر ایک بوڑھا دیوانہ وار

---

**ر س** کہانی کے تاریخی پس منظر کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ تاریخِ فیروز شاہی (ضیاءُ الدین برنی)، تاریخِ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ)، تمدّنِ ہند (سید علی بلگرامی) منتخب التواریخ (ملا عبد القادر بدایونی) تاریخِ جنوبی ہند



الیاس سیتاپوری

امیر کے رتھ کی طرف بڑھا اور گلا پھاڑ کے چلایا۔ "ظالم امیر! میری بیٹی کو چھوڑ دے۔ یہ پاپ ہے!"

یہ کہتے کہتے وہ رتھ کے سامنے آ گیا۔ رتھ بان کو کچھ تامل ہوا لیکن امیر عُلاقی نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا۔ "رفتار جاری رہے!" گھوڑے کے سُم اور رتھ کے پہیئے بوڑھے کے سینے کی ہڈیوں کو توڑتے اور پیٹ کی ناند میں ڈوبتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک کربناک طویل چیخ گھٹتی ہوئی دُور تک چلی گئی۔ امیر عُلاقی نے لطف اندوز ہو کر قہقہہ لگایا۔ آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "بے وقوف یہ بھی نہیں جانتا کہ رتھ کے آگے لیٹنے کا کیا انجام ہو گا!" پھر آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "رب العالمین! تو عالم الغیب ہے تو خوب جانتا ہے کہ اس بوڑھے کو ہم نے نہیں ہلاک کیا۔ اس نے خودکشی کی ہے اور خودکشی کرنے والوں کا ٹھکانا بے شک جہنم ہے۔"

جب وہ لڑکی کو لے کر محلسرا میں داخل ہوا بہت خوش تھا۔ لڑکی اب بھی سسک رہی تھی۔ عُلاقی کے کمرۂ خاص کی مسہری پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسے مسہری کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ چاروں طرف آئینے ہی آئینے لگے ہوئے تھے اور ان میں ان سب کے چہرے سینکڑوں کی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ عُلاقی نے لڑکی کے سراپا کو غور سے دیکھا۔ وہ مجسمۂ حسن و نور تھی۔ بیضوی چہرہ، سُرخی مائل سفید رنگ، بادام جیسی سُرمگیں بیمار آنکھیں، عمر سولہ سترہ کے لگ بھگ، کمر چیتے جیسی پتلی، کشادہ سینہ اور اس کی اُٹھان مائل بہ پرواز، جیسے دونوں شانوں کے درمیان گردن گویا صُراحی کے منہ پر حسین اور دلکش خدوخال کا چہرہ رکھ دیا گیا تھا۔ گھنے سیاہ بال حد سے زیادہ گھنے اور ریشم جیسے نرم و ملائم، چہرے میں کشش اور جاذبیت ایسی کہ سوگواریت نے اُسے اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ محلسرا کی عورتوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

امیر عُلاقی نے اس سسکتے ہوئے چہرے کو انگلیوں کی مدد سے اُوپر اُٹھانا چاہا تو لڑکی نے غصّے میں ٹھوڑی کو ایک طرف ہٹا کر ہاتھ جھٹک دیا۔ عُلاقی نے عورتوں کے سامنے اپنی سخت ہتک محسوس کی۔ نفرت سے بولا۔ "لڑکی! تو بہت بے وقوف معلوم ہوتی ہے۔ تجھے اس پر فخر کرنا چاہیے کہ تجھے امیر عُلاقی نے پسند کر لیا ہے!"

لڑکی نے شعلہ بار آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور سِسکیں بھرتی آواز میں جواب دیا۔ "تم ظالم ہو۔ تم مجھے میری مرضی کے خلاف زبردستی اُٹھوا لائے ہو۔ تم نے میرے باپ کو ہلاک کر دیا!"

عُلاقی نے اسے ڈانٹا۔ "زبان بند کر گستاخ لڑکی! ہم اس علاقے کے امیر ہیں اور تم سب ہماری رعایا ہو۔ ہم تمھاری جان اور مال کے مالک ہیں۔ کیا کوئی مالک اپنے مال اور مِلک کے تصرف پر اختیار نہیں رکھتا؟"

لڑکی اس کی منطقی باتوں کا مفہوم سمجھ نہ سکی۔ بلک بلک کر رونے لگی، بولی۔ "میں بودھ ہوں، میرا باپ گوتم کا پرستار تھا اور میں اپنے گوتم کی ادنیٰ داسی ہوں۔ تم پر یقیناً گوتم کا عذاب نازل ہو گا اور تم اپنے اگلے جنم میں بڑی مصیبتیں جھیلو گے!"

عُلاقی نے اُس کے رُخسار پر زوردار طمانچہ جڑ دیا اور عورتوں کو حکم دیا۔ "اسے دُلھن بنا دیا جائے!"

لڑکی مچلی، پھسلی لیکن کئی عورتوں نے اسے جکڑ لیا اور حمام میں لے چلیں۔



نہلا دُھلا کر دُلھن بنانے والیوں نے اسے سمجھایا کہ اس کشمکش اور غم و غصّے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ امیر عُلاقی اسے معاف ہرگز نہ کرے گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ حالات سے مفاہمت کر لی جائے۔

اسے بنا سنوار کر پھولوں والی مسہری پر دُلھن کی طرح بٹھا دیا گیا۔ تمام عورتیں چلی گئیں بس ایک عورت رہ گئی۔ یہ عورت بھی کچھ کم خوبصورت نہ تھی لیکن عمر زیادہ تھی۔ وہ بہت اُداس تھی۔ بار بار ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش ہوتی اور وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتی۔ لڑکی بھی تھک ہار کر چُپ ہو رہی تھی۔ اسے بہت جلد اس کا احساس ہو گیا تھا کہ یہاں خودکشی بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ اس نے خاتون کے ہونٹوں کی لرزش محسوس کر لی۔ بے جھجک پوچھ بیٹھی۔ "آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں لیکن نہیں!" وہ بوکھلا گئی تھی۔ "میں تم سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی!"

"پھر یہ آپ کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لرزش کیوں رہتی ہے؟"

خاتون نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی میں جلدی جلدی کہنے لگی۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "ناگلا!"

"ناگلا!" اس نے نام زیرِ لب دُہرایا۔ "تم بہت خوبصورت ہو۔ یہاں تم کئی سال لطف لے سکتی ہو۔ میں بھی تمھاری ہی عمر کی تھی جب یہاں لائی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح، جس طرح تم لائی گئی ہو!"

ناگلا ٹکٹکی باندھے خاتون کو دیکھتی رہی۔ خاتون کہنے لگی۔ "امیر عُلاقی کی آمد سے پہلے میں چند باتیں تجھے ضرور بتا دینا چاہتی ہوں۔ امیر بڑی متضاد طبیعت رکھتا ہے۔ حد درجہ نمازی اور حد درجہ ظالم اور خونخوار۔ کوئی نہیں جانتا کہ امیر عُلاقی کی شکل کب کسی کی موت اور ہلاکت کا سبب بن جائے۔ بخشنے پر آتا ہے تو خزانے خالی کر دیتا ہے اور جب بُخل پر آتا ہے تو تانبے کا ایک سکّہ

تک نہیں دیتا۔ تمھیں چاہیئے کہ امیر کا دل جیتنے کی کوشش کرو، وہ صلے میں تمھیں اتنا نواز دے گا کہ تم اس کا تصور تک نہیں کرسکتیں!"

ناگلا نے شدتِ کرب سے ہونٹ بھینچ لیے اور آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ہوئی بولی "مجھے دولت نہیں چاہیئے میں بودھ ہوں گوتم نے کہا تھا کہ خواہش نفسانی کی جڑ مایا ہے اور مایا دھوکا ہے!"

خاتون نے ناگواری سے کہا "لڑکی! میرے پاس تمھاری فضول اور خیالی باتوں کے لیے ذرا بھی وقت نہیں مجھے تو بس اتنی بات معلوم ہے کہ امیر تم سے جو کچھ لے گا اس کا معقول معاوضہ بھی ادا کردے گا وہ مذہب اور اس کی شرع کا بہت پابند ہے اور تم یہاں سے نکل نہیں سکتیں، حالات سے سمجھوتا کرکے ہنسی خوشی دن گزارنے کا فیصلہ کرلو۔"

اسی لمحے کچھ آہٹ ہوئی اور فضا خوشبو سے معطر ہوگئی۔

خاتون نے پلٹ کر دیکھا امیر عسلائی خیالوں میں غرق آہستہ آہستہ ناگلا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خاتون باہر چلی گئی اور امیر علائی دلھن کے قریب بیٹھ کر پیار و محبت کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں نہایت پُروقار اور متکبرانہ تھیں، حاکمانہ انداز میں نوازشوں کی بارش کا وعدہ کیا اور سرکشی اور بغاوت کی صورت میں بھیانک اور عبرتناک عذابوں کی دھمکی دی لیکن سخت دل اور ضدی ناگلا پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا، بے خوفی سے بولی "امیر! میں تمھارے اختیار میں ہوں، جو چاہو گے کروگے لیکن یہ بھی طے ہے کہ میں تمھارے ارادوں کے خلاف مزاحمت ضرور کروں گی!"

علائی نے طنز سے پوچھا "لیکن اس مزاحمت کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

"نتیجہ وہی نکلے گا جو تم چاہتے ہو!"

"پھر اس مزاحمت کا فائدہ؟" علائی اس کے قریب کھسکنے لگا۔

ناگلا سرک کر ذرا ہٹ گئی، بولی "گوتم نے خواہش نفسانی کو مارنے کا حکم دیا ہے اب تک میں اپنی خواہشِ نفسانی کو مارتی رہی ہوں اب حالتِ بےبسی میں تمھارے نفس کی سرکشی کے خلاف مزاحمت کرکے میں گوتم کو یہ باور کرادینا چاہتی ہوں کہ میری نیت اور ارادوں میں بدستور پاکی موجود ہے لیکن 'مارا' (ابلیس) نے مجھے ہر طرح بےبس کردیا ہے۔"

"میں مارا ہوں، ابلیس ہوں!" علائی زور سے چیخا۔

"ہاں تم مارا ہو!"

"تم بےوقوف ہو، تمھارا گوتم جنسی اہمیت سے ناواقف اور لاعلم تھا!"

پھر اس نے ناگلا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

علائی کو کچھ شبہ گزرا، پوچھا "لڑکی! ایک بات تو بتاؤ؟"

"وہ کیا؟ پوچھو!"

"تم کسی اور سے محبت تو نہیں کرتیں؟"

"نہیں" ناگلا کا چہرہ تمتما گیا "میں اس لغویت میں نہیں پڑسکتی!"

علائی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لطیف موقع کو خشک اور منفی بحث مباحثے میں نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ بولا "لڑکی! ہم تجھے اس وقت تک اپنے ساتھ رکھیں گے جب تک کہ تو بالکل رام نہیں ہوجاتی اور تیرے ساتھ وہی سب کچھ ہوگا جس کا ہم ارادہ کرچکے ہیں جو ہم چاہتے ہیں وہ معاملہ اگر ہنسی خوشی نپٹ جائے تو بہت اچھا ہے اور اسی میں مزہ بھی ہے لیکن اگر تو نے حماقت سے کام لیا تب بھی ہم اپنا مقصد حاصل کرکے رہیں گے!"

اس کے بعد دونوں میں کشمکش اور آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ رات کے پچھلے پہر کچھ زیادہ سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں سنائی دیں، ناگلا نے پوری مزاحمت کی اس نے علائی کو نوچا کھسوٹا اور جگہ جگہ اس کے جسم کو دانتوں سے کاٹ کر زخمی کردیا۔ امیر علائی ابتدا میں تو یہ مزاحمت برداشت کرتا رہا لیکن جب ناگلا کسی طور اس کے جذبات کے قالب میں نہیں ڈھل سکی، وہ جزبز ہوکر وہاں سے چلا آیا۔ لیکن ناگلا کی اس مزاحمت نے اس پر گہرا اثر مرتب کیا۔

امیر عسلائی کے حرم میں آنے والی لڑکیوں اور عورتوں میں ناگلا واحد وہ لڑکی تھی جس نے حالات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے، اس نے ہر بار مزاحمت کی اور ناکام رہی شاید اس کی اسی روش نے علائی کے دل میں ایک خاص مقام پیدا کردیا تھا ناگلا اس کے دل و دماغ پر سوار ہوگئی تھی جذبے کی وقتی شدت نے اس کے ظلم اور جبر کی جبلت کو دبا دیا تھا، وہ ناگلا کی محبت حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ محبت کو زبردستی ظلم اور جبر سے نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ اس میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے ناگلا سے مزاج پرسی اور شیریں کلامی کی حد تک تعلقات محدود کرلیے ناگلا پر اخلاقی اثر ڈالنے کے لیے اس نے اس کے گردوپیش کی ہر عورت سے خوش اخلاقی سے پیش آنا شروع کردیا۔

ناگلا کے بعد محلسرا کی سب سے زیادہ حسین چندا کو ہمراز بنالیا، چار سال پہلے چندا کو گجرات سے لاکر علائی کے حرم میں داخل کردیا گیا تھا۔ اس نے علائی کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی تھی بلکہ یہاں کی آسائشوں میں خوش و خرم زندگی گزارنے لگی تھی، لیکن جب اس چند روزہ خوش و خرم زندگی میں دوسری حسین لڑکیاں بھی داخل ہوگئیں اور امیر عسلائی کی رغبت اُدھر ہوگئی تو بڑے کرب اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ راتیں خالی گزرنے لگیں، ویران آغوش

کسی مرد کی خواہش کرتی، لیکن اس کا کہیں دُور دُور پتہ نہ ہوتا۔ نگران مسلح عورتیں سایے کی طرح لگی رہتیں، اس نے سُنا تھا کہ کبھی کبھی امیر اپنے مصاحبین سے خوش ہو کر محلسرا کی عورتوں کو ان میں تقسیم کر کے ان کی بھیڑ بھاڑ کم کر دیتا، چندا کئی سال سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا کرے امیر اسے بھی کسی مصاحب کے حوالے کر دے لیکن یہ آرزو سرے سے پوری ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی کہ وہ اب بھی اتنی حسین اور دلکش تھی کہ امیر علائی اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا ناگلا کی سرکشی نے امیر کو چندا کی طرف ملتفت کر دیا۔ اس نے چندا کو اعتماد میں لے کر کہا "چندا! تم اس لڑکی کو سمجھاؤ کہ اپنی سرکشی چھوڑ دے اور ہنسی خوشی رہنے لگے!"

چندا نے کہا "میں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گی، لیکن ناگلا بودھ ہے اس سلسلے میں اگر کسی بودھ کی خدمات حاصل کی جائیں تو بہتر ہے وہ بودھ ناگلا کو اپنے مذہب کے مسائل اور نکات کی رو سے یہ باور کرا دے کہ ناگلا کی یہ ضد ناجائز اور گناہ ہے!"

علائی اسی وقت باہر نکلا اور اپنے محافظین اور خدمت گاروں کے ساتھ بدھوں کی مشہور عبادت گاہ وٹوبا کی طرف روانہ ہو گیا۔ گنجان درختوں کے بیچ میں کھڑی یہ عبادت گاہ اپنے بنانے والوں کی عظمت و عقیدت اور ہنرمندی کا نوحہ کر رہی تھی اس ویران عبادت گاہ میں اب بھی نفس کشی کرنے والے بودھ دن رات پڑے رہتے، دن میں کسی وقت باہر نکلتے اور زندہ رہنے کے لیے کھانے کی چیزیں بھیک مانگ کر لے آتے اور پھر گوشہ نشین ہو کر مراقبے میں چلے جاتے۔ علائی کا رتھ وٹوبا کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا رتھ سے اُتر کر علائی وٹوبا کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا، وٹوبا کی پُرسکون فضا میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ بودھ بھکشو خوفزدہ اور سراسیمہ ہو کر علائی کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ امیر کے آس پاس کھڑے ہوئے نیزہ برداروں اور تلوار بازوں کی دہشت سے بعض بھکشو کانپ رہے تھے۔

علائی نے نہایت تمکنت اور شانِ خود آرائی سے سوال کیا "تم میں سب سے زیادہ بودھ مذہب کے مسائل اور فلسفے سے کون واقف ہے؟"

وہ سب کفنی میں لپٹے ہوئے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

اچانک ان بھکشوؤں کو چیرتا ہوا ایک نوجوان بھکشو امیر علائی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور امیر کو نہایت غور سے دیکھا، امیر علائی کو اس نوجوان کی جسارت پر غصہ آ گیا، پیچھے کھڑے ہوئے ایک نیزہ بردار سے نیزہ چھین کر اس کی نوک نوجوان کے سینے پر رکھ دی اور ہلکا سا زور دے کر پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "گستاخ نوجوان! ذرا پیچھے ہٹ اور ادب سے کھڑا ہو!"

نوجوان ذرا بھی مرعوب نہ ہوا، نیزے کی انی کی چبھن سے بچنے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور کسی قدر نفرت اور حقارت سے پوچھا "کیا تم وہی شخص ہو جس نے ناگلا کو زبردستی اُٹھوا کر اپنے حرم میں ڈال لیا ہے؟ اور اس کے بوڑھے باپ کو احتجاج کرنے پر رتھ کے گھوڑوں سے کچلوا کر ہلاک کر دیا تھا۔"

امیر علائی نے بے نیازی سے جواب دیا "ہم عامیوں کی پرسش اور سوالات کے جواب دینے کے پابند نہیں، بے وقوف نوجوان تمھیں ہم سے ادب سے گفتگو کرنی چاہیئے!"

نوجوان نے امیر کی رعونت کا کوئی اثر نہ لیا، پوچھا "اب تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

امیر نے جواب دیا "ہم یہاں اس شخص سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں جو بودھ مذہب کا عالم ہو!"

نوجوان نے خود اعتمادی سے کہا "میں بودھ مذہب کا عالم ہوں، پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

امیر کو اس اندازِ تخاطب سے تکلیف پہنچ رہی تھی، بولا "ہم یہاں کے حکمران ہیں تمھیں ادب سے گفتگو کرنا چاہیئے!"

نوجوان بھکشو نے لاپروائی سے جواب دیا "امیر! ہم بھکشو لوگ نفس اور دُنیا کو تیاگ چکے ہیں، حکمرانی، ادب اور احترام ہمارے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتے!"

امیر علائی نے تمام بھکشوؤں کی عمروں کا سرسری نظر سے جائزہ لیا تقریباً سبھی کی عمریں چالیس پچاس کے اُوپر تھیں، بس یہ نوجوان ہی سب سے کم عمر تھا۔ امیر نے سوچا کہ ان ڈھلی ہوئی عمروں کے لوگوں کو پرچانا یا پھسلانا دشوار ہے کیونکہ زیادتی عمر اور نفس کشی کے ریاض نے انھیں بے جان کر دیا ہو گا ان پر ترغیب یا تحریص کا اثر نہیں ہو سکتا، ہاں یہ نوجوان البتہ اس کے دام میں نہایت آسانی سے آ سکتا ہے اس کے ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ تیار کر لیا، اس نے اشارے سے نوجوان کو قریب آنے کا اشارہ کیا، نوجوان نے بے رُخی سے کہا "تم نے مجھے نیزے کی نوک سے پیچھے دھکیلا تھا اب میں دُور ہی سے باتیں کروں گا!"

امیر نے سوال کیا "تمھارے مذہب میں سب سے بڑا پاپ کیا ہو سکتا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "کسی کا دل دُکھانا!"

امیر کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی، نوجوان اس کے جال میں پھنس چکا تھا، بولا "لیکن تم تو برابر ہمارا دل دُکھائے جا رہے ہو، ہم نے تمھیں اپنے قریب بلایا اور تم نے انکار کر کے ہمارے دل کو اذیت پہنچائی!"

نوجوان کے چہرے پر نرمی آ گئی ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا "خود ہمارے دل بھی بہت دُکھ رہے ہیں امیر! تم نے ناگلا کو زبردستی حرم میں ڈال لیا اور اس کے باپ کو ہلاک کر دیا، یہ کوئی معمولی ظلم نہیں ہے!"

علائی نے جواب دیا "اب جو ہو چکا اس کا ذکر فضول ہے ہم اس بڑھے کو دوبارہ نہیں چلا سکتے!"

نوجوان نے فوراً کہا "لیکن ناگلا کو تو حرم سرا سے نکال کر ہمارے حوالے کر سکتے ہو!"

علائی چند قدم آگے بڑھا اور نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ کا نیزہ، نیزہ بردار کے حوالے کر دیا۔ نوجوان کو ایک طرف لے جاتا ہوا بولا۔

"ہم اسی ناگلا کی بابت تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں!"

نوجوان بے چون و چرا امیر کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔ دوسرے بھکشو اس کھیل کو خوف اور استعجاب سے دیکھ رہے تھے۔

امیر نے اسے سب کچھ بتا کر کہا "نوجوان! تم یقین کرو ہم ناگلا کو رانی بنا کر اپنے قصر میں رکھنا چاہتے ہیں، تم اپنے مذہب کے عالم ہو، میرے ساتھ قصر تک چلو اور ناگلا کو مذہبی قانون اور نکات کی روشنی میں سمجھاؤ کہ دل آزاری بودھ مذہب کا بدترین گناہ ہے، وہ ہمارا دل نہ توڑے، ہم اس کی محبت کے بھوکے ہیں، اگر وہ ہم پر بخوشی مائل ہو جائے تو ہم اپنے قصر میں اسے وہ مرتبہ مرحمت فرمائیں گے جو آج تک کسی اور عورت کو نہیں نصیب ہوا!"

نوجوان کسی سوچ میں پڑ گیا۔

امیر نے اپنی طبیعت اور طریقۂ کار کا دوسرا رخ بھی سامنے کر دیا۔ کہنے لگا "اور اگر وہ بخوشی ہم پر مائل نہ ہو سکی تو اسے اپنے دل سے یہ بات بھی نکال دینا چاہیے کہ وہ اپنی کوششوں اور مزاحمت میں کامیاب ہو کر ہمارے ارادوں اور خواہشوں کو شکست دے سکے گی۔" پھر کچھ سوچ کر سوال کیا "نوجوان تمھارا نام کیا ہے؟"

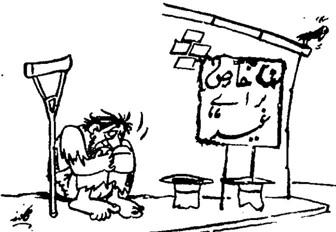
نوجوان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "کمپا!"

امیر اپنا مدعا بیان کرتا رہا "کمپا! تمھیں ہمارے ساتھ قصر تک چلنا پڑے گا۔ اگر تم نے ہمارا یہ کام کر دیا تو اس کے صلے میں تم ہم سے جو کچھ بھی مانگو گے ہم مرحمت کریں گے!"

نوجوان کمپا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔ بولا "ہمیں کیا صلہ دے سکتے ہو، ہم خواہشات نفسانی کو غلام بنا لینے والے لوگ تم سے کیا صلہ لے سکتے ہیں؟"

امیر مایوس ہونے لگا۔ "ہم تم گوشہ نشین لوگوں کو بھیک کی مشقت سے بچا کر وٹوبا کے اندر ہی کھانے پینے کا سامان بھجوا دیا کریں گے تاکہ تم لوگ یکسوئی سے نروان کے لیے مراقبہ کر سکو!"

"بہر حال میں تمھارے ساتھ چلوں گا اور کوشش کروں گا کہ ناگلا کو تم پر مائل کرا دوں!"



امیر کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ نوجوان کمپا فوراً واپس آنے کا وعدہ کر کے وٹوبا کے اس حصے میں چلا گیا جہاں گوتم بدھ آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے برگد کے سائے میں بیٹھا تھا۔ کمپا اس کے قدموں میں جھک گیا اور رو رو کر کہنے لگا "دیوتا شاکیامنی (گوتم بدھ) مجھے حوصلہ دو کہ میں اپنا عظیم کام انجام دے سکوں، میں نوجوان ہوں اور میرے اندر نفس کا طاقتور مارا (شیطان) اس تاک میں ہے کہ کب مجھے کمزور پا کر ہلاک کر دے۔ شاکیامنی! تم مجھے اس کے شر اور مکر سے محفوظ رکھنا!"

اظہار عاجزی کے بعد کمپا نے اپنا سر گوتم کے قدموں میں رکھ دیا اور آنسو بہاتا رہا۔

جب وہ واپس ہوا تو ایک بھکشو نے اس کا راستہ روک لیا، پوچھا "کمپا تم کہاں جا رہے ہو؟"

کمپا نے جواب دیا "امیر علائی کے ساتھ اس کے قصر میں"۔

بھکشو نے سوال کیا "کیوں؟ کیا تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو گے؟"

"نہیں، میں جلدی ہی واپس آ جاؤں گا، میں پاپ کے خلاف جنگ کرنا چاہتا ہوں، دل آزاری جو بہت بڑا پاپ ہے، میں اس پاپ کا علاج کروں گا!"

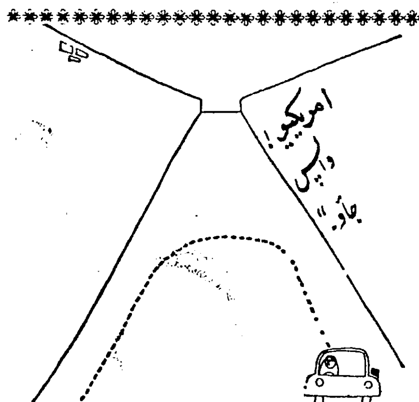
یہ کہہ کر کمپا آگے بڑھ گیا۔ ایک بوڑھا بھکشو راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "لیکن تم نے اپنے ..."

کمپا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جلدی جلدی کہنے لگا "تم خاموش رہو، اپنے معاملات کا فیصلہ میں خود کروں گا"۔

امیر علائی نے کمپا کو رتھ میں اپنے برابر بٹھایا۔ جب رتھ حرکت میں آیا تو تمام بھکشو کمپا کو الوداع کہنے کے لیے وٹوبا کی سیڑھیوں پر کھڑے حسرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے سر گھٹے ہوئے تھے اور کفن جیسی چادریں جسم پر لپٹے ہوئے تھے۔ کمپا نے ذرا اٹھ کر نیچے دبی ہوئی چادر کو کھینچ کر باہر کیا اور بیٹھ کر مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہی۔

***

قصر کی سپاہ، خدمت گار اور مصاحبین حیران تھے کہ یہ نوجوان بھکشو قصر




میں کیوں لایا گیا ہے" عَلائی نے اسے مخلسرا کے قریب مسجد سے متصل ایک حجرہ قیام کے لیے دے دیا۔ عَلائی کو اس مذہبی مجنون کی طرف سے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ عورتوں کی طرف نہیں راغب ہوگا اور اگر راغب ہوا بھی تو اس عورت کو اس کے حوالے کرکے اُسے ہمیشہ کے لیے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنایا جا سکے گا۔

عَلائی نے ناگلا کا دل موہنے کے لیے اسے یہ خوش خبری سنائی "کہ ناگلا تم بودھ ہو ہم نے تمھاری مذہبی تعلیمات اور تسکین کے لیے ایک بودھ عالم کا انتظام کر دیا ہے وہ صبح شام تمھارے پاس آئے گا اور تمھارے مذہب کی تمھیں تعلیم دے گا!"

ناگلا نے شک و شبہے کی نظروں سے امیر کو دیکھا لیکن زبان بند رکھی۔

اس کے بعد امیر چندا کے پاس پہنچا اور اسے ساری تفصیلات بتا کر کہنے لگا "چندا! ہم نے تمھارے مشورے پر عمل کیا ہے یہ بودھ بھکشو کوشش کرے گا کہ ناگلا ہم پر ملتفت ہو جائے اب یہ کام تمھارا ہے کہ تم ان دونوں کی نگرانی کرو اور انھیں آپس میں بہکنے نہ دو۔ جب تک بودھ بھکشو ناگلا کے پاس رہے اس کے آس پاس تم موجود رہو گی اور یہ جاننے کی کوشش کرو گی کہ یہ بھکشو اسے کس قسم کی تعلیم دے رہا ہے!"

چندا کے مجروح دل میں کچھ تمنائیں پیدا ہو گئیں، اس جنم میں کسی مرد کا آجانا اتنی بڑی خوشخبری تھی کہ مخلسرا کی کوئی بھی عورت اس کی امید تک نہ کر سکتی تھی۔

جب پہلے دن کپیا کو ناگلا کے پاس پہنچایا گیا تو ناگلا کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "کپیا یہ تم!!"

کپیا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ناگلا کو سرزنش کی کہ خاموش رہو اور اجنبی بنی رہو!

چندا کا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں یہ دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں وہ ناگلا کے قریب کھڑی ہو گئی اور پوچھا "ناگلا! کیا تم اِس نوجوان کو پہلے سے جانتی ہو؟"

لیکن ناگلا سے پہلے بودھ بھکشو بول اُٹھا کہنے لگا "رانی! ہم شاکیامنی کے پرستار یہاں ہیں ہی کتنے۔ انگلیوں پر تو گنے جا سکتے ہیں اسی لیے ہم سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں!"

چندا کی اس جواب سے تسلی نہ ہوئی چُپ ہو رہی لیکن ان کی ذرا ذرا سی حرکت سے دونوں کی باہمی چاہت کا اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کرتی رہی۔

پہلے دن نوجوان بھکشو دیر تک دل آزاری کے خلاف تقریر کرتا رہا۔ اس نے کہا "ناگلا! کسی کا دِل دُکھانا دُنیا کا سب سے بڑا پاپ ہے اور بُدھ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہمیں اپنا نفس مارنے کے لیے ہر وہ کام کرنا چاہیئے جو نفس اور خواہش کے خلاف ہو اگر نفس یا خواہش محبت کے خلاف نفرت پر مائل ہو تو ہمیں اپنی خواہش کو مارنے کے لیے اس سے محبت کرنی چاہیئے اور اگر نفس کسی سے محبت کرتا ہو تو اُسے ہرانے کے لیے ہمیں اس سے نفرت کرنی پڑے گی یہی نفس کشی کی سیدھی سادی اور بنیادی تعلیم ہے اور یہی ہمارے مذہب کی روح!"

ناگلا نے حیرت سے پوچھا "کپیا! یہ تم کہہ رہے ہو!!"

بھکشو نے سادگی سے جواب دیا "یہ میں نہیں شاکیامنی نے کہا ہے ہمارا نفس اور ضمیر جو ہمیشہ برائی سے سر اُٹھانے کو تیار رہتا ہے، شاکیامنی نے اسے مارنے کے لیے ہمیں بھیک کی تعلیم دی ہے!"

ناگلا نے آہستہ سے کہا "لیکن میں اس نفرت کو دل سے کس طرح نکال دوں جو اس امیر کے خلاف میرے دل میں شدت سے سرایت کر چکی ہے!"

"اہنسا پرمو دھرما ناگلا اہنسا پرمو دھرما کسی پر جبر نہ کرو کسی پر ظلم نہ کرو یہی شاکیامنی کی تعلیم ہے!"

ناگلا نے خفگی سے کہا "لیکن ظلم تو ہم پر ہوا ہے جبر تو ہم پر کیا گیا ہے!"

"یہ تو ٹھیک ہے!" کپیا نے کہا "وہ جذبۂ انتقام جو ظلم اور جبر کے خلاف امیر کے لیے ہمارے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے اس پر قابو پا کر اور اسے دلوں سے نکال پھینکنے ہی سے ہم شاکیامنی کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکیں گے۔"

ناگلا نے جواب دیا "لیکن میں ابھی تک نفس کی اس سرکشی پر قابو پانے سے معذور ہوں!"

کپیا نے کنکھیوں سے سر پر موجود چندا کو دیکھا اور ناگلا کو سمجھانے لگا "صبر کرو دیوی صبر سے کام لو گوتم سے لو لگاؤ دل کی تاریکیاں دور ہو جائیں گی دشمنوں

سے محبت اور دوستوں سے لاتعلقی یہی ہمارا دھرم ہے؟"

چندا کو اس نوجوان بھکشو کی باتیں بہت اچھی لگیں اور ناگلا کسی سوچ میں پڑ گئی۔

رات کو بھکشو نے امیر علائی کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ "امیر! دھیرج سے کام لو جلدی میں کام بگڑ جائے گا مہینہ بیس دن میں ناگلا تمہارا دم بھرنے لگے گی۔"

اور جب چندا نے بھی وہ ساری گفتگو علائی کے سامنے دُہرا دی جو اس نے اپنے کانوں سے سُنی تھیں تو امیر کو بڑا اطمینان ہو گیا۔ چندا نے اپنے اس تاثر کا بھی اظہار کیا کہ نوجوان بھکشو حد درجے پارسا اور نیک ہے۔

سبزہ شبنمی موتیوں سے اٹا پڑا تھا۔ نوجوان بھکشو، ناگلا اور چندا سبزے پر ٹہلتے ہوئے مصروفِ گفتگو تھے۔ مشرقی اُفق پر شفق نے رنگ بکھیر رکھے تھے۔ سامنے مسجد سے علائی نمودار ہوا اور سیدھا ان تینوں کے پاس پہنچ گیا۔ ناگلا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ چندا دونوں سے دو قدم پیچھے ہو گئی۔

کمپا نے درس دینا شروع کر دیا۔ "ناگلا! تمہیں ہماری خاطر امیر علائی کی دل جوئی کرنا ہو گی، دنیا میں جو کچھ ہے فریب ہے، دھوکا ہے امیر علائی بھی ایک دھوکا ہے اس دھوکے کو تمہیں گوارا کرنا ہی پڑے گا!"

ناگلا کی آواز تھرتھرائی "لیکن کمپا اس نے نہایت ظلم اور بربریت سے میرے باپ کو جو ہلاک کیا ہے!"

کمپا نے جواب دیا۔ "اسے بھی ایک افسوسناک اور تکلیف دہ دھوکا سمجھ کر بھلا دو!"

امیر علائی اُن کے قریب پہنچا تو چندا نے ادب سے اس کی پیشوائی کی اور نوجوان بھکشو بھی خوش دلی سے مسکرا دیا، ناگلا منہ پھیرے رہی۔ امیر علائی کی رگِ امارت بھڑک اُٹھی، غصے میں بولا۔ "ہم جبر اور تلوار سے فیصلے کرنے والے لوگ باتوں میں وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہیں کرتے، ہم نے اپنی طبیعت اور مزاج کے خلاف بہت زیادہ صبر کیا ہے اب مزید صبر کا یارا نہیں رہا!"

ناگلا نے تلخی سے جواب دیا۔ "اگر صبر کا یارا نہیں رہا تو جو جی میں آئے کر گزرو، میں گناہ کی مرتکب نہیں ہو سکتی!"

کمپا نے ترشی سے کہا۔ "گناہ کہاں نہیں ہے، ہر مخلوق میں گناہ پایا جاتا ہے اس سے کون بچا ہے اور کون بچے گا۔" پھر امیر علائی سے مخاطب ہوا۔ "امیر! جب ایک کام تم نے میرے سپرد کر دیا ہے تو اب اس کے نتیجے کا انتظار کرو، امیر! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ جس کسی نے خود کو ہوا و ہوس سے پاک کیا ہے وہ یہ بات خوب جانتا ہے کہ انسان کی شہوات نفسانی کی



مثال اس تیز تلوار اور نیزے یا اُسترے جیسی ہے جس کی نوک یا دھار پر شہد لگا ہوا ہے!"

علائی ناراض ہو کر چلا گیا۔ چندا نے جو اب کسی حد تک دونوں کی بات چیت میں دخل دینے لگی تھی، ہنستے ہوئے نوجوان بھکشو سے پوچھا۔ "اگر تیز نیزے، تلوار یا اُسترے کی نوک اور دھار پر شہد لگا ہے تو ایک عقل مند آدمی کا یہ فرض ہے کہ اس میٹھاس کا مزہ چکھے اور ہتھیاروں کی نوک اور دھار سے خود کو محفوظ رکھے!"

"رانی بات یہ ہے کہ" بھکشو کہتا رہا۔ "آدمی جوش اور سرمستی میں شہد کی میٹھاس سے لطف اندوز ہوتے ہوتے خود کو زخمی ضرور کر لیتا ہے اس سے کون بچ سکتا ہے بھلا؟"

نوجوان بھکشو کی باتیں چندا کا دل لوٹے دے رہی تھیں، ناگلا نے کمپا کو شرمائی شرمائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تک تم یہاں موجود ہو مجھے تو امیر سے بات کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے!"

بھکشو نے چندا کو غور سے دیکھا اور اس بات کا دل میں اعتراف کر لیا کہ چندا کے حسن کا بھی جواب نہیں ہے، ایسا حسن جو زہد اور تقوے کو چشم زدن میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ اس نے چندا سے ایک درخواست کی۔ "رانی! ایک لاچار بھکشو تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہے!"

چندا نے کچھ سوچتے ہوئے بھکشو کو دیکھا اور سوال کیا۔ "وہ کیا؟"

بھکشو نے جواب دیا۔ "تم امیر کو سرمست ناگلا سے دور رکھو اس سے کہہ دو کہ ناگلا اس کی امانت ہے لیکن ابھی ذرا صبر کی ضرورت ہے!"

چندا کا دوپٹا سینے سے پھسل گیا اس کا خیال کیے بغیر بولی۔ "میں یہ بات اُس سے کیوں کہوں جو چیز میرے اپنے اختیار کی نہیں اس کی کسی دوسرے کو کیا تلقین کر سکتی ہوں!"

نوجوان بھکشو نے چونک کر چندا کو دیکھا اور کانپ گیا۔ جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ "کون سی چیز تمہارے اختیار کی نہیں ہے رانی!"

چندا نے نظریں جھکا لیں، بولی۔ "صبر!" اس کی آواز کچھ تھرتھرا گئی "امیر علائی تلوّن مزاج واقع ہوا ہے وہ دیرپا محبت کسی سے بھی نہیں کر سکتا

کبھی اس نے مجھے بھی چاہا تھا لیکن اب وہ چاہت کبھی کبھی کی رہ گئی ہے"
اب حرم سرا میرے لیے جہنم سے کم نہیں ہے کبھی کبھی امیر مہینوں ہماری خبر نہیں لیتا اور ان سنگی دیواروں میں کوئی اور مرد بھی نظر نہیں آتا۔"

کمپا کا خوف دم بدم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے ناگلا کو دیکھا۔ ناگلا کہنے لگی "حرم سرا کی ہر عورت دکھی ہے۔"

کمپا نے چندا کی ڈھارس بندھائی بولا" رانی! اگر میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو ہر وقت حاضر ہوں مجھے اپنا کام بتاؤ میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

ایسا کہتے ہوئے نوجوان بھکشو غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ چندا کسی سے محبت کرتی ہے لیکن قصر کی پتھریلی دیواریں بیچ میں حائل ہو گئی ہیں اور وہ کسی طرح بھی اپنے محبوب سے نہیں مل سکتی یہ ساری گھٹن اور یہ سارا کرب اسی بات کا ہے۔

چندا کچھ بھی نہ کہہ سکی بس سسک کر رہ گئی وہ اس سے زیادہ کھل کر کیا کہہ سکتی تھی اسے اس سادہ لوح خشک تعلیمات کے دلدادہ معلم پر غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا۔ ناگلا نے زخم پر نمک چھڑک دیا بولی "کمپا! اس محل میں گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں جنھیں اختیار ہے جب چاہتے ہیں پاپ کرتے ہیں جو بے اختیار اور مجبور ہیں پاپ کی تمنا میں سلگتے رہتے ہیں!"

چندا جل بھن کر رہ گئی جی میں آیا کہہ دے بھوکا کھانے کی خواہش کرے یا کھانا مانگے تو اسے گناہ کیوں کہا جائے گا لیکن وہ خوب سمجھ چکی تھی کہ یہ دونوں جس مذہب اور اس کے معتقدات سے تعلق رکھتے ہیں وہاں گناہ اور ثواب کا تصور ہی نرالا ہے دوسرے شاید یہ دونوں خود بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود چندا ہار ماننے کو تیار نہ تھی نوجوان بھکشو اس کے لیے کائنات کی سب سے قیمتی شے تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی خواہ وہ کچھ دنوں کے لیے مستعار ہی کیوں نہ مل جائے۔

ناگلا غسل کرنے گئی ہوئی تھی نوجوان بھکشو نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گیا اور دل ہی دل میں شاکیا منی کو یاد کر کے چندا کے حسن کی سحر کاریوں سے پناہ مانگنے لگا۔ چندا نے اسے ٹٹولا "کمپا! ایک بات تو بتاؤ!"

کمپا نے سراپا سوال بن کر پوچھا "کیا؟"

چندا نے پوچھا "کیا تم ناگلا سے محبت کرتے ہو؟"

"نہیں تو! یہ کس نے بتایا تمھیں؟"

"کسی نے بھی نہیں بس کچھ اندازے ہیں جن سے مجھے یہ بات محسوس ہوئی!"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں!" کمپا نے کہا "دراصل ہم دونوں بچپن میں ساتھ کھیلے تھے وہی بے تکلفی اور یگانگت دونوں میں چلی آ رہی ہے!"

چندا چپ ہو گئی جب ناگلا آگئی تو دونوں دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے چندا اندر ہی اندر کھولتی رہی اس زہد و تقویٰ پر ناگلا سے یوں بے تکلف ہو کر باتیں کرنا کیا گناہ میں داخل نہیں ہے!!

دوسری طرف نوجوان بھکشو کا یہ حال تھا کہ وہ باتیں تو ناگلا سے کرتا تھا لیکن دھیان چندا ہی کی طرف رہتا تھا۔ اس کا پُرکشش سراپا اندر آگ لگا چکا تھا یہ ایک ایسی شرمناک اور افسوسناک بات تھی جس کا وہ کسی پر اظہار تو اظہار اپنے دل میں اعتراف تک کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

نوجوان بھکشو کو ناگلا کے پاس پہنچے ہوئے دیر ہو چکی تھی چندا ہانپتی کانپتی جب وہاں پہنچی تو مشتبہ حالات اور ماحول نے اس کے دل پر ایک گھونسا سا رسید کر دیا۔ ناگلا کا ہاتھ بھکشو کے ہاتھ میں تھا اور دونوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں نوجوان بھکشو معلوم نہیں کیا کچھ کہہ چکا تھا لیکن جب وہ اندر داخل ہوئی تو صرف اتنا ہی سن سکی "ناگلا! اب تو صبر ہی سے کام لینا پڑے گا سر دست ہم دونوں بے بس اور مجبور ہیں!"

چندا نے گرم ہو کر کہا "تم دونوں کس بات میں مجبور ہو آزادی سے صبح شام ملتے رہتے ہو خوب جی بھر کے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہو باتیں کر لیتے ہو اور شاید اظہارِ عشق بھی تمھیں کون مجبور کرے گا!"

بھکشو نے ناگلا کا ہاتھ فوراً ہی چھوڑ دیا اور دونوں نے آنکھیں خشک کر لیں

یہ خبر امیر علائی کو بھی پہنچ گئی وہ غضبناک ہو کر کمپا سے ملا اور اسے لیے ہوئے محل سرا کے نیچے پُراسرار اور زیر زمین تہہ خانے میں اتر گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ امیر نے ایک بڑی سی موم بتی روشن کی اور اس کی روشنی میں تہہ خانے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ادھر دیکھو وہ ادھر یہ ڈھانچے جن پر گوشت کا نام و نشان تک نہیں کبھی یہ بھی ہماری تمھاری طرح چلتے پھرتے تھے لیکن آج ان کے ڈھانچے کھڑکھڑانے کے لیے یہاں پڑے ہوئے ہیں ہم جس پر اعتماد کرتے ہیں اعتماد کی شکست کے بعد اس کا یہ حال بھی کر دیتے ہیں!"

نوجوان بھکشو نے حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلتے لگا بولا "تمھیں جو کچھ معلوم ہوا وہ غلط ہے ایسی بات نہیں ذرا سے مزے کے لیے میں اپنی ریاضت کو خاک میں نہیں ملا سکتا!"

علائی نے غصے میں پوچھا "آخر یہ ناگلا کب تک راہ راست پر آجائے گی؟"

کمپا نے جواب دیا "بہت جلد اب زیادہ دن نہیں لگیں گے!"

"بھکشو!" اس کی آواز گونجی "تم یہ یاد رکھو اگر تم نے پردے ہی پردے میں کوئی اور کھیل کھیلا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ اور اس کی ہم ایسی عبرتناک سزا دیں گے کہ کسی نے کم ہی ویسی سزا دی ہوگی!"

کمپا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ تہہ خانے میں مردنی کی بو پھیلی ہوئی تھی

تھی اور ناک بھیٹی جارہی تھی۔

اس کے بعد وہ بہت محتاط ہوگیا۔ چندا نے شکایت کی۔ اسے دیکھتے ہوئے بولا "رانی! تم نے امیر سے میری شکایت کر دی، بُرا کیا! آخر تم نے ایسا کیا کیوں؟"

چندا نے جھکتے جھجکتے انگڑائی لی اور کہنے لگی "تم ناگلا سے محبت نہیں کر سکتے اگر کرو گے تو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا" اس کے بعد اپنا مغموم چہرہ کمپا کی طرف بڑھا دیا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے کہنے لگی "اگر یہ ویران ہیں تو یہاں کی ساری آنکھیں ویران رہیں گی"

"دیوی! مجھے آزمائش میں نہ ڈالو" کمپا نے آزردگی سے کہا "تم حسین ہو، بہت زیادہ حسین، لیکن تمہارا یہ حسن میرے کام کا نہیں ہے تم امیر علائی کی امانت ہو اور میں بودھ بھکشو ہوں، پھر دونوں کا میل کیونکر ہو سکتا ہے!"

لیکن چندا کو ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی اسے یہ یقین تھا اگر یہ بودھ بھکشو اسی طرح اس سے ملتا جلتا رہا اور یوں ہی باتیں کرتا رہا تو ایک نہ ایک دن وہ اسے شیشے میں ضرور اتار لے گی!

ناگلا کچھ کچھ امیر پر ملتفت ہونے لگی، اس نے امیر کے سامنے ایک شرط رکھ دی، کہنے لگی "امیر! میں تم سے محبت کر سکتی ہوں لیکن تمہیں میری دو شرطیں ماننا پڑیں گی!"

علائی کے ہاتھ میں ایک خط تھا اسے تہہ کر کے جیب میں رکھتا ہوا بولا "شرطیں بتاؤ شاید ہم مان لیں"۔

ناگلا نے کہا "جب میں اپنے آس پاس عورتوں کی ایک فوج دیکھتی ہوں تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے یہاں میں تنہا تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں!"

امیر نے رکھائی سے جواب دیا "ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں اپنے حرم کی تمام عورتوں کو رخصت کر دوں؟"

ناگلا نے بدمزاجی سے کہا "پھر میں یہ کیوں گوارا کر لوں کہ عورتوں کے اس جنگل میں اپنی انفرادیت کھو دوں!"

امیر نے کہا "اس ہجوم میں تم منفرد ہی رہو گی، اس کی ہم ضمانت لیتے ہیں"

"وہ کس طرح؟"

"یہ اس طرح کہ ہمارے رویّے، سلوک اور والہانہ محبت کے انداز سے یہاں کی تمام عورتیں خوب اچھی طرح یہ جان لیں گی کہ تمہیں ان میں ہماری سب سے زیادہ محبت حاصل ہے اور تم حرم سرا کی جان ہو؟"

ناگلا نے معصومیت سے سوال کیا "کیا تم میری موجودگی میں دوسری عورتوں کو بالکل نظر انداز کر دو گے؟"

"نہیں" امیر نے کہا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے جب تک یہ حرم میں ہیں ان کی خواہشات کی تکمیل ہمارے ذمے ہے ہمیں اپنی یہ ذمے داری تو پوری کرنی ہی پڑے گی!"

ناگلا نے مایوسی سے کہا "تم عجیب آدمی ہو کہ ایک ہی وقت میں کئی کشتیوں میں سوار ہونا چاہتے ہو!"

امیر نے اس کا طنز نظر انداز کر دیا۔ پوچھا "تمہاری دوسری شرط؟"

ناگلا نے سادگی سے جواب دیا "میں بودھ ہوں اور بودھ ہی رہنا چاہتی ہوں!"

امیر نے فوراً ہامی بھر لی کہا "ہمیں تمہاری یہ دوسری شرط منظور ہے!"

ناگلا پھر پہلی شرط پر لوٹ آئی۔ بولی "تمہیں میری پہلی شرط بھی ماننا پڑے گی!" پھر ایک امید افزا بات کہہ دی کنکھیوں سے مسکرا کر امیر کو دیکھا اور کہنے لگی "امیر! میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن حرم کی بے شمار تتلیوں کی موجودگی میں رقابت بھی محسوس کرتی ہوں کم از کم میں خود کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ تمہارے التفاتِ عام کو جانوروں کی طرح برداشت کر لوں"۔

امیر نے ایک نئی تجویز پیش کی کہا "تم اپنی شرط میں ذرا سی تبدیلی کر لو، اسے بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے!"

"وہ کیا؟" ناگلا نے جستجو بھری نظروں سے امیر کو دیکھا۔

امیر نے کہا "ہم تمہارے لیے الگ محل کا انتظام کیے دیتے ہیں جہاں تم ہو گی اور تمہاری کنیزیں ہوں گی، وہاں تو تم اپنی انفرادیت قائم رکھ سکو گی"۔

ناگلا نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "سوچوں گی!"

امیر نے اپنی جیب سے خط نکال لیا اور کہنے لگا "تمہیں سوچنے کے لیے ہم کافی وقت دے رہے ہیں، کل ہم اپنی سپاہ کے ساتھ محمد تغلق کے مقابلے پر جا رہے ہیں، امیرانِ صدہ نے محمد تغلق کے خلاف بغاوت کر دی ہے ہماری ہی طرح کے ایک دوسرے امیر علاء الدین حسن نے امیرانِ صدہ کا متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے ہم اس کی مدد کو جا رہے ہیں اور جلد ہی واپس آنے کی کوشش کریں گے ہمیں امید ہے کہ اس وقت تک تم ضرور اپنی شرط میں تبدیلی پر آمادہ ہو چکی ہو گی!"

ناگلا نے بدحواس ہو کر پوچھا "تمہارے چلے جانے کے بعد کمپا کہاں رہے گا؟"

امیر کے دل میں شبہ پیدا ہو گیا، دل کو ٹٹولنے کے لیے بولا "وہ لوٹ کر واپس چلا جائے گا!"

ناگلا مچل سی گئی بولی "نہیں، ایسا نہ کرو، اسے یہیں رہنے دو!"

امیر نے طنز سے پوچھا "اس بدوضع بھکشو میں کیا بات ہے جو اسے اپنے قریب رکھنے پر مصر ہو؟"

ناگلا نے محسوس کیا کہ امیر کی نظروں میں کینہ پایا جاتا ہے۔ بولی۔ "اسے تھی تو بُلا کر لائے ہو، میں نے تو نہیں بُلایا تھا!"

امیر نے حسد سے کہا۔ "ہاں لیکن اُس وقت ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ تم دونوں میں کوئی خفیہ معاملہ چلا آ رہا ہے!"

ناگلا نے تلملا کر نفرت سے امیر کو دیکھا اور تکلیف آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "تم پاپی لوگ سب کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہو، تمھاری اپنی زندگی میں پاپ اور پُن میں کوئی فرق نہیں!"

امیر نے درشت لہجے میں کہا۔ "زیادہ باتیں مت بنا لڑکی، زبان بند رکھ، ہم خوب سمجھتے ہیں تیری منشا!"

ناگلا نے افسوس سے کہا۔ "تم بالکل نہیں سمجھتے ہماری باتیں، اگر تمھیں یہ گمان ہے کہ تم ہم پر قدرت اور اختیار رکھتے ہو تو یہ بالکل خیالِ خام ہے تمھارا، میں جب چاہوں گی خودکشی کر کے تم سے نجات حاصل کر لوں گی۔"

امیر نے نرمی اختیار کی، کہنے لگا۔ "ہماری واپسی تک تم کو زندہ رہنا ہے ہم نہیں چاہتے کہ تم حرام موت مرو کمپا اسی طرح تمھارے قریب رہے گا لیکن ایک بات ہماری بھی یاد رکھنا، ہم نے کمپا کو تہہ خانے کی وہ جگہ دکھا دی ہے جہاں اُن گستاخ اور خطاکار انسانوں کے پنجر پڑے ہیں، جو ہماری نظروں میں گناہگار اور خطاکار تھے، ہم معاف نہیں کرتے۔"

یہاں سے نکل کر امیر علائی کمپا سے ملا اور اسے سب کچھ بتا کر حکم دیا "تم ہماری واپسی تک یہیں رہنا۔ اگر ہمیں شکست ہو جائے تو تمھیں اس بات کا اختیار ہو گا کہ ناگلا کو لے کر کسی محفوظ جگہ چلے جاؤ۔"

نوجوان بھکشو نے جواب دیا۔ "امیر! ایک بات میری بھی یاد رکھنا، میں بودھ ہوں اس لیے اسے ضروری سمجھتا ہوں کہ جانے سے پہلے کچھ نصیحتیں کروں۔" اس کے بعد خاص مبلغانہ انداز میں تلقین کی۔ "امیر! خواہشِ نفسانی کی جڑ مایا ہے، نام و نشان، حکومت، دولت، عزت، جسمانی اور روحانی لذتیں، جوانی، حسن اور عشق یہ ساری چیزیں ناپائدار ہیں، اور دھوکے کی ٹٹیاں ہیں، انسان ان کی طرف کتنی خوشی اور امنگوں سے ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن یہ ساری چیزیں اپنے وجود میں دھوکا ہیں؟ اور دھوکے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے حاصل؟"

امیر نے اطمینان کا سانس لیا، بولا۔ "شکر ہے مولا! مجھے ایسا ہی دیانت دار آدمی درکار تھا!"



امیر کے چلے جانے کے بعد وہاں آزادی کی فضا پیدا ہو گئی۔ چندا بودھ بھکشو کو گرویدہ کرنے کے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہی وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ناگلا کا وجود ناپید ہو جائے، اس کے بعد وہ اس بھکشو کو اپنے قریب لانے میں کامیاب ہو سکتی ہے، محلسرا کی اور عورتیں بھی اس نادشے کو بغور اور حسرت سے دیکھتی رہتیں۔

رات کے پچھلے پہر سب کو سوتا چھوڑ کر چندا باہر نکلی اور کمپا کے حجرے کی طرف چل پڑی، مسلح پہرےدار خواتین کے بھیانک سائے در و دیوار پر پھیل رہے تھے ابھی کچھ ہی دُور وہ گئی ہو گی کہ اس کی پشت میں کسی نے کوئی نوکیلی چیز گھسیڑ دی، اس نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا ایک پہرےدار عورت اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ "اتنی رات گئے کہاں جا رہی ہو؟"

چندا نے اپنی انگلی کی قیمتی انگوٹھی پہرےدار عورت کے حوالے کر دی، اور اس سے انگوٹھی کے صلے میں رازداری کا عہد لیا حجرے کے اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی، چندا نے دروازے کی درز سے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمپا ننگے فرش پر اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے، اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی، نوجوان بھکشو فوراً بیدار ہو گیا اور پوچھا۔ "کون؟" چندا نے جواب کے بجائے پھر دستک دی کمپا اُٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا اور پھر پوچھا "کون؟"

چندا کو شرارت سوجھی، بہت ترنگ میں تھی، بولی۔ "دروازہ کھولو میں ہوں ناگلا!"

کمپا نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ چندا فوراً اندر داخل ہو گئی۔

کمپا نے حیرت سے کہا۔ "دیوی یہ تم!! اس وقت!! کیا بات ہے؟"

چندا نے خود ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اطمینان سے نوجوان بھکشو کے رُوبرو زمین پر بیٹھ گئی، کمپا نے اُٹھ کر چادر بچھا دی اور نرمی سے بولا۔

"دیوی! اس پر بیٹھو!"

چندا نے کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس شرط پر بیٹھوں گی کہ اس کے دوسرے کنارے پر تم بھی بیٹھو گے!"

کمپا بھی سامنے ہی بیٹھ گیا، پوچھا۔ "ہاں دیوی! اب بتاؤ کیسے آنا ہوا اس پاپ کی طرح تاریک رات میں۔"

چندا نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم سچ مچ ناگلا سے محبت کرتے ہو؟"

کمپا نے جواب کو ٹالنا چاہا، بولا۔ "دیوی ان باتوں کا یہ وقت نہیں ہے پھر کبھی پوچھ لینا یہ بات!"

چندا نے ضد سے کام لیا، بولی۔ "نہیں، میں اسی وقت یہ جواب لے کر جاؤں گی!"

بھکشو نے پوچھا۔ "کیا ناگلا نے کہی ہے تم سے کوئی بات؟"

"نہیں، ناگلا نے کوئی بات نہیں بتائی!"

بھکشو نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا اور کچھ سوچنے لگا جب وہ دیر تک کچھ نہ بولا

تو چندا نے کہا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے!"

کمپا نے پھر گول مول جواب دیا "تمہارے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں!"

چندا نے غصے میں کہا "بدوضع بھکشو! تو اپنے آپ کو آخر سمجھتا کیا ہے؟ کیا اپنے اس حلیے میں کبھی تو نے آئینہ بھی دیکھا ہے؟ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کسی قبر سے مُردہ نکل بھاگا ہو، پھر بھی تو اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے!"

کمپا نے تحمل سے جواب دیا "میں کچھ بھی نہیں دیوی، میں اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتا، دیوی نے جو کچھ سمجھا یا کہا یہ اس کی بھول ہے!"

چندا پر جنون کا دورہ پڑ گیا ذرا زور سے بولی "ناگلا کے سوا تجھے کوئی بھی نہیں چاہ سکتا، میں جو تیرے پاس آئی ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے تجھ سے محبت ہو گئی ہے، بلکہ محض اس لیے کہ تو جیسا کچھ بھی ہے ایک مرد ضرور ہے!" اس کے بعد زار و قطار رونے لگی "میں اس محلسرا نامی سنگی قبرستان میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی لیکن میں نہیں مرنا چاہتی بھکشو! مجھے بچا لو۔"

کمپا اس صورت حال سے گھبرا کر تھر تھر کانپنے لگا، بولا "دیوی! ذرا دھیرے دھیرے بات کرو، باہر کوئی سن نہ لے کہیں ہم دونوں کی باتیں!"

چندا کی آواز اور اونچی ہو گئی "میں نہیں ڈرتی، میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی، دیکھو، ادھر دیکھو میری طرف، اس سینے میں کتنے داغ پڑ چکے ہیں، یہ سینہ ضبط اور برداشت کے نیزوں سے چھلنی ہو چکا ہے!" یہ کہتے کہتے اس نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ اس پر اختناق کا دورہ پڑ گیا۔

گریبان کے چاک ہوتے ہی نفسانی خواہشات اور ترغیبات کے بلبلے عریاں ہو کر اس طرح حقیقت بن کر سامنے آ گئے کہ بھکشو کے ضبط و برداشت میں زلزلہ سا آ گیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی اختناق کا شکار ہو گیا ہے اعصاب میں تشنج اور اعضا میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا اور گڑگڑایا "اوشا کیا منی! ناری کے شر سے بچا۔ مارا ناری کے روپ میں نازل ہو کر میرے گیان اور تپسیا کی تباہی پر آمادہ ہے!"

چندا نے اسے جھنجوڑ کر سیدھا کرنا چاہا، وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے حجرے کے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی چندا بھی باہر نکل گئی لیکن وہاں سخت تاریکی تھی اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ بھکشو کہاں چلا گیا۔ وہ مایوس، اداس اور شرمندہ ہو کر وہاں سے چلی گئی لیکن یہ طے کر کے کہ اس بھکشو کو اس انحراف اور فرار کی سخت سزا دلوائی جائے گی۔

صبح کمپا اپنے حجرے سے جا چکا تھا۔ ناگلا پریشان ہو گئی، چندا جانتی تھی کہ بھکشو کیوں چلا گیا؟ وہ اپنے کیے پر نادم تھی، اب وہ یہ ضرور جاننا چاہتی تھی کہ بھکشو آخر گیا کہاں، اس نے محلسرا کے ایک خواجہ سرا کو اس کی تلاش میں لگا دیا، قصر کے صدر پھاٹک کے دربانوں نے یہ بتایا کہ بھکشو وٹوبا واپس گیا ہے۔

جب وہ کئی دن واپس نہ آیا تو ناگلا کو بڑی تشویش ہوئی اس نے چندا کو آمادہ کیا کہ وہ حرم سرا کے خواجہ سراؤں میں سے دو چار کو ساتھ لے کر وٹوبا چلے اور بھکشو کی خیریت معلوم کر کے اسے واپس لانے کی کوشش کرے، چندا ساتھ جاتے گھبرائی لیکن پھر اس خیال سے آمادہ ہو گئی کہ بھکشو سے مل کر اس کے خیالات اور ارادوں کا پتہ چلانا بہت ضروری ہے تاکہ وہ وقت پڑنے پر کامیاب دفاع کر سکے۔

ان کا رتھ کھڑکھڑاتا ہوا وٹوبا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک خواجہ سرا وٹوبا کے اندر چلا گیا۔ اندر ستونوں اور دالانوں کی بھول بھلیوں سے گزر کر تلاش کرتا اور پوچھتا پاچھتا جب وہ مہاتما بدھ کے اس مجسمے کے روبرو پہنچا، جہاں گوتم نروان پا کر تشاآش بیٹھا تھا، اور اس کے چہرے سے طمانیت کا اظہار ہو رہا تھا، خواجہ سرا اسے اس حال میں دیکھ کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ سرا کے حکم سے وٹوبا کے دوسرے بھکشو ادھر ادھر روپوش ہو گئے اور چندا آہستہ آہستہ سنسان دالانوں اور ستونوں سے گزر کر کمپا کے سر پر پہنچ گئیں۔

کمپا گڑگڑا رہا تھا "اے تشاکیا منی! اپنے بھکشو کے دل کو وہی پہلے جیسا سکون اور پاپ کے خیال تک سے پاک ایمان عطا فرما! اے اہنسا کے اوتار! میرے دل کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ جدھر جاتا ہوں ہوس میرے ساتھ چلی آتی ہے، مجھ پر رحم کر، و شاکیا منی!" چندا خوش ہوئی کہ اس کا گھائل اسے بھول جانے پر قادر نہیں رہا۔

چندا نے آہستہ سے پکارا "کمپا! اوپر سر اٹھاؤ، دیکھو میں تم سے ملنے آئی ہوں!"

کمپا نے جیسے ہی سر اٹھایا پہلی نظر چندا پر پڑی، اس کے رہے سہے ہوش و حواس بھی جاتے رہے، پھرتی سے کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح ایک طرف بھاگ کر روپوش ہو گیا۔

ناگلا حیران تھی کہ کمپا کو آخر یہ ہو کیا گیا ہے،

چندا نے خواجہ سرا کو حکم دیا کہ اس بھکشو کو تلاش کر کے زبردستی پکڑ کر اس کے سامنے لایا جائے لیکن وہ کہیں بھی نہ مل سکا۔ آخر یہ لوگ دل شکستہ وہاں سے واپس چلے آئے!

وٹوبا کے اس حصے میں جہاں شہزادے سدھارتھ (گوتم بدھ) کو رات کی تاریکی میں شاہی محل اور بیوی بچے چھوڑ کر جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور جانے سے پہلے وہ ان پر ایک الوداعی نظر ڈال رہا ہے، کمپا نے گوتم کے قدموں

میں اپنا سر رکھ دیا اور گڑگڑایا۔

"اے تتھاگیا منی! وہی خلش اور وہی ضبط و برداشت مجھے بھی عطا کرو جس کا تم اس مورتی میں مظاہرہ کر رہے ہو۔ جنس اور ہوس نے میرے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا ہے!" اس کے بعد اس کی آواز رندھ گئی، بولا۔ "اور مشکل تو یہ ہے کہ میں تمہارے چرنوں میں سر رکھ کر جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ گناہ کی یہ دیویاں مجھے اچھی لگنے لگی ہیں، اس کو نفرت میں بدل دو تتھاگیا منی!"

اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے دل میں بیٹھا کہہ رہا ہے "کمپا گیان کرو، گیان میں بیٹھو اور یکسوئی سے تتھاگیا منی کا دھیان کر کے اس شیطانی وسوسے سے پیچھا چھڑا لو۔"

کمپا اُٹھا اور اس اندر کی آواز کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک طرف روانہ ہو گیا۔



امیرِ علائی ایسا غائب ہوا کہ مدتوں حرم سرا کی خواتین اس کی خیر خبر سے محروم رہیں، انہیں کیا پتہ تھا کہ امیران صدہ کی پے در پے متحدہ لڑائیوں نے سلطان محمد تغلق کو جنوبی ہند سے بے تعلق کر دیا ہے اور اب دکن کے تاج و تخت پر ایک ایسے شخص کا قبضہ ہو چکا ہے جو کچھ دنوں پہلے خود بھی امیران صدہ میں ایک امیر شمار ہوتا تھا۔ ان باتوں کی اطلاع صرف اُس شخص کو حاصل تھی جو امیر علائی کی عدم موجودگی میں اُس کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا تھا لیکن یہ بات اُسے بھی نہیں معلوم تھی کہ خود امیرِ علائی ان جنگوں میں اپنا ایک پیر گنوا چکا ہے اور وہ اُن دنوں دکن کے نئے تاجدار اور اپنے ساتھی علاء الدین حسن کے پاس زیرِ علاج ہے۔ اسی دوران امیرِ علائی کا ایک خط آیا جس میں اس نے کمپا کی بابت بہت سے سوالات کیے تھے۔ "اس کے روزمرہ کے مشاغل کیا ہیں، اس کی بابت کوئی ایسی ویسی افواہ تو نہیں سُنی گئی؟ خواتین کی قربت نے کوئی رنگ دکھایا؟ وہ اب بھی وہی بھکشو ہے یا اس کی ظاہری وضع قطع میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے؟"

ان ساری تفصیلات کا جواب دو سطروں میں بھیج دیا گیا۔ "کمپا امیر کے جانے کے کچھ دنوں بعد ہی کہیں چلا گیا، کچھ پتہ نہیں کہ کیوں اور کہاں گیا؟"

امیرِ علائی کو جب یہ جواب ملا تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ ناگلا کی یاد اب بھی اسے ستا رہی تھی، ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، جس سرکش اور خودسر ناگلا کو وہ دو ٹانگوں کی مدد سے نہ پکڑ سکا تھا اب ایک ٹانگ سے کس طرح پا سکے گا اسے اب کمپا کی زیادہ ضرورت تھی، خود ناگلا بھی کمپا کے لیے بہت پریشان تھی، چندا یہ سوچتی کہ اگر اس نے اس رات اتنا تجاوز نہ کیا ہوتا تو بے بدن بیزار بھکشو کبھی نہ جاتا اسے اپنی جلد بازی اور مآل نااندیشی پر سخت شرمندگی تھی۔

لیکن ایک دن سہ پہر کو جبکہ دھواں دھار بارش ہو چکی تھی، اور گھرے سیاہ بادل اب بھی گھرے کھڑے تھے، کسی کسی لمحے کوندا بھی لپک رہا تھا اور کہیں قریب ہی سے یکے بعد دیگرے موروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، قصرِ علائی کی فصیل کے نیچے اُبلتا ہوا نالا زور شور سے بہہ رہا تھا اور حرم سرا کی خواتین برہا کی آگ میں سُلگ رہی تھیں، کفنی میں منہ چھپائے کمپا قصر کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوا۔ امیر کے نائب نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بھکشو کے جسم سے لپٹی ہوئی کفنی بھیگ کر جسم سے چپک چکی تھی، نائب نے عجلت میں امیرِ علائی کی طرف سے اس کی مزاج پُرسی کی اور خیریت دریافت کی، بھکشو نزلے کا شکار تھا اس نے زبان سے کم اور اشاروں میں زیادہ یہ بتایا کہ اسے اس کے حجرے میں پہنچا دیا جائے، سوالات کے جوابات وہ ذرا توقف سے دے گا۔ اسے اس کے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔

ناگلا خوشی سے دیوانی ہو گئی وہ کمپا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین تھی، اس کے برعکس چندا کش مکش کا شکار تھی، اس کا جی تو چاہتا تھا کہ کمپا کے حجرے میں اسی وقت پہنچ جائے لیکن جانے میں تامل یوں تھا کہ کہیں بھکشو اسے دیکھتے ہی پھر واپس نہ چلا جائے اس تشویش میں ایک امید کا پہلو بھی موجود تھا، چندا یہ بھی سوچتی تھی کہ بھکشو کی واپسی کا سبب چندا کی چاہت بھی ہو سکتی ہے، بہت ممکن ہے کہ بھکشو اپنے کیے پر نادم ہوا اور اسے اپنی خشک زندگی پر ندامت اور خجالت ہونے لگی ہو۔

ناگلا اس کے حجرے میں داخل ہوتے ہی بے قابو ہو گئی، بھکشو کھڑا ہو گیا، ناگلا نے اس کی گیلی کفنی کا خیال کیے بغیر ہی اپنا سر اس کے کاندھے سے ٹکا دیا اور سسک سسک کر رونے لگی، چندا باہر کھڑی درز سے جھانک کر تلملا رہی تھی!

"تم کہاں چلے گئے تھے آخر؟" ناگلا سِسک سِسک کر بولی۔ "میں تو تم سے مایوس ہو گئی تھی!"

بھکشو نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، بولا۔ "یہ ایک راز کی بات ہے" پھر پوچھا۔ "وہ عورت کہاں ہے، جو اکثر تمہارے ساتھ آیا کرتی تھی؟"

ناگلا نے سینے سے سر ہٹا کر غور سے بھکشو کو دیکھا اور بے دلی سے پوچھا "اس سے کیا کام ہے تمہارا؟"

"اسے بلاؤ!" وہ کہنے لگا۔ "میں اپنے گزشتہ رویّے پر نادم ہوں"

ناگلا نے ضد کی۔ "مجھے سارے واقعات بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

بھکشو نے تلخی سے کہا۔ "ناگلا کسی کے ذاتی معاملوں کی کرید دھرم کے خلاف ہے تو اس دیوی کو میرے پاس بھیج دے، میں اپنے کیے کی اس سے معافی مانگوں گا!"

ناگلانے کہا "اچھا بلا دوں گی، تم یہ گیلی چادر تو اُتار دو!"

حجرے میں دوبارہ آنے کے بعد پہلی بار بھکشو نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ حجرے کی ہر شے پر گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لکڑی کا صندوق چوہوں نے کُتر ڈالا تھا اور چوہوں کے لائے ہوئے چند روٹی کے ٹکڑوں پر پھپھوند جمی ہوئی تھی۔

ناگلانے صندوق سے دوسری چادر نکالی جسے کفنی کی طرح کمبلانے لپیٹ لیا۔ اور بولا "ناگلا! اب تم باہر جاؤ اور اگر وہ دیوی آنے پر آمادہ ہو تو اُسے یہاں بھیج دو!"

ناگلا باہر نکل گئی اور چندا سے کہنے لگی "شاید کمپا کی بات تم نے بھی سُن لی ہوگی، معلوم نہیں کیوں وہ تمھیں اندر بلا رہا ہے"۔ یہ کہتے کہتے اس نے چندا کو تشکک و شبہے کی نظروں سے دیکھا۔

چندا کچھ تامل کے بعد جھجکتی شرماتی اندر داخل ہوگئی۔ بھکشو دو قدم پیچھے ہٹ گیا، حیرت سے پوچھا "تو کیا تم یہیں کہیں موجود تھیں؟"

چندا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ صحت گنوائے ہوئے بھکشو کا بوڑھا چہرہ غور سے دیکھنے لگی، اب تو وہ بہت ہی ڈراؤنا ہوگیا تھا اسے حیرت تھی کہ چہرے کی اس وحشت اور بھیانک پنے کو ناگلا نے کیوں نہیں محسوس کیا اسے تو بھکشو سے ڈر لگ رہا تھا اس کے سارے وہ احساسات جو مروّت کی کمی کی وجہ سے بھکشو پر مائل ہو جانے کی صورت میں کبھی پیدا ہوئے تھے اس وقت زائل ہوگئے۔

بھکشو اپنی حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں سے چندا کو دیکھتا رہا، اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظریں چندا کے گریبان پر جمی گئیں جو ایک مرتبہ اس کے سامنے چاک ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر جذبات میں ہلچل مچی اور بھکشو کانپ گیا، ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیں اور جبراً اس طرح بولا گویا کہیں دُور سے بول رہا ہے "دیوی! تو نے مجھے ہلکان کر کے رکھ دیا ہے، پہلے جو کچھ میں نے یہاں دیکھا تھا اس سے بھاگ کر میں نے جہاں بھی پناہ لینا چاہی تو نے میرا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جہاں تو خود نہ پہنچ سکی تیرا خیال پہنچ گیا اور پاپ کے وہ دوانگلے جنھوں نے میری تپسیا اور گیان دھیان کو جلا ڈالنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی ہر جگہ خیالوں میں آ آ کر میرا پیچھا کرتے رہے، عاجز آ کر میں نے مہادیو کی پہاڑیوں میں مراقبہ کیا، وہاں مارا (شیطان) نے مختلف شکلوں میں آ آ کر میرے گیان دھیان کا سلسلہ توڑ دینا چاہا لیکن میں بھی تنا کیا منی کا دھیان کیے وہیں بیٹھا رہا اور آخر ایک دن تنا کیا منی نے خود ظاہر ہو کر یہ ہدایت کی کہ ضبطِ نفس اسے نہیں کہتے کہ امتحان گاہ سے بھاگ کر اپنا پیچھا چھڑالو اور غلط فہمی سے یہ سمجھتے رہو کہ



تم نفس کی آزمائش میں پورے اُتر گئے ہو، میں نے تنا کیا منی سے پوچھا کہ اونروانی مہاتما اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ مہاتما نے حکم دیا کہ میں تمھارے پاس واپس پہنچوں اور اس آگ کے سمندر سے پار اُتر کر نفس کُشی کا امتحان دوں، سو دیوی! میں حاضر ہوں، تم اپنی ناز و ادا کے سارے تیر مجھ پر چلا سکتی ہو، اپنے تمام عشووں اور غمزوں کے ہتھیار مجھ پر آزما سکتی ہو اور ناری کے سارے چَتر اس بھکشو پر آزما کر دیکھ لو، تنا کیا منی کی کرپا سے تم مجھے ہلا بھی نہ سکو گی۔"

چندا کے لیے بھکشو میں اب کوئی دلکشی باقی نہ رہی تھی لیکن اس کے بڑبولے پن نے چندا کے دل میں آگ لگا دی، یکایک مغربی گھاٹ کے پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والے مانسونوں نے پھر بارش شروع کر دی اور حجرے میں پانی کی نمی میں ڈوبی ہوئی ہواؤں نے جسم سے ٹکرا کر جذبات کی آگ بھڑکانا شروع کر دی، بھکشو چٹان کی طرح آنکھیں کھولے چندا کو دیکھتا رہا۔ نفسانی موجوں نے جب بھی سر اُٹھانے کی کوشش کی ضبط اور ارادے کی چٹانیں سینہ سپر ہوگئیں اور موجیں ان سے ٹکرا کر پھر انھی گہرائیوں میں گم ہوگئیں جہاں سے اُبھری تھیں۔

چندا کو ظالم و جابر امیر عُلائی کی یاد آئی اور اس کی یاد میں اس نے اتنی شدید انگڑائی لی کہ جگہ جگہ سے کپڑے مسک گئے اور لباس کے مسکان کی لطیف آواز سن کر نفس کی ایک سرکش لہر اس زور سے اُبھری کہ ضبط اور ارادے کی چٹانیں پھلانگتی ہوئی آرزو اور اشتیاق بن کر آنکھوں کی راہ سے چندا کے زور آور شباب کا جائزہ لینے لگی، اب شکست سے بچنے اور اس سرکش نفسانی موج کو باز رکھنے کی ایک ہی ترکیب رہ گئی تھی، آنکھوں کے روزن بند کر لیے اور چور دروازوں پر پلکوں کے پٹ بھیڑ دیے۔

❦ ❦

امیر عُلائی نے خود آنے کے بجائے بھکشو کو بُلا بھیجا وہ قصر میں واپس آنے سے پہلے اس بھکشو سے کچھ جاننے کا خواہش مند تھا۔ دوسرے اس کے کانوں میں یہ افواہ بھی پہنچ چکی تھی کہ بھکشو، چندا میں کچھ دلچسپی لینے لگا ہے، دکن کے نئے تاجدار علاؤ الدین حسن کی رسمِ تاجپوشی بھی ادا ہونے والی تھی، طبیعت کی ستم ظریفی یہ بھی چاہتی تھی کہ یہ تارک الدنیا بھی دنیا کی شان و شوکت اور جاہ و حشم اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

بھکشو کے ساتھ چند خواتین کو بھی طلب کیا گیا تھا۔ ان میں ناگلا اور چندا کے نام سرِفہرست تھے، گلبرگہ تک کا سفر نہایت شان اور اطمینان سے طے ہوا، ان سب کو علاء الدین حسن کے شاہی مہمان خانے میں ٹھیرایا گیا۔

جب امیر عُلائی بیساکھیوں کے سہارے لنگڑاتا ہوا اُن کے سامنے

آیا تو سب دھک سے رہ گئے۔ بھکشو کیپا نے یہاں بھی اسے معاف نہ کیا۔ دلیری سے کہا: "پچھلی زندگی کے پاپ تجھے ایک بار پھر جنم لینے پر مجبور کر دیں گے!"

امیر نے سُنی اَن سُنی کر دی لیکن وہ اس بھکشو کی عظمت کا قائل ضرور تھا اسے حیرت تھی کہ جس نفس نے اُسے بُری طرح پچھاڑ رکھا ہے اس پر اس بھکشو نے کس طرح قابو پا لیا ہے۔ اس نے درشت مزاج اور خشک خو بھکشو کو غور سے دیکھا جس کی صحت تباہ ہو چکی تھی اور جو کسی مُردے کی طرح آنکھیں نکالے سامنے بیٹھا تھا۔

امیر نے تخلیے میں اس سے ناگلا کی بابت بہت سارے سوالات کیے لیکن بھکشو نے ان سب کا ایک ہی جواب دیا کہ "یہ ساری باتیں یہاں کرنے کی نہیں ہیں قصر واپس چلو ناگلا تمھیں مِل جائے گی۔"

امیر مطمئن تو ہو گیا لیکن کانٹا اب بھی چُبھ رہا تھا۔ پوچھا: "اب ہم ایک ٹانگ کے رہ گئے ہیں کیا ناگلا اسے ناپسند تو نہ کرے گی؟"

بھکشو نے کہا: "یہ سب کچھ تمھارے کرموں کا پھل ہے۔ نیک کام، نیک ارادے، نیک خیالات اور نیک گفتگو یہ ہے اچھے کرم کی تعریف، ذرا سوچو تو کہ تم خود ان چاروں میں سے کتنوں پر کاربند ہو؟"

امیر نے چندا کے بارے میں اُچٹتا سا سوال کیا۔ کہا: "تم نے چندا کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ تمھارے بیان کردہ چار کرموں میں سے کس کس پر عمل پیرا ہے؟"

بھکشو نے صاف صاف کہہ دیا: "ایک پر بھی نہیں کیونکہ بھیڑیوں میں بکری کس طرح زندہ رہ سکتی ہے مرد بھیڑیوں میں بھیڑنی ہی بن کر کوئی عورت رہ سکتی ہے!"

امیر نے طیش میں آ کر سوچا کہ اس گستاخ اور زبان دراز بھکشو کو سزا دینی ہی پڑے گی، اب یہ بہت بڑھ چکا ہے۔

اس کے بعد امیر نے چندا سے ملاقات کی۔ چندا نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ امیر سے چمٹ گئی اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔ امیر عُلائی نے چندا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے پوچھا: "تم رو کیوں رہی ہو چندا؟"

چندا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: "اب امیر کو چلنے پھرنے میں کتنی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی، یہی سوچ سوچ کر کنیز کو رونا آ رہا ہے۔"

امیر اس کی محبت سے بہت متاثر ہوا۔ کہنے لگا: "چندا! تم اس کی فکر نہ کرو، ہم معمولی آدمی نہیں ہیں، ہماری ایک ٹانگ کٹ گئی تو کیا ہوا، ہمارے لیے ہاتھ پیروں کی کیا کمی ہے؟"

چندا نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنسوؤں سے امیر عُلائی کا سینہ تر کرتی رہی۔ امیر نے کہا: "چندا یہ بھکشو کیسا آدمی ہے؟" چندا نے چونک کر امیر کے سینے سے سر اُٹھایا اور بے چارگی اور تشویش سے امیر کی صورت دیکھنے لگی۔ امیر نے مزید کہا: "تم گھبراؤ نہیں، معلوم نہیں کیوں بھکشو تمھیں اچھی، نیک اور پارسا عورت نہیں سمجھتا۔"

چندا دل میں ڈری کہ شاید بھکشو نے سب کچھ امیر کو بتا دیا ہے اور اب وہ نہایت ہوشیاری اور نرمی سے خود چندا سے اس کی تصدیق کرانا چاہتا ہے۔ چندا کے سینے میں انتقام کے جھکڑ چلنے لگے، نفرت اور غصے کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، فوراً امیر سے جدا ہو گئی اور غصے میں بولی: "یہ بھکشو ننگا سیاہ ہے امیر! اس کے کرتوت تو یہ کنیز امیر کے گوش گزار کرے گی!"

اس کے بعد وہ اپنے کپڑوں میں سے گریبان چاک اور مسکا ہوا لباس نکال لائی۔ انھیں امیر کے روبرو پیش کرتی ہوئی بولی: "اب امیر خود ہی اس بات کا اندازہ لگائیں کہ کون گناہگار ہے اور کون بے گناہ، اس نے کئی بار تنہائی میں اس کنیز کو بے آبرو کرنا چاہا اور کنیز نے اسے ہر بار ناکام بنا دیا ہے۔ ایک مرتبہ تو اس ذلیل بھکشو نے کنیز کا گریبان ہی چاک کر کے رکھ دیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے جان بچائی، اور اس روباہ صفت درندے کو دھکے دے کر دُور کیا اس کے بعد شاید خوفزدہ ہو کر یہ کہیں فرار ہو گیا اور مدتوں غائب رہا۔ پھر جب واپس آیا تو مجھے یہ یقین دلانا چاہا کہ اب وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے آئندہ اس قسم کی حرکت نہ ہو گی۔ میں نے اس پر اعتماد کر لیا لیکن اس بھیڑیے نے موقع پاتے ہی ایک بار پھر مجھ پر حملہ کیا اور اپنی پوری قوت سے مجھے اپنے سینے سے لگا لینا چاہا۔ میں نے بچنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں میرا لباس مسک گیا جو امیر کے سامنے ہے!" اتنا کہہ کر چندا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

امیر مشتعل ہو گیا۔ چندا نے یہ اشتعال اور بھڑکایا۔ بولی: "میں پورے اعتماد اور یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ناگلا اور بھکشو میں ایک مرد اور عورت کا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ اس کنیز نے بارہا دونوں کو اس طرح دیکھا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لیے اس طرح باتوں میں مشغول ہے کہ اسے دُنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہے!"

امیر کو اپنی حماقتوں پر افسوس ہوا۔ بولا: "ہم نے تو تمھارے ہی مشورے پر اس ناہنجار بھکشو کو ناگلا کے لیے بُلایا تھا!"

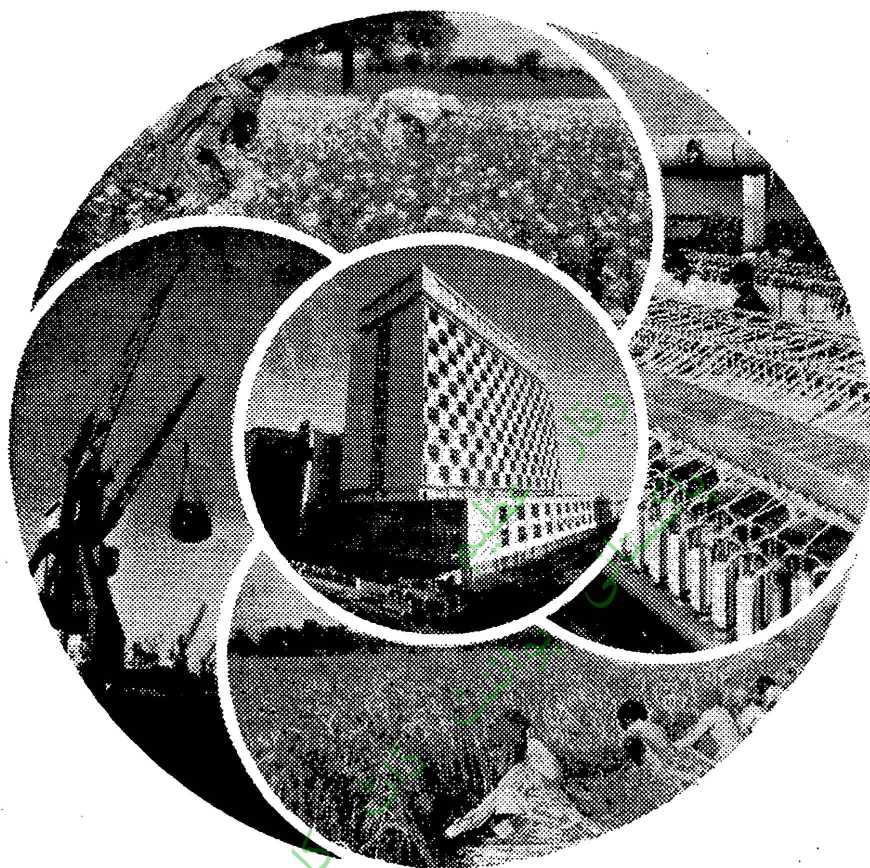
چندا نے جواب دیا: "لیکن کنیز کو یہ کیا پتہ تھا کہ امیر ناگلا کے عاشق کو پکڑ لائیں گے!"

امیر نے پوچھا: "اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

چندا نے کہا: "اس کا فیصلہ قصر میں پہنچ کر فرمائیے گا!"

مشورہ مناسب تھا۔ امیر نے سکوت اختیار کیا۔

سب رنگ





---

بھکشو نے ناگلا کو سرگوشی میں سمجھایا "ناگلا! تمھیں لنگڑے امیر کی دل جوئی ہر حال میں کرنی ہے میری خاطر، اپنی خاطر!"

ناگلا نے دُکھ سے کہا "لیکن بات اگر دل جوئی اور باتوں ہی کی حد تک رہے تو کوئی بات نہیں امیر تو میری نرمی اور بناوٹی لگاوٹ سے کچھ زیادہ ہی جسارت کر بیٹھے گا!"

بھکشو نے کہا "کوشش کر کے امیر کو پھسلا کر وٹھّا تک واپس چلو، وہاں پہنچ کر دیکھا جائے گا!"

ناگلا نے بے چارگی اور عاجزی سے کہا "ہمارے دھرم میں مشکل یہ ہے کہ یہاں دوسرے دھرموں جیسی توبہ یا پرائشچت (کفارہ) نام کی کوئی چیز بھی نہیں، انسان سے جو گناہ سرزد ہو جاتا ہے اسے توبہ کر کے یا پرائشچت کے ذریعے دھویا نہیں جا سکتا۔ تم اس کا کیا جواب دوگے کہ اگر کسی طرح میں کسی پاپ کی مرتکب ہو گئی تو اس کا ازالہ کس طرح ہوگا؟"

بھکشو نے جواب دیا "تم اس کی فکر نہ کرو، ہم ایسے حالات میں گھِر گئے ہیں کہ ہم سے کچھ پاپ یقینی سرزد ہوں گے، ہم اپنے ان پاپوں کا اگلے جنموں میں ازالہ کر دیں گے!"

ناگلا نے غمزدہ لہجے میں کہا "ہم دونوں کا مقصد ایک ہی ہے اس لیے ہمیں کچھ پاپ کرنا ہی پڑیں گے اور دوسرے جنموں کو گزارا کرنا ہی پڑے گا"

اس گفتگو کے بعد جب ناگلا امیر کے پاس گئی تو اسے بہت زیادہ خوش اخلاقی اور لگاوٹ کا اظہار کرنا پڑا۔ اس نے امیر کو یہ یقین دلایا کہ کمپا کے اس رس سے متاثر ہو کر اس نے خود کو بدل دیا ہے کہ بودھ دھرم میں دل آزاری سے بڑا کوئی پاپ نہیں، وہ امیر کا دل نہیں توڑے گی۔ امیر کے لیے یہ ایسی خوش خبری تھی کہ اس نے بے ساختہ ناگلا کو سینے سے لگا لیا وہ سرکش لڑکی جو پہلے دو چار قدم پیچھے ہٹ کر اپنا دفاع کرتی تھی۔ اب کمپا کی ہدایت اور تعلیم کے زیرِ اثر امیر کی آغوش میں جا بیٹھی، جب امیر نے خود کو بے لگام چھوڑنا چاہا تو ناگلا نے ذرا سی مدافعت کی اور امیر کو یہ کہہ کر باز رکھا کہ وہ جلدی کو کام میں نہ لائے، قصر واپس چلے اور وہاں اسے باقاعدہ طور پر خود سے وابستہ کر کے جو چاہے کرے، اس کے ساتھ ہی اس نے یہ درخواست بھی کی کہ اس کی وابستگی کے بعد اسے بودھ دھرم چھوڑ دینے پر مجبور نہ کیا جائے وہ تتھاگیامنی کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ امیر نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اسے ایک بار پھر بھکشو سے عقیدت ہو گئی اس نے سوچا کہ اگر بھکشو اور ناگلا میں واقعی تعلقات محبت موجود ہیں تو یہ دونوں ایک لنگڑے غیر مذہب امیر کے لیے اتنی بڑی قربانی کیوں

دے رہے ہیں؟ اسے چندا کی داستان مشتبہ محسوس ہونے لگی، متلون مزاج امیر نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اگر چندا کی روداد درست بھی ہے تو بھی اس عجیب و غریب بھکشو کے ساتھ روادارانہ اور مخیرانہ سلوک کرنا پڑے گا اگر یہ سادہ لوح تارک الدنیا واقعی چندا کے حسن کا گھائل ہو گیا ہے تو وہ چندا کو اس شرط پر بھکشو کے حوالے کر دے گا کہ پہلے وہ یہ بھکشو کی کفنی اُتار پھینکے اور زندہ انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا وعدہ کرے اس کے بعد چندا اس کے حوالے کر دی جائے گی

گلبرگہ کے در و دیوار علاء الدین حسن کی تاج پوشی کی خوشی میں سجے ہوئے تھے، منجنیقوں میں پتھروں اور گولوں کی جگہ سونے چاندی کے سکے بھر بھر کر برسائے جا رہے تھے، مٹھائی کی گولیاں برس رہی تھیں، قرب و جوار کے حکمران اور اُمرا پورے کر و فر سے گلبرگہ میں حاضر تھے، عیش و عشرت کا اتنا سامان مہیا تھا کہ بھکشو کے دل میں ہلچل سی مچ گئی جیسے بار بار کوئی یہ پوچھتا "کیا! زندگی وہ ہے جو تو نے اختیار کی ہے یا یہ جو آس پاس نظر آ رہی ہے؟" اس نے گھبرا کر تتھاگیامنی کے نام کا ورد کیا اور شیطانی خیالات سے پیچھا چھڑا لیا۔



سلطان قطب الدین کی مسجد میں رسمِ تاج پوشی کی ادائیگی سے پہلے ساعتوں کے انتخاب میں کش مکش ہو گئی۔ ہندو منجموں اور پنڈتوں نے اس رسم کے لیے جو ساعت مقرر کی تھی، امیرانِ صدہ میں سے دو امیر صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد بدخشی کو اس سے اختلاف تھا یہ دونوں امیر خود بھی اعلیٰ درجے کے منجم تھے، علاء الدین حسن کا رجحان ہندو منجموں کی طرف تھا۔

امیرِ علائی نے بھکشو سے پوچھا "کیا تمھیں بھی یہ علم آتا ہے؟"

بھکشو نے جواب دیا "بدھ ترکِ حکومت کی تعلیم دیتا ہے تاج پوشی کی نہیں!"

امیرِ علائی ہنسنے لگا، پوچھا "اگر تجھ سے پوچھا جائے کہ ہندو اور مسلمان منجموں میں سے کون زیادہ لائقِ اعتبار ہے تو کس کی تائید کرے گا؟"

"ہندو منجموں کی!" بھکشو نے جواب دیا۔

اسی دوران علاء الدین حسن کے سر پر ہندو منجموں کی بتائی ہوئی ساعت میں تاج رکھ دیا گیا اور نئے سلطان نے اپنا پہلا شاہی فرمان کے لیے یہ طے کیا "کمترین بندہ حضرت سبحانی علاء الدین حسن گانگوئے بہمنی"۔

مسلمان اُمرا کو اس سے اختلاف ہوا وہ گانگوئے بہمنی کا مطلب سمجھنا چاہتے تھے، سلطان نے لوگوں کو بتایا کہ جب ہم غریب تھے تو ہم نے گانگو برہمن کے پاس ملازمت کی تھی۔ اس برہمن نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہم ایک نہ ایک دن حکمران ہو جائیں گے اس وقت اس نے ہم سے یہ

وعدہ لیا تھا کہ اگر اس کی پیش گوئی پوری اُترے تو یادگار کے طور پر اس کا نام بھی ہمارے نام میں شامل کر لیا جائے آج ہم نے اپنا وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب ہم اسے دہلی سے بُلا کر خزانے کا محکمہ اس کے سپرد کریں گے۔"

مسلمان اُمرا اور منجم چپ ہو رہے۔ امیر علائی خوفزدہ تھا کہ کہیں ہندو منجموں کی مقررہ ساعت نے سلطان کو نقصان نہ پہنچا جائے، اس نے صدر الشریف سمرقندی سے پوچھا "اگر سلطان تمہاری بتائی ہوئی ساعت میں تاج پہنتا تو اس کے کیا اثرات ہوتے؟"

اس کے استفسار کو سلطان حسن بھی سُن رہا تھا، صدر الشریف نے جواب دیا "اگر سلطان ہماری بتائی ہوئی ساعتوں میں تاج پہنتا تو اس کے خاندان میں سات سو سال تک حکومت رہتی اور تقریباً ایک سو پچاس افراد حکمرانی کرتے لیکن اب سلطان کے خاندان میں دو سو سال سے بھی کم مدت تک حکومت رہے گی اور بیس سے زیادہ بادشاہ اس خاندان میں نہ ہوں گے!"

بھکشو کے لیے یہ ساری باتیں نہایت عجیب و غریب تھیں یہ لوگ اپنے علم کے ذریعے کہاں تک پہنچ چکے ہیں یہ احساس باعث رشک تھا۔

امیر علائی نے بیٹھے ہی بیٹھے ادب سے سلطان حسن بہمنی کو مبارک باد پیش کی اور اسے ماضی کی ایک اور بات یاد دلائی، اس نے کہا "شاید سلطان کو یہ بات یاد نہیں رہی کہ دکن کی یہ حکومت اس کو کس شخص نے عطا کی ہے سلطان اپنی زبوں حالی کے دنوں میں، جب ایک دن حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں پہنچا تھا تو اس خادم کو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے روٹی کا ایک ٹکڑا دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہم اسے دکن کی سلطنت بخش رہے ہیں، ہندو برہمن تو حکومت کی پیش گوئی کرتے ہیں اور مسلمان فقرا حکومت عطا کر دیتے ہیں۔"

اس یاد دہانی پر سلطان کی فرطِ عقیدت سے گردن جھک گئی حضرت محبوب الٰہیؒ کا وصال ہو چکا تھا سلطان نے ان کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے پانچ من سونا اور دس من چاندی غربا میں تقسیم کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔

یہ سب کچھ دنیا سے بیزار بھکشو کے سامنے ہو رہا تھا، اگر دنیا کی سچائی کو شاکیا منی نے پا لیا تھا تو پھر یہ کیا ہے کہ نظام الدین نامی ایک مسلمان فقیر نے سلطان علاء الدین بہمنی کو بہت پہلے ہی دکن کی حکومت بخش دی تھی، بودھ مذہب کی زبوں حالی اور کسمپرسی اور مسلمانوں کی حکومت، برتری اور اسلام کی پورے ہندوستان پر سایہ گستری، بھکشو نے سوچا کہ آخر دنیا اور زندگی کی بڑی سچائی کدھر ہے کس کے پاس ہے؟ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر ساری دنیا بھکشو ہو جائے تو اس دنیا کی شکل کتنی عجیب ہو جائے گی، ساری دلچسپیاں سارے ہنگامے ساری رونقیں ختم ہو جائیں گی، یہاں تک کہ بودھ بھکشوؤں کو کوئی بھیک دینے والا بھی نہ رہ جائے گا،

بھکشو کی فکر اور خیالات میں انقلاب آنے لگا، دنیا کے ہنگاموں اور رونقوں نے اس کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ شاید اس نے پہلی بار ذرا آزادی سے سوچا تھا، دوسرے مذاہب اور ان کے بانیان کے بارے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صداقت کسی ایک ہی مذہب یا بانئ مذہب کے پاس نہیں ہو سکتی یہ کہیں اور بھی ہو سکتی ہے، مسلمانوں کا نظام الدین جو دہلی میں رہتا تھا، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتا پھر معلوم نہیں کیوں اور کس طرح چندا کا خیال آ گیا اس کا زہد شکن شباب عالمِ تصوّر میں کچھ اس طرح دل و دماغ پر چھایا کہ باقی تمام خیالات و افکار نکل بھاگے، بھکشو نے سوچا، جب گوتم نے دنیا کے مصائب اور آلام سے نجات پانے کے لیے فاقوں کی ریاضت شروع کی تھی تو جلد ہی جسمانی کمزوری نے غالب آ کر شہزادے سدھارتھ کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جسم کا جو مطالبہ ہے اسے پورا کیے بغیر مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا، بھکشو نے سوچا کہ یہ چندا بھی تو ہماری جسمانی ضرورت ہے، مرد اور عورت کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ ان کے اعضا کا مخصوص اختلاف کیا ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، بھکشو نے یہ بھی سوچا کہ جس طرح کھانے سے منہ موڑ کر نروان حاصل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح عورت کو نظر انداز کر کے گیان دھیان کے لیے یکسوئی اور اطمینان بھی نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

فوراً ہی دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے سکونِ قلب کے لیے امیر علائی سے چندا کو مانگ لینا چاہیے، اسے یقین تھا کہ امیر علائی انکار نہ کرے گا۔ اسی لمحے ناگلا کا خیال آیا بس یہ خیال دردِ سر بن گیا۔ اس نے سوچا کہ جس طرح وہ خود سوچ رہا ہے اور فکر کے جس نتیجے پر پہنچا ہے کیا ضروری ہے کہ ناگلا بھی اس کی ہم خیال ہو جائے، وہ کچھ مایوس سا ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ناگلا سختی سے اس کے جدید خیالات اور افکار مسترد کر دے گی اور اسے کمیا سے نفرت ہو جائے گی، اس اُلجھن سے یوں پیچھا چھڑایا کہ سرِ دست ناگلا کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کسی مناسب وقت پر دلائل اور عملی اقدام سے سب کچھ بتا دیا جائے گا۔

بھکشو شکستہ دلی سے قدم اُٹھاتا ہوا جب امیر علائی کے کمرے میں داخل ہوا اسی وقت دوسری طرف سے ناگلا بھی آ گئی دونوں کی نظریں آپس

---

چنانچہ واقعی بہمنی خاندان میں تقریباً ایک سو ستر سال حکومت رہی اور بیس حکمران گزرے۔

اکتوبر ۱۹۷۲ء

میں ٹکرائیں، بھکشو کے پائے ثبات میں لرزش پیدا ہوگئی اور جی میں آیا کہ اسی وقت واپس ہو جائے۔ ناگلا اسے دیکھتی ہی رہ گئی، بھکشو نظریں ملاتے گھبرا رہا تھا، سرسری نظر سے ناگلا کو دیکھتا اور فوراً ہی آنکھیں جھکا لیتا۔

دونوں کی ناقابلِ بیان اور مشکوک کیفیات کو امیر علائی بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج اسے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ناگلا اور بھکشو کی بابت چندا نے جو کچھ کہا تھا اُس میں صداقت ہے۔

بھکشو امیر علائی کو نظر انداز کر کے ناگلا کی طرف بڑھا اور اسے حکم دیا "ناگلا! اِس وقت تم واپس جاؤ، مجھے امیر سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

ناگلا نے کوئی جواب نہ دیا اور اِس حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ امیر علائی کو رشک ہونے لگا۔

جب ناگلا واپس چلی گئی تو بھکشو نے امیر علائی کی طرف رُخ کیا، امیر سخت برہم تھا اسے اِس بھکشو سے شدید نفرت ہو گئی تھی، امیر نے اس سے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ بھکشو اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ امیر نے دلی نفرت کو چھپاتے ہوئے بھکشو کو مخاطب کیا۔ "جب تجربات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آدمی تجرد کی زندگی نہیں گزار سکتا اور عورت مرد کی لازمی اور بنیادی ضرورت ہے تو جسم پر اس کفنی کو لپیٹنے سے فائدہ، ہمیں ریاکاری سے سخت نفرت ہے!"

بھکشو نے امیر کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا، سر نیچے کیے بولا۔ "امیر! تم نے جو کچھ کہا درست ہے، اِس وقت میں تم سے کچھ خاص باتیں کرنے آیا ہوں!"

امیر نے کٹی ہوئی ٹانگ کی نوک کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "کہو کیا کہنا ہے؟"

بھکشو نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ سلطان کی رسمِ تاج پوشی کے موقع پر جس نظام الدین کا ذکر آیا تھا وہ کون ہے؟"

امیر نے مختصر لفظوں میں نظام الدین اولیاؒ کی بابت بتا دیا۔

بھکشو نے پوچھا۔ "کیا یہ بات بھی درست ہے کہ نظام الدین نے سلطان کو دکن کی حکومت بہت پہلے بخش دی تھی؟"

امیر نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "ہاں یہ بالکل سچ بات ہے کیونکہ اُس وقت ہم بھی اُس بارگاہ سے کچھ لینے گئے تھے لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے ہمیں نظر انداز کر کے علاء الدین حسن کو دکن کی سلطنت بخش دی تھی۔"

بھکشو کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے سے تجسس اور تذبذب کے آثار صاف ظاہر ہو رہے تھے، امیر علائی اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ سکوت کے بعد بھکشو نے کہا۔ "امیر! میں کچھ اُلجھنوں میں گھر گیا ہوں اگر ہو سکے تو تم ان کا کوئی علاج بتاؤ!"

امیر کوئی سوال کرنے کے بجائے صرف صورت دیکھتا رہا۔

بھکشو نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ "وٹوبا سے نکل کر میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میرے آبائی عقائد اور خیالات کو ملا کر رکھ دیا ہے اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ میں غلط راہ پر چل رہا ہوں آخر ایسے نروان کا حاصل کیا ہو سکتا ہے جو فطرت کے خلاف جنگ کر کے حاصل کیا جائے یہ تو ایک ایسا راستہ ہے جس پر سے کوئی گزر ہی نہیں سکتا جس شے کا نام گناہ ہے وہ سبھی سے ہوتے ہیں، ان سے کون بچ سکتا ہے؟ اور مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں توبہ اور پراشچت (کفارے) جیسی چیزیں بھی نہیں ہیں، جب گناہ اور زندگی لازم و ملزوم ہیں اور توبہ اور پرائشچت کوئی چیز نہیں تو گویا ہم سب اسی طرح بار بار جنم لیتے رہیں گے اور جنموں کا یہ چکر اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ دُنیا قائم ہے، پھر نروان کیا ہے اسے کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے؟" اور پھر بدقت تمام اٹک اٹک کر کہا۔ "یہ سب ڈھونگ ہے۔ ڈھونگ۔ لچر اور لایعنی عقائد ہیں اب میں مزید اِن عقائد پر نہیں قائم رہ سکتا۔"

امیر علائی اپنے اشتعال اور غصے پر قائم نہیں رہ سکا اسے بھکشو کی باتوں پر ہنسی آنے لگی، نِروان، نِروان، نِروان، اس لفظ کی بار بار تکرار نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بھکشو سے پوچھا۔ "یہ نِروان کیا ہوتی ہے؟"

بھکشو پژمردہ ہنسی ہنس دیا، بولا۔ "سکونِ ازلی اور جنموں کے چکر سے نجات کو ہم نِروان کہتے ہیں، شاکیا منی نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ نِروان حاصل کر کے آدمی بُدھ ہو جاتا ہے اور بُدھ ہو جانے پر پچھلی زندگیوں کے تسلسل اور اس کے اسبابِ علل کا پورا عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور یہ نِروان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک آدمی کرم (عمل) کے چار اصولوں کو عملاً نہ اپنا لے، نیک کام، نیک ارادے، نیک خیالات اور نیک گفتگو، اور نیکی کی یہ چاروں راہیں اتنی دشوار گزار، سنگلاخ یا خاردار ہیں کہ شاید ہی کوئی انسان انھیں طے کر سکے، اتنی مشکل راہیں اور توبہ اور کفارے کے سہارے مفقود، پھر کوئی کس طرح ان سے صحیح سلامت گزر سکتا ہے اور شاکیا منی یہ کہتا ہے کہ جب تک انسان اُن سے صحیح سلامت نہیں گزرے گا بار بار پیدا ہوتا رہے گا، بار بار جنم لیتا رہے گا!"

امیر علائی ہنسنے لگا۔ بھکشو کے خیالات اور عقائد کا گورکھ دھندا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بولا۔ "زندگی اور دُنیا اتنی پیچیدہ نہیں ہے جتنی تو نے بنا رکھی ہے زندگی ملی ہے تو اس کی نعمتوں اور لذتوں سے ہمیں لطف اندوز بھی ہونا چاہیے۔ ہمیں تو بس یہی سیدھا سادا فلسفہ آتا ہے!"

اب بھکشو نے وہ بات کہہ دی جس پر فوراً ہی امیر کو یقین نہ آیا

بھکشو نے کہا "امیر! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟" علائی چونک کر بے اختیار بولا۔

بھکشو نے نرمی سے کہا "میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں!"

امیر علائی لنگڑے پن کی وجہ سے خود تو چل نہ سکتا تھا۔ فوراً ہی مسہری پر گھوم کر تالی بجائی۔ ایک خواجہ سرا حاضر ہو گیا۔ امیر نے اسے حکم دیا "امیر صدر الشریف سمرقندی کو بلاؤ۔ یہ بھکشو مسلمان ہونا چاہتا ہے وہ اسے مسلمان کر لیں۔"

بھکشو نے منع کر دیا۔ بولا "میں اسی آستانے پر پہنچ کر اسلام قبول کروں گا جہاں تمہارے نئے سلطان حسن بہمنی کو دکن کی حکومت بخشی گئی تھی۔"

علائی نے افسوس سے کہا "افسوس کہ ہم دہلی نہیں جا سکتے وہاں ظالم محمد تغلق کی حکومت ہے ہم سب کو وہ باغی سمجھتا ہے۔ وہ ہمیں پاتے ہی فوراً قتل کرا دے گا!"

بھکشو نے کہا "تب پھر مجھے کسی کے ذریعے بھجوا دو!"

امیر علائی نے کہا "ہم نے زندگی میں بڑے بڑے گناہ کیے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں تمہیں مسلمان کرنے کا ثواب خود حاصل کریں۔ شاید اسی طرح گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے!"

بھکشو نے جواب دیا "اگر یہ بات ہے تو تم ایک معمولی لودھ زائر کا بھیس بدل کر دہلی چلو!"

امیر علائی سلطان محمد تغلق سے بہت خوفزدہ تھا۔ بولا "نہیں ہم دہلی نہیں جا سکتے!"

بھکشو نے مایوسی سے کہا "اور میں کسی عام مسلمان کے ہاتھ سے اسلام نہیں قبول کر سکتا!"

امیر علائی نے محسوس کیا کہ شاید وہ ایک بڑے ثواب سے محروم ہوا جا رہا ہے جس کا اسے دکھ ہو رہا تھا کچھ سوچ کر امیر نے کہا "بھکشو! اگر ہم تمہیں دہلی سے بھی بڑے آستانے پر لے چلیں تو؟"

بھکشو نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

علائی نے جواب دیا "اجمیر۔ یہاں ہندوستان کا سب سے بڑا روحانی بادشاہ آرام کر رہا ہے۔ نظام الدین سے بھی بڑا۔" اس کے بعد خواجہ معین الدین چشتی ؒ کی زندگی اور کرامتوں کی بابت بھکشو کو اتنا کچھ بتا دیا کہ وہ اجمیر جانے پر رضامند ہو گیا۔

بالآخر دونوں میں یہ طے پایا کہ وہ دونوں بھکشوؤں کے لباس میں اجمیر جائیں گے اور وہاں چشتی سجادہ نشین کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیں گے۔

امیر تغلقی اُمرا اور حکام سے بچنے کے لیے خود بھی لودھ بھکشو بن کر اجمیر میں داخل ہونا چاہتا تھا اور اسلام قبول کرنے کی فرضی رسم خود بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔



امیر علائی نے قصر واپس پہنچ کر اپنی عدم موجودگی کے وقفے کا ضروری انتظام کیا۔ اس نے اپنے اس نیک منصوبے کا کسی پر اظہار نہ کیا کیونکہ بھکشو نے اسے یہ یقین بھی دلایا تھا کہ ناگلا کو کچھ بتائے بغیر ساتھ لے جایا جائے اور اجمیر پہنچ کر اسے بھی مسلمان کر لیا جائے اور وہیں امیر کے ساتھ اس کی رسم نکاح ادا کی جائے۔ امیر کو ان باتوں سے بڑی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔ اس کے ذریعے دو بھکشوؤں کا اسلام قبول کرنا یقیناً اتنے بڑے ثواب کا حامل ہو گا کہ اس کے سارے گناہ دُھل جائیں گے۔

امیر نے خلوص سے اسے پیشکش کی۔ کہا "کیا! کیا یہ درست ہے کہ تمہیں چندا اچھی لگتی ہے؟"

بھکشو کچھ گھبرا گیا۔ بولا "ہاں لیکن میں امیر کی حرم کا احترام کرتا ہوں!"

امیر نے کہا "جب تم مسلمان ہو جاؤ گے تو ہم تمہیں چندا کو بخش دیں گے!"

بھکشو نے آہستہ سے کہا "امیر کی مہربانی۔ میں امیر کا یوں ہی بہت زیادہ احسان مند ہوں۔"

اس کے بعد نہایت حکمت سے چندا کو بھکشو کے حجرے میں بھیج دیا گیا۔ بھکشو اسے دیکھتے ہی احترام سے کھڑا ہو گیا۔ اب بھکشو کے چہرے پر کچھ رونق آ گئی تھی۔

بھکشو نے شائستگی سے کہا "چندا! بیٹھو!"

چندا نے پوچھا "کیا تم لوگ کہیں جانے والے ہو؟"

"ہاں!" بھکشو نے کہا "جانے سے پہلے میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں!"

"کس بات کی معافی؟" چندا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"میں نے کئی بار تمہاری دل آزاری کی ہے!" وہ کہنے لگا "یہ احساس بار بار دل کو ستاتا رہتا ہے۔"

چندا سمجھی بھکشو اسے چھیڑ رہا ہے۔ بھڑک کر بولی "تم ضرور پاگل ہو گئے ہو۔ کیسی دل آزاری؟ یہ تم کہہ کیا رہے ہو؟"

بھکشو کے چہرے پر پہلی بار محبت کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بولا "چندا! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

چندا تو دنگ رہ گئی۔ اس جسارت پر ایسا لگا جیسے بھکشو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ سرزنش کرتی ہوئی بولی "تم اپنے ہوش میں تو ہو، کہیں بھنگ تو نہیں پی گئے؟"

بھکشو نے کہا "چندا! میں بالکل اپنے ہوش میں ہوں۔ میں نے کوئی بھنگ وَنگ نہیں پی رکھی ہے۔ امیر نے مجھے خود ہی یہ پیش کش کر دی ہے کہ اگر مجھے تم واقعی اچھی لگتی ہو تو وہ تمھیں میرے حوالے کر دیں گے!"

چندا سمجھی کہ اس میں ضرور امیر کی کوئی سازش چھپی ہے۔ شاید اس طرح وہ چندا کے عائد کردہ الزامات کی تائید خود بھکشو کی زبان سے کرا چکا ہے اور اس اعتراف اور تائید کے بعد بھکشو کا جو حشر ہو سکتا تھا اس کے تصور ہی سے وہ کانپ گئی۔ بولی "ناگلا کا کیا بنے گا؟"

بھکشو کچھ اُداس ہو گیا۔ بولا "اُس کی تم فکر نہ کرو، وہ میرا معاملہ ہے۔ میں اور ناگلا جانیں؟"

چندا نے اسے ڈانٹ پلائی، بولی "تم بڑے چھپے رستم نکلے۔ کہاں تو دُنیا اور عورت سے اتنے بیزار تھے کہ ان سے بھاگے بھاگے پھرتے تھے اور خود کو کفنی میں چھپا رکھا تھا اور کہاں اب یہ ارادے ہیں کہ ایک ہی وقت میں دو دو عورتوں سے بیاہ رچانے پر آمادہ!" پھر واپس جاتی ہوئی بولی "تمھارا یہ خیالِ خام ہے کہ امیر مجھے تم کو بخش دیں گے۔ اگر تم نے ایسا کرنا بھی چاہا تو ان حالات میں میں خود انکار کر دوں گی۔ بھلا تم جیسے مُردوں کی شکل والے انسان کو کون عورت پسند کرے گی!" حجرے سے باہر نکل کر آہستہ سے کہا "وہ جذبہ اور وہ وقت ہی کچھ اور تھا جب میں نے تم سے کچھ چاہا تھا، وقت گیا، بات گئی۔"



ضروری سامانِ سفر لے کر تینوں اجمیر روانہ ہو گئے۔ امیر عُلائی، کمپا اور ناگلا۔ ناگلا کو سرِدست اتنا ہی معلوم تھا کہ اس کا یہ سفر مہاتما بدھ کی زیارت گاہوں پر حاضری دینے کی غرض سے کیا جا رہا تھا۔ جب راستے میں امیر علائی نے اپنا لباس اُتار کر بھکشوؤں کی کفنی جسم پر لپیٹ لی تو ناگلا کو یہ شبہ گزرا کہ شاید امیر عُلائی بودھ دھرم اختیار کرنے والا ہے۔ اس خیال سے اسے بہت خوشی ہوئی۔

بھکشو نے امیر علائی سے یہ درخواست کی تھی کہ ناگلا کو مغالطے میں رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجمیر تک پہنچتے پہنچتے اُسے بدھ زیارت گاہوں میں پھرا دیا جائے۔ اس طرح دل سے پتھروں اور بے جان مورتیوں کی محبت اور احترام کو بآسانی نکالا جا سکے گا۔ انھوں نے دولت آباد پہنچ کر مشعلوں کی روشنی میں ایلورا کے غاروں کی عبادت گاہیں اور مورتیاں دیکھیں پھر اجنتا کا رُخ کیا۔ پہاڑ کے دامن میں بہت بلندی پر اجنتا پہنچنے کے لیے انھیں بہت سے پتھروں کو پھلانگنا پڑا۔ جب تینوں وہاں پہنچ گئے تو امیر عُلائی نے بھکشو سے پوچھا "بھلا ان دشوار گزار حصوں میں یہ عبادت گاہیں کیوں بنائی گئیں جہاں تک تو عام انسانوں کا پہنچنا ہی دشوار ہے!"

بھکشو مسکرایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بولا "بودھ گیانیوں نے اسی لیے دشوار گزار مقام کو اپنے گیان دھیان کے لیے منتخب کیا تھا کہ یہ جگہ شور و شغب اور ہنگاموں کی دُنیا سے بہت دُور ہے اور یہاں وہ لوگ نہایت سکون اور اطمینان سے عبادت کر سکتے تھے۔"

پہاڑ کے نیچے سے نالے کے زور و شور سے بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک سو پچاس سال قبل مسیح اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی صدیوں پر پھیلا ہوا انسانی دیوزادوں کا یہ کام زائرین کے دلوں پر ہیبت بٹھائے بغیر نہ رہتا تھا۔ تینوں دیر تک غار کے مندروں اور خانقاہوں میں گھومتے رہے۔ مندروں سے ملی ہوئی خانقاہیں چھوٹے چھوٹے حجروں کی شکل میں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ان حجروں میں بستر کی جگہ ایک ایک پتھر رکھا ہوا تھا۔ دالانوں کے خاتمے پر جن کے گرد یہ خانقاہیں اور حجرے بنے ہوئے تھے، شاکیا منی کی ایک بڑی مورت ضرور موجود تھی۔ آخر میں گوتم بدھ کی ایک بڑی مورت ملی۔ اس مورت کے آس پاس بدھ کے پرستاروں اوتاروں کی مورتیں تھیں۔ یہاں کے ستونوں اور چھتوں کو رنگین تصویروں اور آرائشوں سے لیس دیا گیا تھا۔

ناگلا پر جذباتی دباؤ سے رقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کمپا بھکشو بھی کچھ کم متاثر نہ تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور دونوں گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بیساکھیوں کے سہارے چلنے والا امیر عُلائی غار کے ان مندروں کی محنت اور ذہانت سے ضرور متاثر ہوا تھا۔ لیکن اس عزلت گاہ کا تقدس اُسے ذرا بھی متاثر نہ کر سکا۔ اسے تو یہاں وحشت سی ہو رہی تھی کیونکہ وہ جس مذہب کا پیرو تھا اس میں عدم تشدد اور تشدد، ترکِ دُنیا اور دنیا داری، عفو اور انتقام ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

بے شمار مورتیوں کے بیچوں بیچ میں شاکیا منی چہرے پر نروان کی طمانیت لیے بیٹھا ہوا تھا۔ ناگلا اس کے قدموں میں گر گئی۔ بھکشو کمپا نے بھی اس کی پیروی کی اور مہاتما بدھ کے قدموں میں جھک گیا۔ امیر عُلائی نے آس پاس دیکھا دوسرے بہت سے زائر بھکشو بھی اسی طرح جھکے ہوئے تھے۔ خود عُلائی ان کے دکھاوے کے لیے بھی نہ جھک سکا۔

ناگلا اور کمپا بھکشو دیر تک سر بسجود پڑے رہے۔ علائی حیران تھا کہ یہ بھکشو تو اسلام قبول کرنے والا ہے پھر یہ کیوں رو رہا ہے، یہ بدھ کو سجدہ کیوں کر رہا ہے؟

جب یہ لوگ وہاں سے نکل کر باہر آئے تو امیر عُلائی نے سرگوشی میں

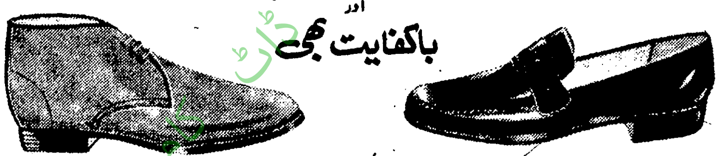
# سروس شوز

## آپ کے روپے کا صحیح مصرف



دیدہ زیب - آرامدہ - پائیدار

اور




سروس شوز - اعلیٰ کوالٹی کا لیدر - پائیدار سول - معیاری ساخت - ہر پاؤں کے لیے موزوں فٹنگ - آرام دہ -

سروس شوز - جدید ترین ڈیزائن - خوبصورت اور دلکش - فیشن کے نئے انداز - ہر پاؤں کے لیے آسودگی -

سروس شوز - بچے - نوجوان - بزرگ - ہر عمر - ہر شخصیت کی موزوں پسند - معیاری طرز - مناسب دام -

سروس شوز - بین الاقوامی شہرت یافتہ - پاکستان میں بھی مقبول ترین - آپ کے روپے کا صحیح مصرف




معیاری جوتے بین الاقوامی شہرت یافتہ

ORIENT

بھکشو سے پوچھا "جب تم اسلام قبول کرنے کا عہد کر چکے ہو تب پھر تم نے گوتم کی مورتی کو سجدہ کیوں کیا' کیونکہ اسلام میں کسی غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔"

بھکشو نے جواب دیا "ابھی میں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے ارادہ کیا ہے اور میرے اس ارادے کی خبر تمھارے سوا کسی کو بھی نہیں' ناگلا اور دوسرے بہت سے بھکشوؤں کی نظر میں وہاں میں بودھ ہی تھا اور وہاں مجھے وہی کچھ کرنا تھا جو دوسرے بودھ اور بھکشو کر رہے تھے۔"

علائی اس جواب سے مطمئن ہو گیا بھکشو کے چہرے پر کرب اور اذیت چھائی ہوئی تھی' علائی کو خیال گزرا کہ اپنے آبائی دین کو چھوڑتے ہوئے بھکشو کو شدید ذہنی کرب اور اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے'

تینوں گجرات کی راہ سے راجپوتانہ میں داخل ہوئے اور کتنی دن صعوبتیں اور مصیبتیں جھیل کر اجمیر پہنچ گئے۔ انھوں نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے سرائے میں قیام کیا اور لوگوں نے بھی انھیں بودھ بھکشو سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اجمیر میں بھکشو کمپا کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ کسی طبیب یا وید کو دکھانے کے لیے آبادی میں چلا گیا اور کافی دیر بعد دوائیں لے کر واپس آ گیا۔

حضرت خواجہ کے مزار پر حاضری دینے سے پہلے بھکشو نے ناگلا کے سامنے منصوبے کا اعلان کر دیا' سامنے امیر علائی اس مسرت سے ہمکنار بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ ہی وقت جاتا ہے جب دو بودھ اسلام قبول کر کے اس کے ماضی کے گناہوں کو دھو ڈالیں گے۔

ناگلا' کمپا کی تجویز پر اچھل پڑی اور سختی سے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بودھ بھکشو دیر تک اپنے دھرم کی برائیاں اس کے سامنے بیان کرتا رہا اور اسلام کی خوبیاں گنتا رہا لیکن ناگلا پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

بھکشو اسے سمجھانے کے لیے ایک طرف لے جاتا ہوا امیر علائی سے بولا "امیر! تم فکر نہ کرو' میں اسے الگ لے جا کر سمجھانے کی کوشش کروں گا!"

امیر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر ناگلا نے اسلام قبول نہ کیا تو اسے کئی نقصان اٹھانا پڑیں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ آدھے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ناگلا اس سے جدا ہو جائے گی' کیونکہ اجمیر میں وہ بالکل مجبور اور بے دست و پا تھا۔ اس نے بھکشو سے عاجزانہ کہا "کمپا! تم کسی بھی طرح اسے آمادہ کر لو' یہ مشکل کام تم ہی انجام دے سکتے ہو!"

بھکشو نے امیر کو تسلی دی' بولا "امیر! تم زیادہ فکر نہ کرو' مجھے یقین ہے کہ اس نادان اور ناسمجھ لڑکی کو میں ضرور راضی کر لوں گا!"

بھکشو ناگلا کو لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ دیر بعد جب واپس آیا تو دونوں ہی چپ چپ تھے' بھکشو نے امیر سے نظریں چراتے ہوئے آہستہ اور بے دلی سے کہا "کچھ راہ راست پر آ گئی ہے ایک دو دن میں کچھ اور آ جائے گی' ہمیں ذرا صبر سے کام لینا پڑے گا!"

امیر علائی نے خوش ہو کر کہا "ایک دو دن کیا' ہم ہفتہ عشرہ صبر کر سکتے ہیں' جس کام کی تم نے ذمہ داری قبول کی ہے' اسے پورا کرنا ہی پڑے گا تمھیں!"

بھکشو نے تائید میں گردن ہلا دی' آہستہ سے کہا "مجھے اپنے عہد اور ارادے کا پورا پورا خیال ہے اور میں جب تک کامیاب نہ ہوں گا کھانا پینا اور سونا جاگنا مجھ پر حرام ہے!"

رات کے پچھلے پہر امیر علائی نے محسوس کیا کہ بھکشو بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہے اور ناگلا سو رہی ہے'

امیر نے آہستہ سے آواز دی "کمپا! کیا جاگ رہے ہو؟"

"ہاں!" بھکشو نے جواب دیا "میں بہت پریشان ہوں' دعا کرو کہ میں اپنے عہد میں کامیاب ہو جاؤں۔"

امیر نے تسلی دی "زیادہ فکر نہ کرو' کوشش جاری رکھو' خدا تمھیں مایوس نہ کرے گا۔"

صبح امیر کی آنکھ دیر سے کھلی' جب جاگا تو دونوں لاپتہ تھے' امیر پریشان ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بھکشو اندر داخل ہوا' وہ بھی بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ غم سے ستا ہوا تھا۔

امیر نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے کمپا' تم پریشان کیوں ہو' ناگلا کہاں ہے؟"

بھکشو نے غمزدہ آواز میں جواب دیا "امیر! یہی سوال مجھے دو ساعتوں سے پریشان کر رہا ہے' جب میں سو کر اٹھا تو ناگلا غائب تھی' میں نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا' سرائے کے ایک آدمی نے یہ بتایا کہ اس نے اس بھکشو عورت کو پچھمی سڑک پر جاتے دیکھا ہے!"

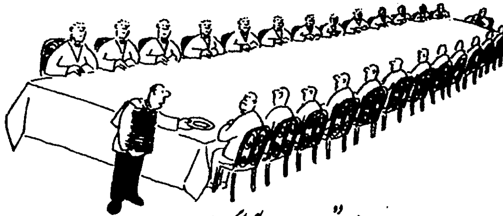
امیر نے بے چینی سے پوچھا "پیدل' تنہا یا کسی کے ساتھ؟"

"گھوڑے پر!" بھکشو نے جواب دیا "لیکن تنہا۔ وہ شاید مسلمان ہونے کو تیار نہیں ہے اسی لیے چوری سے فرار ہو گئی ہے!"

لنگڑے امیر نے اٹھنے کی کوشش کی "ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ بھکشو سفر کی تیاری کرو' ہم لوگ تھکنا یا حالات اور مشکلات کے آگے ہتھیار ڈالنا نہیں جانتے ہم اس کا پیچھا کریں گے!"

جلدی جلدی پانی کی چند چھاگلیں اور کھانے کا سامان لے کر

سب رنگ



بیرا: "یہ پلیٹ آگے بڑھاتے جایئے۔"

دونوں گھوڑوں کے پاس پہنچ گئے۔

بھکشو نے اپنی دواؤں کی پوٹلی بھی ساتھ لے لی۔ بھکشو کی مدد سے امیر گھوڑے پر سوار ہوا دوسرے گھوڑے پر بھکشو بیٹھ گیا اور پھر دونوں گھوڑوں کو تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے شمال مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی جگہ مسافروں نے بھکشو عورت کے جانے کی سمت کی نشاندہی کی۔ انھوں نے ایک بھکشو عورت کو تنہا اراولی پہاڑیوں کے سلسلے کو عبور کرتے دیکھا تھا۔

دونوں اس کے تعاقب میں سلسلۂ اراولی کو عبور کرکے دریائے لیونی (سانبھر جھیل) کے اس کنارے تک پہنچ گئے جہاں وہ جنوب مغرب سے آکر راجستھان کے صحرا میں غائب ہو گیا تھا۔

لیونی کے کنارے امیر نے اپنا گھوڑا روک لیا اور بھکشو سے کہنے لگا: "اب کدھر جائیں؟ آگے صحرا ہے!" امیر کی نظریں لق و دق میلوں میں پھیلے ہوئے صحرا پر جمی ہوئی تھیں۔

بھکشو نے ریت میں گھوڑے کے سموں کے نشانات دیکھ لیے۔ ان کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا: "ناگلا آگے گئی ہے۔ وہ رہے اس کے گھوڑے کے سموں کے نشانات۔ ہم اس کا پیچھا کریں گے!"

امیر نے لگام کو چند جھٹکے دے کر ایڑ لگا دی۔

ان دونوں کے سامنے حد نظر تک تھر کا ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد ان کے گھوڑے تھک گئے اور ان کی رفتار میں کمی پیدا ہو گئی۔ نشانات ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کے آس پاس اور سامنے چالیس چالیس پچاس پچاس فٹ بلند ریت کے تودے کھڑے ہوئے تھے۔

بھکشو نے امیر علائی کے چہرے پر سستی اور شکست کے آثار دیکھے تو کہنے لگا: "امیر! میں ناگلا کو پکڑے بغیر واپس نہیں جا سکتا۔ اگر تمھاری ہمت جواب دے رہی ہے تو تم واپس جا سکتے ہو۔"

امیر کو شرم آئی۔ بولا: "ہمارا تو کام ہی جہاد و جدل ہے۔ ہم صحرا سے نہیں گھبراتے، آگے بڑھو!"

ریت کے گرم گرم ذرات جسم کے عریاں حصوں کو جھلسائے دے رہے تھے۔

ایک جگہ انھیں کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پیاس سے زبانیں نکالے اور تکان سے نڈھال گھوڑوں کا رخ ادھر کر دیا۔ اب گھوڑوں کی رفتار بالکل ختم ہو چکی تھی اور وہ ہر ہر قدم پر لڑکھڑا رہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹانگیں بار بار ریت میں دھنس جاتی تھیں۔ کچھ دور چل کر ایک تودے کے پیچھے انھیں ناگلا کا خالی گھوڑا مل گیا۔ گھوڑا پیاس سے نڈھال زبان نکالے ہانپ رہا تھا اور نتھنے میں بار بار پیر ٹپک رہا تھا۔ دونوں گھوڑے کے قریب پہنچ گئے اور ناگلا کو ادھر ادھر نظروں سے تلاش کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ناگلا کی آواز بھی سنائی دی، نڈھال اور ناتواں آواز: "کمپا! ادھر آؤ، میں یہاں ہوں!"

دونوں آواز کی طرف بڑھے۔ ناگلا ایک تودے کے ڈھلان پر نیم جان پڑی ہانپ رہی تھی۔

بھکشو اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا۔

امیر نے کہا: "کمپا! جلدی واپس چلنے کی کوشش کرو۔ اس صحرا میں زیادہ دیر رکنا خطرناک ہے!"

بھکشو نے لاپروائی سے کہا: "امیر! پانی وانی پی کر ذرا دیر میں چلتے ہیں۔ گھوڑے سے اتر کر ذرا تم بھی اس ضدی لڑکی کو سمجھاؤ کہ یہ ہمارے ساتھ واپس چلے۔"

اس کے بعد وہ ایک چھاگل لے کر ناگلا کے گھوڑے کی طرف چل دیا۔ کہنے لگا: "ناگلا کے گھوڑے کو تھوڑا سا پانی پلا دوں۔ اس کے بغیر وہ چلے گا کیسے؟"

امیر نے اپنا گھوڑا ناگلا کے قریب کھڑا کر کے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ ریت میں بھس سے دھنس گیا۔ اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کی نوک ناگلا کی ران میں چبھ گئی۔ گرم جلتی تپتی ریت نے امیر کو بوکھلا دیا۔ اس نے جلدی جلدی ناگلا سے کہا: "ناگلا! یہاں سے جلد واپس چلو تم پر کوئی کسی قسم کا بھی جبر نہ کرے گا۔ تمہیں اپنے ذاتی معاملات اور عقائد میں پوری آزادی حاصل ہوگی۔"

ناگلا نے اُونگھتے ہوئے کہا: "اب میں واپس نہیں جاؤں گی!"

ذرا دیر بعد بھکشو بھی گھوڑے کو پانی پلا کر واپس آ گیا اور اس نے بقیہ چھاگلوں کا پانی اپنے گھوڑوں کو پلا دیا۔ امیر نے پریشان ہو کر کہا: "کمپا! کچھ پانی اپنے پینے کے لیے بھی تو رکھ لو۔"

کوئی جواب دیئے بغیر بھکشو دونوں گھوڑوں کو پانی پلاتا رہا۔

اتنے میں کسی بھاری چیز کے ریت پر گرنے کی آواز سنائی دی، ناگلا کا گھوڑا ریت پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

امیر کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی، گھبرا کر پوچھا: "اسے کیا ہو گیا؟"

بھکشو نے اطمینان سے جواب دیا: "دیر تک پیاسے رہ کر پانی پیا ہے اسی کے اثر سے گر گیا ہے۔"

امیر نے پھر کہا: "ہمیں بھی پیاس لگ رہی ہے!"

بھکشو نے ایک چھاگل امیر کی طرف بڑھا دی۔ امیر غٹاغٹ ڈھیر سارا پانی پی گیا۔ اس کے بعد بولا: "کمپا! اب کسی طرح جلدی سے ناگلا کو ہمارے گھوڑے پر سوار کرا دو اور اس کے پیچھے ہمیں بٹھا کر خود بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ اب یہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہے!"

لیکن اسی لمحے یکے بعد دیگرے دونوں گھوڑے ریت پر گر گئے۔

فرطِ مایوسی میں امیر کے منہ سے چیخ نکل گئی، بولا: "یہ سب کیا ہو رہا ہے بھکشو، ہمارے گھوڑے بھی گر گئے۔ اب کیا ہو گا؟"

بھکشو نے دم توڑتی ناگلا کا سر اپنی ران پر رکھ لیا۔ حالات کے تشدد، مصیبتوں کی انتہا اور زندگی سے مایوسی نے جذبۂ رقابت کو بھی فنا کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک بار وہ پھر چلایا: "کمپا! اب کیا ہو گا؟"

بھکشو نے اطمینان سے جواب دیا: "اب ہم لوگ یہیں رہیں گے، ناگلا کے ساتھ ہم دونوں بھی یہیں رہیں گے!"

امیر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ بھکشو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بھکشو نے اسے زیادہ پریشان نہیں کیا، کہنے لگا۔

"امیر! اب چونکہ ہم تینوں یہاں سے واپس نہیں جا سکتے اور یکے بعد دیگرے مر جائیں گے اس لیے مرنے سے پہلے کچھ ضروری باتیں تیرے علم میں آ جائیں تو مناسب رہے گا۔ اس کے بعد جب تو سسک سسک کر مرے گا تو میرے جذبۂ انتقام کو سکون ملے گا، میری آتما شانت ہو گی۔"

امیر نے کفنی کے اندر سے خنجر نکالا کیونکہ خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

بھکشو نے ہنستے ہوئے کہا: "خنجر کی کوئی ضرورت نہیں ہم اس کے بغیر بھی مر سکتے ہیں، خنجر کے بغیر بھی مر جائیں گے، پہلے میری کچھ باتیں سن لو، کیونکہ ان کا تمہارے علم میں آنا بہت ضروری ہے!"

امیر بےبسی سے بھکشو کی صورت دیکھنے لگا۔ بولا: "کہو، کیا کہنا چاہتے ہو"

بھکشو نے ناگلا کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "ناگلا میری بہن ہے حقیقی بہن ۔۔۔ اور وہ بوڑھا جسے تو نے اپنے رتھ تلے کچل کر ہلاک کر دیا تھا ہم دونوں کا باپ تھا۔"

امیر کا جسم سنسنانے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔

بھکشو کچھ رک رک کر کہنے لگا: "جب تو نے ناگلا کو اغوا اور میرے باپ کو ہلاک کیا تھا میں وٹوبا کے مندر میں تھا۔ جب مجھے تیرے ظلم کی خبر ملی تھی میں نے اسی وقت یہ عہد کر لیا تھا کہ میں تجھ سے کوئی سخت انتقام لوں گا پھر جب تو خود اپنی ضرورت سے وٹوبا پہنچا تو مجھے تیری قربت کا ایک بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔"

بھکشو پیاس سے نڈھال ہو رہا تھا لیکن اس نے پانی نہیں پیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی بات جاری رکھی۔

"شاکیا منی نے ہمیں عدم تشدد کا درس دیا ہے لیکن میں تجھے تشدد سے مارنا چاہتا تھا صرف اس لیے کہ اس طرح میں تجھ سے تیرے ظلم کا انتقام لینے کے ساتھ ساتھ بہت سے انسانوں کو تیرے ظلم سے نجات دلا دوں گا۔"

امیر نے مردہ سی آواز میں سوال کیا: "اور وہ تیرا اسلام قبول کرنے کا عہد! وہ کیا تھا؟"

بھکشو نے کہا: "ہاں اب اس کی حقیقت بھی سن لے، تیرے پیچھے تیرے حرم کی چندا نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجھے گناہگار کرنا چاہا لیکن میں ڈر کر قصر سے فرار ہو گیا اور مدتوں ہمالیہ کی پہاڑیوں میں گیان دھیان میں مشغول رہ کر شاکیا منی سے استمداد طلب کرتا رہا۔ وہاں مجھے، شاکیا منی نے ظاہر ہو کر یہ ہدایت کی کہ میں قصر میں واپس جاؤں اور جنسی

ترغیبات کے آتشی سمندر سے گزر کر ضبطِ نفس کا امتحان دے چکا ہوں میں نے یہ بھی کیا پھر جب میں نے گلبرگہ میں نظام الدین کی کرامت کا ذکر سنا اور وہاں کے دنیاوی شان و شکوہ اور رنگ رلیوں نے مجھے مغلوب کر لیا تو میں سچ مچ اس پر آمادہ ہو گیا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں لیکن ایلورہ، اجنٹا کی زیارت گاہوں نے دل پر کچھ اور ہی اثر کیا یہاں تک کہ جب میں شاکیامنی کی اس مورتی کے سامنے جھکا جس کے چہرے سے نروانی کیفیت عیاں تھی میں نے آنکھیں بند کیے ہوئے شاکیامنی کو اپنے روبرو کھڑا دیکھا۔ گوتم مجھے اسلام قبول کرنے سے منع کر رہا تھا وہ بہت دکھی تھا، شاکیامنی نے مجھے یہ بات بھی بتائی کہ پہلے جس شاکیامنی نے مجھے تصور واپس جانے کی ہدایت کی تھی وہ مارا (شیطان) تھا، مارا مجھے گمراہ کرنا چاہتا تھا اور پھر اسی مارا نے گلبرگہ میں جشن تاج پوشی کے موقع پر مجھے پوری طرح مغلوب کر لیا۔ شاکیامنی کے نزول اور آزردگی پر میں مسلمان ہونے سے باز آ گیا اور اس کے بعد میں نے یہ عہد کر لیا کہ تم جو میرے لیے مارا سے کسی طرح کم نہیں میرے ہاتھوں ہلاک کیے جاؤ گے، میں نے اپنے منصوبے سے ناگلا کو بھی مطلع کر دیا تھا اور یہ جو کچھ ہوا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے!"

امیر کا سب کچھ چھن چکا تھا گھر وطن، ملنے والا ثواب اور ناگلا، ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد زندگی کے آخری لمحات میں اسلام کی محبت اور محبت ہی کو ثواب کی حصولیابی کا ذریعہ بنایا کہنے لگا "او ذلیل بھکشو! موت برحق ہے مسلمان موت سے نہیں ڈرتے لیکن چند باتیں ہماری بھی سن لے جس شاکیامنی کے ہیولے نے تجھے نفس کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی تھی وہ مارا نہیں حقیقتاً شاکیامنی ہی تھا لیکن جس شاکیامنی نے اجنٹا کے غار میں تجھے دینِ اسلام کو قبول کرنے سے منع کیا وہ شاکیامنی کے روپ میں شیطان رہا ہوگا، کیونکہ شیطان ہمیشہ انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا رہتا ہے!"

بھکشو زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا "تو آزاد ہے جو جی میں آئے سوچ" پھر ریت پر پڑے ہوئے گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "انھیں میں نے زہر ملا پانی پلا کر ہلاک کر دیا ہے تاکہ تو کسی طرح بھی یہاں سے واپس نہ جا سکے، ناگلا دم توڑ رہی ہے تھوڑی دیر بعد یہ بھی مر جائے گی" قریب رکھی ہوئی چھاگل کو منہ سے لگا کر بھکشو بھی پانی پینے لگا، پانی پی چکنے کے بعد کلائی سے منہ پونچھتا ہوا بولا "میری چھاگل کے سوا سب میں زہر ملا دیا گیا تھا اور اس پانی میں بھی جسے میں نے پی لیا ہے، ناگلا کے ساتھ میں بھی جا رہا ہوں، ہم دونوں ایک بار پھر جنم لیں گے، ہمیں اس تشدد اور پاپ کی وجہ سے ایک بار پھر اس دنیا میں آنا پڑے گا کوئی پروا نہیں، تھوڑی دیر بعد ہمارے پیچھے تو بھی مر جائے گا، اے کاش تو اپنے اگلے جنم میں کسی بودھ گھرانے میں پیدا ہو تاکہ پاپ اور ظلم سے بچا رہے!"

ناگلا نے ایک ہلکے سے جھٹکے سے گردن ڈال دی سر ایک طرف ڈھلک گیا، بھکشو نے جھک کر اس کے سر کو بوسہ دیا۔ پھر ادھ کھلی حسرتناک آنکھوں کو چومنے لگا، چند آنسو ٹپک کر ناگلا کے رخساروں پر ڈھلک گئے ایسا لگتا تھا جیسے خود ناگلا رو رہی ہو۔

بھکشو نے ناگلا کا سر ہٹا کر خود کو آزاد کیا اور دونوں ہاتھوں سے جلتی تپتی ریت کو ایک طرف ہٹانا شروع کر دیا۔

امیر علائی گھسٹتا ہوا بھکشو کے سر پر پہنچ گیا اور پوری قوت سے اپنا خنجر اس کے پہلو میں اتار دیا۔ صحرا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور بھکشو کے جسم سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا، وہ اوندھے منہ ریت پر گر گیا، دونوں ہاتھ اس طرح کانوں کے آس پاس ریت پر ٹک گئے جیسے بھکشو سجدہ کر رہا ہو۔

حواس باختہ جنون کا شکار امیر بھکشو کی کیفیت سے بہت خوش ہوا، معلوم نہیں کس نے اس کے کان میں یہ بات کہہ دی کہ "بھکشو مسلمان ہو چکا ہے اور وہ منہ کے بل ریت پر پڑا ہوا رب کعبہ کو سجدہ کر رہا ہے"۔

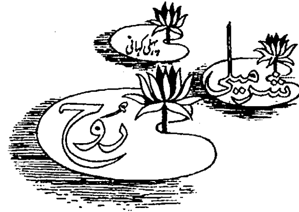
امیر پاگلوں کی طرح خوش ہو کر ہنسا اور چیخنے لگا "خدایا! ہم نے اس بھکشو کو اسلام کی حمایت میں قتل کیا ہے اور اگر اب اس نے دل میں اسلام قبول کر لیا ہے تو اس کارِ خیر کے ثواب کا یہ بندۂ عاجز پورا پورا مستحق ہے، اسے محروم نہ کیجیو!"

اس کے بعد امیر گھسٹتا ہوا مردہ گھوڑوں کے پاس پہنچا اور ان کی آڑ میں خود کو چھپانے کی کوشش کی، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا موت کے خوف، صحرا کے ہول اور پیاس کی شدت نے اسے سخت نزع کی کیفیت میں مبتلا رکھا، پھر غنودگی طاری ہوئی، نیند غلبہ کرنے لگی، اس نے آخری بار جب آنکھ کھولی تو رات ہو چکی تھی، گرگٹ اور دوسرے صحرائی کیڑے آزادی سے اس کے آس پاس جمع گردن اٹھائے دیکھ رہے تھے، پھر کوئی گرگٹ اس کے پیروں سے ٹکرایا، امیر کو نیم مدہوشی میں ایسا لگا جیسے صحرائی سانپ نے اسے ڈس لیا ہو، پھر آہستہ آہستہ زہر چڑھتا ہوا محسوس ہوا اور پھر اس زہر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

ایک بڑے فلمی اداکار کی شادی کا اعلان

جنہوں نے اردو میں شاہکار کہانیاں لکھی ہیں،
انہی کرشن چندر کی ایک دلچسپ کہانی

اس شمارے کیلئے شعور انوار کا انتخاب




**پریم کمار** نے پریم تو بہت سے کیے تھے لیکن شادی کسی سے نہیں کی تھی۔ ہر بار جب اُس نے کسی لڑکی سے پریم کیا سچا پریم سمجھ کر ہی کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اپنی چالیس برس کی زندگی میں اُس نے اتنی بار سچا پریم کیا تھا کہ وہ ان کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ یہ سچا پریم ہر بار جھوٹا پریم ثابت ہوا۔ اس میں غلطی نہ پریم کمار کی تھی نہ لڑکی کی۔ مگر ہر بار پریم کمار کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے جسم تو ملے لیکن رُوح سدا پیاسی رہی۔ کچھ ایسا لگا جیسے رُوح سے رُوح نہیں ملی، آتما آتما کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ کوئی اُس بھلے مانس سے پوچھے کہ جب رُوح سے رُوح نہیں ملی تو جسم سے جسم ملانے کا کیا حق تھا؟ لیکن پریم کمار ایک کامیاب ہیرو تھا ہر سال لاکھوں روپے کماتا تھا اور کروڑوں لوگوں کے دلوں کا دیوتا تھا۔ ایسے دیوتا سے کون پوچھے کہ اے مسٹر پریم کمار! تم جو ہر سال دس لڑکیوں سے پریم کرتے ہو اور ہر موسم کے بدلنے پر اپنی لڑکی بدل دیتے ہو اور لڑکی کا دل توڑ دیتے ہو جیسے عمدہ ڈنر کھانے کے بعد لکڑی کا خلال توڑ دیا جاتا ہے تو صاحب

یہ تمہاری محبت ہے کہ ہوس؟ مگر دیوتاؤں سے اور نیتاؤں سے اور دھن والوں سے ایسی باتیں کون پوچھ سکتا ہے۔

اس لیے چالیس سال تک پریم کمار سچا عشق کرتا رہا اور لڑکیاں بدلتا رہا اور کامیابی کے زینے پر چڑھتا رہا اور فلموں میں کام کرتا رہا۔ سچا عشق کرتا رہا اور عشق کرتے کرتے چالیس برس کا ہوگیا لیکن کہیں اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ ایسی لڑکی جس کی روح سے اس کی روح میل کھاتی ہو۔ ہاں اُسے جسم بہت ملے، درجنوں بلکہ سیکڑوں جسم، نوجوان اور خوب صورت جسم۔ بھولی مسکراہٹوں اور الھڑ اداؤں والے جسم، من موہنے، حسین و دلکش جسم۔ اور اس کی کوئی شب جسم کے بغیر خالی نہ گئی۔ مگر اس کی روح سدا پیاسی اور خالی رہی۔ اور وہ اپنی ساتھی کی تلاش میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا چالیس برس کا ہوگیا لیکن اُسے اپنی روح کا ساتھی نہ ملا۔

لوگ اُسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کتنا بدنصیب ہے۔ بینک میں تیس لاکھ رکھنے کے بعد بھی کتنا بدنصیب ہے۔ ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ سونے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے۔ بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ پریم کمار کو دیکھ کر مجھے اکثر اُس پر رحم آیا ہے اور اُس پر ترس کھا کر کئی بار میں نے سوچا ہے، کاش پریم کمار کی بدنصیبی مجھے مل جاتی اور میری خوش نصیبی اُسے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں پریم کمار کا دوست ہوں مگر ایک دوست بھی اپنی زندگی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ حالانکہ ایک دن میں نے اس کا ارادہ بھی کرلیا تھا اور اپنی خوش نصیبی اور اس کی بدنصیبی کا خیال کرتے ہوئے اُس سے کہہ دیا تھا: "دوست! اگر تم چاہو تو میری زندگی لے سکتے ہو۔ میری بھینگی بیوی اور اُس کے ساتھ بچے لے سکتے ہو۔ میری کھولی مع دو ٹوٹی ہوئی چارپائیوں، تین بستر اور دو زنگ آلود ڈرم لے سکتے ہو۔ ساڑھے پانچ ہزار کا جو قرض مجھ پر واجب ہے وہ بھی لے سکتے ہو اور تھرڈ کلاس لوکل ریلوے کا پاس بھی جو میں ہر ماہ بنواتا ہوں اور جس کے سہارے میں فٹ بورڈ پر لٹکتے لٹکتے باندرے سے چرچ گیٹ تک جاتا ہوں، تم وہ بھی لے سکتے ہو دوست مگر مجھ سے تمہاری بدنصیبی دیکھی نہیں جاتی۔ روز رات کو وسکی کی بوتل کھول کر تم بلک بلک کر عورت کی روح کے لیے روتے ہو، وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ تم بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لے سکتے ہو۔"

پریم کمار نے میری فراخ دلی سے متاثر ہوکر فوراً مجھے گلے سے لگالیا اور سسک سسک کر بولا: "دوست ہو تو ایسا۔ تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ مگر دوست! کون کسی کے نصیب سے اپنا نصیب بدل سکا ہے؟ جس روح کی سچی محبت کی مجھے تلاش ہے، وہ اگر خود سے مجھے نہیں مل سکی تو تمہارے سہارے سے کیا مل سکے گی؟ اور جہاں تک تمہاری عورت کا تعلق ہے، میں اپنی بھابی کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن اُس بےچاری کے منہ میں دانت تو ہے نہیں، روح کیا رہی ہوگی؟ میں تمہارے بچے بھی تم سے نہیں چھین سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے، تمھیں اپنے بچوں سے کتنا عشق ہے۔ تمہاری کھولی بھی میں تم سے نہیں چھینوں گا ورنہ تمھیں فٹ پاتھ پر رہنے سے بڑی تکلیف ہوگی اور میں اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا قرضہ بھی میں نہیں لوں گا ورنہ تم اور قرضہ چڑھا لوگے اور پھر تم سے دوستی نہیں دشمنی ہوگی۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا پاس بھی نہ لوں گا ورنہ تم بلا ٹکٹ پکڑے جاؤ گے۔ غرضیکہ دوست! کسی طرح ہم دونوں اپنی زندگیاں نہیں بدل سکتے۔ مگر تم زیادہ غم نہ کرو، میں اب چالیس برس کا ہوچکا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر اپنی بدنصیبی کی صلیب اکیلے نہ اٹھا سکوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب میں بہت جلد شادی کرلوں گا۔ یہ میں نے طے کرلیا ہے۔"

"کس سے؟"

"یہ تو میں نے طے نہیں کیا ہے۔"

"پھر بھی نظر میں تو کوئی ہوگی؟"

"فی الحال میری نظر میں دو لڑکیاں ہیں اور دونوں میری دو مختلف فلموں میں ہیروئن کا کام کررہی ہیں اور فی الحال میں دونوں سے محبت کررہا ہوں۔"

"دونوں سے؟ وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ کیا معلوم ان دونوں میں سے کس کی آتما میری آتما سے مل جائے۔ اس لیے احتیاطاً دونوں سے محبت کررہا ہوں اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں زیادہ دیر تک بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اور اب میری تلاش ان دونوں لڑکیوں تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ یقیناً ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ضرور ایسی ہوگی جو میری روح کی ساتھی ہوگی۔"

★

ہولی کے دن اُس نے بہت سے فلمی ستاروں کو پالی ہل کی اپنی شاندار کوٹھی میں مدعو کیا تھا۔ دلیپ کمار، راج کپور، شمی کپور، دیو آنند،

سادھنا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، جبیں جلیل، وحیدہ رحمان، جے راج، ڈیوڈ، کے این سنگھ، پران، ادم پرکاش، جانی واکر، سبھی فلمی ستارے اُس نے بلا لیے تھے۔ کئی سال سے یہ روایت بن چکی تھی کہ ہولی کے دن سب لوگ اس کے گھر اکٹھے ہوتے کیوں کہ اس کی کوٹھی کا سوئمنگ پول بہت شان دار تھا۔ اور زیرِ آب رنگا رنگ روشنیوں سے اس طرح جھلملاتا تھا کہ سوئمنگ پول کے پانی میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھر جاتے۔ سوئمنگ پول میں اس طرح کی خفیہ ٹونٹیاں لگوائی گئی تھیں جن سے بوقتِ ضرورت طرح طرح کے رنگ دار پانی تالاب میں چھوڑے جاسکتے تھے۔ گلابی، سبز، نیلے، پیلے، جامنی رنگوں کے پانی چاروں سمتوں سے اندر کی ٹونٹیوں سے فوارے کی طرح زور سے نکل کر جب تالاب میں آکر ملتے تو رنگوں کی کہکشاں سی بن جاتی۔ ہولی کے دن اس تالاب میں سب کو نہلایا جاتا۔ اور جو نہانے پر تیار نہیں ہوتے تھے انھیں زبردستی تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔ پھر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوتا، تالیاں بجتیں، ڈھول پیٹے جاتے اور آئی ایس جوہر، مکری اور اوم پرکاش مل کر بھنگڑا شروع کرتے جس میں ہولے ہولے سارے فلم اسٹار شامل ہوجاتے۔

آج ہولی کی تقریب میں پریم کمار نے آرتی بالا اور آرادھنا دونوں کو بلایا تھا۔ آج کل وہ ان دونوں سے محبت کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کرے گا۔ مگر وہ ابھی ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ کس سے شادی کرے؟

کبھی تو اسے آرتی بالا بہت پسند آتی کیوں کہ آرتی بالا بہت ہی سُلمُکھ، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ بہت باتونی ہر دم مذاق کرنے والی اور خوش رہنے والی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والی۔ وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ اگر شوٹنگ نہیں ہے تو سیر ہے، پکنک ہے، سینما ہے، دعوت ہے، کسی کے ہاں کھانا ہے یا کسی کو اپنے ہاں کھلانا ہے یا کوئی دوسرا پروگرام ہے۔ قوالی ہے یا تھیٹر ہے۔ اسے ہر دم کوئی نہ کوئی مشغولیت چاہیئے۔ وہ چُپ چاپ رہنے والے بور لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر پریم کمار کبھی سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تو وہ اُسے فوراً گدگدانے لگتی۔ اُس پر تکیہ، تاش، جوتا، قلم، جراب، کتاب جو سامنے آجائے پھینکنا شروع کرتی، یا تو اُسے ہنسا دیتی یا خفا کردیتی۔ اور خفا کر کے تو بہت خوش ہوتی کیوں کہ جھگڑنے میں اُسے بڑا مزہ آتا تھا۔ جھگڑا کر کے وہ بہت سی اَنٹ شنٹ باتیں سُنا دیتی تھی۔ رُوٹھ جاتی تھی، روتی تھی اور بڑی مشکل سے منائی جاتی تھی۔ اسے رُوٹھ کر مَن جانے میں بڑا لُطف آتا تھا۔ وہ تین لاکھ کی ایکٹرلیس تھی، حالانکہ اُس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔

لیکن پریم کمار کو آرادھنا بھی بہت پسند تھی۔ ایک تو اُس کی عمر بھی کم تھی، مُشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ مگر اٹھارہ برس کی عمر میں بھی جوانی گھٹا بن کر آرادھنا پر برسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوانی اُس کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ زیادہ بات تو نہیں کرتی تھی لیکن اس کا جسم بہت بولتا تھا اور اُس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ تھی۔ آرادھنا بولتی کم تھی مگر کھینچتی زیادہ تھی۔ اس کی کشش ایک مقناطیس کی طرح تھی اور جب پریم کمار اُس کے ساتھ سیٹ پر کام کرتا تو ساری دُنیا کو بھول جاتا۔ اسے معلوم ہوتا اُس کی باہوں میں کوئی عورت نہیں ہے، سُلگتا ہوا ایک انگارا ہے جس سے اس کا سارا بدن جل جائیگا۔

پریم کمار آرادھنا اور آرتی، ان دونوں کے بیچ میں لٹک رہا تھا اور یہ فیصلہ نہ کرسکتا تھا کہ کس سے شادی کرے۔ دونوں لڑکیاں ہیروئن تھیں۔ اُٹھتی ہوئی جوانی اور شہرت کی اُونچی منزلوں کی جانب رواں دواں۔ خود پریم کمار کی عُمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی اس لیے اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے اپنے مستقبل کی خاطر کسی نوجوان ہیروئن سے جلد شادی کرلینی چاہیئے۔ اب وہ اس صنعت میں تین چار سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس لیے گھر میں کوئی تو ہو جو اُس کے بجائے فلم انڈسٹری میں چل سکے ورنہ گھر کیسے چلے گا؟ اس طرح کے خیال اب اُسے ستانے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی پکّی عمر کی پکے ہوئے پھل کی طرح رَس دار ہیروئن سے شادی کرسکتا تھا مگر وہ بھی دو چار سال چل کر رہ جائے گی۔ اس لیے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ وہ کسی نوعمر ہیروئن سے شادی کرے۔ جسے فلم انڈسٹری سے باہر جاتے ہوئے کم ازکم بارہ سال تو لگیں۔ اس سے آگے کی بھگوان جانے۔

اس لیے پریم کمار آرادھنا اور آرتی بالا کے بیچ میں لٹک رہا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُسے کس سے سچّی محبت ہے، آرادھنا سے یا آرتی بالا سے؟ مگر اب وہ اپنی عمر کی اُس خطرناک منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں اسے بہت جلد اپنی محبت کا فیصلہ کردینا ہوگا اور اُن دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرلینی ہوگی۔ آج ہولی کے دن اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلینے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بے حد شور تھا۔ کچھ لوگ بھنگ پی کر لان پر مدہوش تھے۔ پریم کمار کہہ رہا تھا۔ "میں ایک سو روپے کی بلائنڈ چلتا ہوں۔"

کے این سنگھ بولا۔ "میں اپنی دونوں آنکھوں سے بلائنڈ چلتا ہوں۔"

مکری نے کہا۔ "میں ایک آنے کی بلائنڈ چلتا ہوں۔"

اوم پرکاش نے پوچھا۔ "ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر ہو سکتا ہے؟"

مکری بولا: "ہو سکتا ہے، اگر ہم سب لوگ ایمان داری سے ٹیکس دینے لگیں تو ایک آنہ ایک سو ایک روپے کے برابر ہو سکتا ہے۔"

اس پر ششی کپور نے وحیدہ رحمان اور سادھنا کو پانی میں غوطہ دے دیا اور سوئمنگ پول کے کنارے راکی اینڈ بوائز کا بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ روایت تھی کہ جب کبھی کوئی فلم ہیروئن پانی میں گرائی جاتی تھی، کنارے پر بینڈ زور زور سے بجتا تھا۔ اور لوگ پانی میں تیرتی ہوئی ہیروئن کی طرف پھول، گجرے اور ہار پھینکتے تھے۔ پھر پران نے جبیں اور شیاما کو پانی میں دھکا دے دیا اور بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ چند منٹ میں بیشتر فلمی ستارے پانی میں کود گئے اور سوئمنگ پول کی ٹونٹیوں سے طرح طرح سے رنگ دار پانیوں کے فوارے پھوٹنے لگے اور وہ لوگ جھلملاتی ہوئی رنگین روشنیوں میں نہاتے ہوئے، ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہوئے، ہنستے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے ہولی کی بہاروں میں کھو گئے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ڈائیونگ بورڈ پر پریم کمار آرتی بالا کو لیے کھڑا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے بینڈ کو دھن چھیڑنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

آرتی بالا نے ایک لمحے کے لیے کسی طرح کی حجت نہیں کی۔ وہ مسکراتی ہوئی پریم کمار کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے، ڈائیونگ بورڈ پر آئی۔ اس نے ہلکے جامنی رنگ کا ایک پھول دار بکنی سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ بار بار اپنی کمر لچکاتے ہوئے اٹھلا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے پریم کمار نے اسے دھکا دیا اور لوگوں کے شور کے درمیان آرتی بالا ایک ابابیل کی طرح بازو پھیلائے ہوا میں اڑتی نظر آئی اور دوسرے لمحے میں دھم سے پانی میں کود گئی۔

چند منٹ بعد پریم کمار ڈائیونگ بورڈ سے غائب ہو گیا۔ حالانکہ پانی کی سطح سے ہاتھ پھیلا کر آرتی بالا اسے نیچے ڈائیو کرنے کو کہہ رہی تھی، گویا اسے اپنی آغوش میں اترنے کو کہہ رہی تھی۔ مگر پریم کمار اب آرادھنا کو، پانی میں گرانے کی فکر میں تھا اور سوئمنگ پول چھوڑ کر آرادھنا کو ڈھونڈنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر آرادھنا اسی کے گھر کے ایک کمرے میں چھپ گئی تھی۔ کیوں کہ وہ سوئمنگ پول میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے پریم کمار نے اسے ڈھونڈا مگر آرادھنا کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ "گھبراتی کیوں ہو؟" پریم کمار نے کہا۔ "تمھارا جسم تو سب سے خوب صورت ہے۔ چلو سوئمنگ پول میں۔ مرد دیکھتے ہی مر جائیں گے، عورتیں جل جائیں گی۔"

"نہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔" آرادھنا گھبرا کر بولی۔

"ہولی کے دن شرم کیسی؟" پریم کمار نے پوچھا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔" آرادھنا نے دوسرا بہانا کیا۔

"میں تمھیں پانی میں سنبھالے رہوں گا۔" پریم کمار نے وعدہ کیا۔

"نہیں۔"

"چلو۔" پریم کمار آرادھنا کو سوئمنگ پول کی طرف گھسیٹنے لگا۔

"نہیں، نہیں۔" آرادھنا برابر منع کرتی رہی اور پریم کمار اسے زبردستی سوئمنگ پول کی طرف لے جاتا رہا۔ اسی کشمکش میں آرادھنا کا بلاؤز پھٹ گیا اور اس کا جوڑا کھل گیا اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ یکایک پریم کمار کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے یکایک اپنا ہاتھ روک لیا۔ آرادھنا کو چھوڑ دیا۔ آرادھنا سکڑی سمٹی الجھائی، خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور رک رک کر بولی۔ "جانے کیوں مجھے لاج آتی ہے، پریم مجھے وہاں مت لے جاؤ۔"

پریم کمار نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈائیونگ بورڈ پر لے گیا اور چلا کر کہنے لگا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میٹ مائی وائف۔"

چند لمحے تو حیرت کا مکمل سکوت رہا۔ پھر سوئمنگ میں اس غضب کا طوفان آیا گویا سوئمنگ پول کا سارا پانی اچھل کر تالاب سے باہر آ جائے گا۔

جب میں نے رات کو پریم سے پوچھا۔ "یہ تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟"

تو وہ بولا۔ "آرادھنا اور آرتی بالا میں سے آرادھنا کی روح زیادہ شرمیلی ہے۔ وہ فلم اسٹار ہو کر بھی لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتی ہے۔ اس کی روح کے اندر ایک شریف عورت کی پاکیزگی ہے۔ یقیناً آرادھنا ہی میری سچی محبت کے لائق ہے۔ میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔"



اسی رات آرادھنا نے اپنے بھائی سے، جو دراصل اس کا شوہر تھا، کہا۔ "میں پریم کمار سے شادی کر رہی ہوں۔ تمھیں ایک لاکھ دے کر الگ کر رہی ہوں۔ تم شادی کے بعد فوراً یہاں سے چلے جاؤ گے اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤ گے۔"

"ایک لاکھ دے دو میری رانی! میں تو کل ہی چلا جاتا ہوں۔"

"کل نہیں، شادی کے بعد۔"

"شادی کے بعد میری کیا ضرورت ہے؟"

"واہ، شادی کے بعد بھائی کی ضرورت ہوگی۔ ماں باپ تو ہیں نہیں میرے۔ تم میرے بھائی بن کر میرا کنیا دان نہیں کرو گے تو مجھے بڑی لاج آئے گی۔"



تیکھی اور منفرد کہانیاں لکھنے والے



دوسری کہانی



## یہ اڈا

اُس کے لیے سونے کی کان تھا مگر یہاں آنے سے بیشتر وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا اور کسی حتمی فیصلے کے تحت آج کی رات اس کان کو دُہے رہا تھا۔ پہلوان سے قوام لگے پتوں کا ایک چوکڑا لے کر اُس نے دونوں کلوں میں دبالیا اور دو چوکڑے بندھوا کر ساتھ لے لیے۔ سگریٹ اس نے پہلے سے بھر رکھے تھے اور یہ سب سامان رات بھیگ جانے کے انتظار کی کوفت سے بچنے کیلئے تھا۔ پان چوستا اور قوام کا مزہ لیتا وہ دو بار اس اڈے کے قریب سے گزرا تھا۔ دوسری بار گزرتے گزرتے ایک لمحے میں اُس نے صحیح جگہ کا انتخاب کر لیا تھا اور مطمئن ہو کر پلٹ آیا تھا۔ اس بازار میں بھیڑ لوئی سمٹ آئی تھی جیسے ابھی یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ گاہک اور گاہکوں کو چھانسنے والے، گورے کالے، ناٹے لمبے سبھی قسم کے انسان یہاں موجود تھے۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھی ان میں یوں گھل مل گیا جیسے اس کے یہاں آنے کا مقصد محض تفریح ہو۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور پھر دوسرے سے پہلے تک آتے آتے اُس نے دیکھا کہ کچھ دیر پہلے جو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اب ایسا نہیں ہے اور لوگوں کی تعداد بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔

پھر جب متی بائی نے بالکونی کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ گرایا تو اُس نے جان لیا کہ بازار سے اُوپر کا عمل ہے۔

اس وقت رات کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا ہے اور متی بائی کے علاوہ سرور، بھیراج، جانکی، نرگس اور دوسری بہت سی بائیاں پیروں سے گھنگھرو اُتار پھینکتی ہیں، سارنگیوں پر غلاف چڑھ جاتے ہیں اور بالکونیوں کے دروازے بند ہونے شروع ہو جاتے ہیں جن بالکونیوں کے دروازے نہیں ہوتے، اُن کے پردے کھل جاتے ہیں اور پھر گرم گرم سانسوں کے درمیان رات بھیگ جاتی ہے۔ اُسے ایسی بہت سی باتوں کا علم تھا جو رات کے پہلے پہر ناچتی تھیں اور دوسرے پہر بچھ جاتی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے انتخاب شدہ اندھیرے کونے میں کھڑا ہے جہاں سے اُسے سڑک کا آخری حصہ تک دکھائی دے رہا ہے جس کے آس پاس زندگی سمٹ رہی ہے، سمٹتی جا رہی ہے۔

دودھ والا ابھی ابھی دکان بڑھا چکا تھا۔ ہوٹلوں کی گھسی پٹی ریکارڈنگ بند ہو چکی تھی۔ چیزوں کے بھرے بھرائے سگریٹ بیچنے والے بند دکانوں کے تھڑوں پر اُونگھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ ٹھٹھے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ جو رہا ہے پر پہلوان پان والا ابھی تک گلوریاں بنا رہا

تھا اور پان کے ٹوکروں میں رکھے تھڑوں پر پان کی بچی کھچی کترنیں اور سگریٹ کی خالی ڈبیاں پھینک رہا تھا۔

ہیرا آدھ گھنٹے سے اس کونے میں کھڑا اپنے آخری پان کو چبا رہا تھا۔ چرس بھرے سگریٹ اس کی جیب میں تھے۔ تہمد میں اڑسا ہوا لمبا چاقو، آستین میں سلا ہوا دس کا نوٹ، جو اس نے ہنگامی حالات کے لیے دفن کر رکھا تھا۔ پاؤں میں اسپنج کی چپل اور کندھوں پر پڑا تا کمبل۔

اُسے اپنا فیصلہ اچھی طرح یاد تھا اور اس کی ساری احتیاط اس کے فیصلے کے تحفظ کے لیے تھی۔ ممکن ہے اس نے سوچا مجھے نیکی کے راستے میں پناہ ملے، اس نے اپنے آپ سے کہا نیکی کا صرف ایک راستہ ہوگا میں اسی راستے کی تلاش میں بھٹک گیا تھا اور آج اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔

سردی سے ٹانگوں کا خون منجمد ہونے لگا تو ایک بند دکان کے برآمدے میں پاؤں کے بل بیٹھ کر اس نے کمبل سے اچھی طرح اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ پھر بڑی احتیاط سے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ نکالا اور ہونٹوں سے چپکا کر ماچس ٹٹولنے لگا۔

ماچس جلانے کے فوراً بعد اس نے آنے والے کے قدموں کی چاپ سُنی تو جلتی تیلی پھونک سے بجھا دی اور سانس روک کر تھوڑی سی گردن دکان کے برآمدے سے باہر نکالی۔ آنے والا ابھی منّی بائی کے مکان سے گزر رہا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے ماچس نکالی اور سگریٹ سمیت برآمدے کے ایک کونے میں ڈال دی۔ پھر اپنا کمبل اتار کر زمین پر رکھا اور تہمد سے لمبا چاقو نکال کر مٹھی میں بھینچ لیا۔

اس کی نگاہیں راہ گیر کے ہر ہر قدم پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہر لحظہ چوکنا ہو رہا تھا۔ وہ راہ گیر کے قدم گننے لگا۔

"ہک"۔ دبی دبی مگر جھپاکے کی سی آواز اس کے حلق سے اُبلی اور اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو فضا میں لہرا دیا۔

راہ گیر اتنی تیزی سے گھوما کہ گر پڑا۔ وہ سنبھلا مگر اُٹھ نہ سکا۔ اس کے سر پر موت کا اشارہ تھا۔ ہیرا اس گرے ہوئے آدمی پر جھک کر کھڑا ہو گیا۔

"سب کچھ نکالو۔" اس نے دبی دبی آواز اور قہر آلود نگاہوں سے کہا۔

"میرے پاس! میرے پاس صرف" مسافر ہکلایا۔

"جو کچھ بھی ہے۔" ہیرا تھوڑا سا اور جھکا۔ "جلدی۔ جلدی۔" چاقو والا ہاتھ مسافر کے سر پر برابر منڈلا رہا تھا۔

مسافر نے تیزی سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور جیب میں بھری ہوئی چیزیں ایک لمحے میں سمیٹ کر مٹھی باہر نکال لی۔ "لو۔" وہ بولا۔

ہیرا نے دونوں ہاتھوں سے لوک بنانے کی بجائے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا دی۔ مختلف چیزوں کا یہ چھوٹا سا اجتماع دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔ ایک نیا پیک شدہ بلیڈ، سینما ٹکٹ کا آدھا حصہ، ایک کنگھی، فلمی گانوں کی ایک کاپی، بھنے ہوئے چنوں کے چند دانے اور دس نئے پیسے نقد۔

کوٹ پتلون میں ملبوس اس مسافر سے ہیرے کو یہ توقع نہ تھی۔ اُسے سخت کوفت ہوئی۔ غصے اور کوفت کے ملے جلے جذبات دبا کر اس نے دھیمی آواز سے پوچھا۔ "کیا کام کرتے ہو؟" پھر اس نے خود ہی بات بڑھائی۔ "جو کچھ پوچھوں بتاتے جاؤ۔"

"کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ لیتے ہو؟"

"تنخواہ تو خیر سوا سو ہے۔" وہ مسافر خوشگوار حیرت سے ہیرے کی طرف تکتا ہوا بولا۔ "آٹھ افراد کا کنبہ ہے اور پھر ہیڈ کلرک کو ماہوار بھی دینا پڑتا ہے۔ بچے اسکول جاتے ہیں۔ ماں بیمار ہے۔ سدا کی اور بہنیں جوان ہو رہی ہیں۔"

"کیوں۔۔؟" ہیرے نے اس کی بات روک دی۔ "ہیڈ کلرک ماہوار کیوں لیتا ہے؟"

"نہ دیں تو ہماری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی میرے علاوہ دوسرے کلرک بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"اور تم سینما دیکھا کرتے ہو؟"

"آج پہلی تاریخ ہے نا۔ اس دن مجھے دو روپے ذاتی خرچ کے لیے ملتے ہیں اور اسی دن ختم ہو جاتے ہیں۔"

"پتہ؟"

مسافر نے پتہ بتا دیا۔

"جلدی اُٹھو۔" ہیرے نے کہا۔ "اپنی چیزیں لو اور سیدھے گھر جاؤ۔ راستے میں کسی سے کچھ کہا تو صبح نمٹ لوں گا۔" مسافر تیز تیز چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگر اس نے گشت کرنے والے حوالدار سے سرِ شام ہی بات پکی کر لی ہوتی تو وہ یہاں ایک سیکنڈ بھی نہ ٹھہرتا۔ گشت کرنے والے سے تو وہ مطمئن تھا تاہم اصول کے مطابق ہیرے کو یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ مگر جس مقصد کے لیے اس نے یہ اڈا منتخب کیا تھا وہ ابھی ادھورا تھا اور وہ یہاں سے سرک بھی نہ سکتا تھا۔

یوں آج تک اُس نے سینکڑوں راہ گیروں کو لُوٹا ہوگا، مگر اس بے تکلفی اور بے خوفی سے کسی سے گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ یہ پہلا مسافر تھا جس کے متعلق وہ کچھ دیر سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے چپکا کر کمبل اُٹھایا اور ساتھ کے کھنڈر نما مزار کے اندرونی حصّے میں چلا آیا۔ یہاں وہ ایک لحاظ سے محفوظ بھی تھا اور سوچ بھی سکتا تھا۔ یوں بھی اُسے مسافر کے چلے جانے کے پندرہ منٹ بعد تک اس مزار کے اندرونی حصے میں رہنا چاہیے تھا۔ سگریٹ پیتے اور سوچتے ہوئے اُس نے چکنے فرش پر ہاتھ پھیرا۔ جا بجا موم بتیوں کے کھرنڈ جمے تھے جو کبھی جلائی گئی ہوں گی۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ اس مزار پر رنڈیاں اکثر چراغ جلاتی ہیں۔ "اچھا پیر باشا۔" اُس نے لمبا کش کھینچ کر کہا۔ "آج کوئی لمبا ہاتھ۔ یا صحیح راستہ! پورا بنڈل جلاؤں گا۔"

اس آخری کش سے اُس نے سگریٹ کی زندگی نگل لی۔ راکھ جھڑی تو اُس نے اسے پاؤں کے نیچے مسل کر جماہی لی اور کچھ دیر کھڑا رہ کر باہر آگیا۔ ابھی تک کوئی اُدھر سے نہیں گزرا تھا۔ اُس نے دائیں اور بائیں دُور دُور تک نگاہ دوڑائی مگر ہر طرف ایک سناٹا سا تھا گہرا اور سرد۔ دو ہی منٹ بعد اُسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اُس نے دیوار کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ فارغ ہونے کے بعد اُسے یوں لگا جیسے اُس کی اکتاہٹ کسی حد تک کم ہو گئی ہے اور بچی کھچی اکتاہٹ جمن خاں کی حویلی کے شکستہ دروازے سے نکلنے والے سائے نے ختم کر دی۔ اُس نے سائے کی حرکات پر توجہ مبذول کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ جمن خاں کی حویلی کے اس شکستہ دروازے میں داخل ہوں تو راستہ کس گلی میں جا نکلتا ہے۔ بالکل اُس گلی میں جس کی بغل میں ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے تھے، یوں تو اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی ڈیرے داری نام نہاد ہی ہے مگر ان کے ہاں آنے جانے والوں میں رؤسا ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کے خیال میں جمن خاں کی حویلی سے نکلنے والا سایہ بھی کسی رئیس کا تھا اور اُسے محتاط کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سایہ دیوار ٹٹولتا ہوا کچھ دُور چلا اور پھر دیوار کی طرف منہ کر کے موری پر بیٹھ گیا۔ ہیرے کو اسے پیشاب کرتے دیکھ کر ہنسی آگئی۔ "سالا۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "کیوں نہ اسے وہیں پکڑ لوں، مگر نہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔" وہ دیوار کے ایک اُبھرے ہوئے حصّے کے ساتھ چپک گیا۔ ایک لحہ، چند لمحے، سایہ لحظہ بہ لحظہ قریب آ رہا تھا۔ جھومتا، جھامتا جب وہ ہیرے سے دو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو ہیرے نے آواز نکالے بغیر چاقو والا ہاتھ فضا میں لہرا دیا مگر نہ جانے وہ کیسا راہ گیر تھا کہ اُس نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں، برابر چلتا گیا۔ ہیرا لپک کر پھر سامنے آیا اور اُسے

گریبان سے پکڑ کر بولا۔ "ساری شراب نکال دوں گا۔" دوسرے ہاتھ سے اُس نے کھلے چاقو کی نوک اُس کے پھولے ہوئے پیٹ میں چبھو دی۔ مسافر واقعی نشے میں دُھت تھا۔ وہ ایک لمحے تک تو نشے ہی میں رہا۔ پھر جب ہیرے نے اس کے گریبان کو دو ایک جھٹکے دیئے تو اُس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

رُندھی ہوئی آواز میں چلّا کر اُس نے کہا۔ "میں بال بچے دار ہوں۔"

نوک اُس کے پیٹ میں تھوڑی سی اور چبھو کر ہیرا بولا۔ "آواز بند۔ مال اِدھر۔ !"

"مال ؟" وہ آدمی منہ پھاڑ کر بولا۔ "مال کہاں ہے میرے پاس ؟ میرے پاس تو کوڑی بھی نہیں، سب اُس نے لے لیے۔" اُس نے پچھلی سمت اندھیرے میں اشارہ کر کے کہا۔ "اُس نے۔"

ہیرا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "کس ماں کو دے کر آیا ہے ؟" ایک دھول جما کر ہیرا بولا۔ "جیب اِدھر کر۔"

ہیرے نے بڑے اطمینان سے اُس کی سب جیبوں کی تلاشی لی۔ آخری جیب جھاڑتے وقت ٹھن سے اٹھنی سڑک پر بجی اور ٹھنک ٹھنن ناں کرتی ہوئی رینگ گئی۔

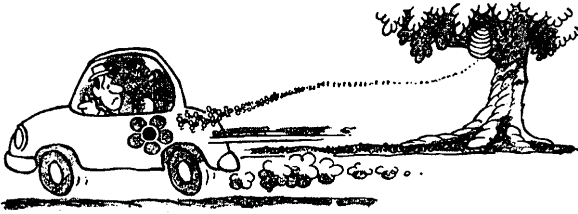
اٹھنّی کی آواز ہیرے نے اچھی طرح پہچان لی تھی، اور پھنکارتے ہوئے اُس موٹے آدمی کے سر پر زور کا ایک ہاتھ مار کر دھکّا دیا تھا اور چاہتا تھا کہ اُسے ایک آدھ ٹھڈا بھی مارے کہ منّی بائی کے کوٹھے کے ساتھ والی گلی سے دو آدمی باہر نکلے اور اسی طرف چلنے لگے۔ اُس نے بڑی پھرتی سے اُس آدمی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹا اور اندر مزار میں لے آیا۔ "خبردار۔ آواز نہ نکلے۔" اس نے کہا اور قدموں کی چاپ سننے لگا۔ دو آدمیوں کے گزرنے اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنے کی آواز آئی اور ہولے ہولے معدوم ہو گئی۔

کچھ لمحوں تک ہیرے نے سانس بھی بڑی آہستگی سے لیا۔ پھر جب اُسے یقین ہو گیا کہ راہ گیر دُور چلے گئے ہیں، تو اُس نے آدمی کو ٹھوکر مارنے یا گالی دینے کے بجائے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کیا کرتے ہو ؟"

"میں ؟" اُس آدمی نے چونک کر کہا۔ "میں یہاں ٹھیکے دار ہوں۔"

"کوئی بڑا ٹھیکا ہاتھ لگا ہوگا جو لوں عیش کر رہے ہو ؟ کس چیز کے ٹھیکے دار ہو ؟"

وہ آدمی مسکرایا تو اطمینان اُس کے چہرے پر جھلکنے لگا۔ "میں دو قسم کے ٹھیکے لیتا ہوں، مگر بڑا ٹھیکا بلڈنگز بنانے کا ہے۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے تو میں اپنے بھائی کو دے چھوڑتا ہوں۔"



"یہ کام کتنے پیسوں سے ہو جاتا ہے؟" ہیسکر نے کہا۔

"ٹھیکے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے بھی اور نہیں بھی"۔

"وہ کیسے؟" ہیرا تڑپ کر بولا۔ "کیا پیسوں کے بغیر یہ کام ہو سکتا ہے؟"

"ہاں"۔ وہ آدمی بے تکلفی سے بولا۔ "اگر ایس ڈی او اور انجینئر اپنے ہاتھ میں ہوں۔ انھیں قابو میں کرنے کے لیے کچھ پیسوں کی اور کچھ چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی شروع شروع میں، بعد میں تو معاملے کے مطابق مٹی بھی سونا ہے۔" آدمی ایک منٹ تک خاموش رہا، پھر بولا۔ "آج بھی مجھے ایس ڈی او کی خاطر یہاں آنا پڑا ہے۔ جب تک اُسے یہاں اُس کی مجبورگی کے ہاں جشن نہ کروائیں اور کچھ خدمت اُوپر سے نہ کریں نہ کام پاس ہو سکتا ہے اور نہ بل منظور ہو سکتا ہے۔ اِن کا کہنا مان لیں تو سیمنٹ میں دریائی مٹی ملا کر بھی کام چل جاتا ہے اور پیشگی رقم بھی ملتی ہے، یقین کرو۔" وہ آدمی رُک کر بولا "میں شریف آدمی ہوں، سب کچھ بال بچوں کی روٹی کی خاطر کرتا ہوں، یوں نہ ہیرا منڈی آتا ہوں نہ شراب پیتا ہوں، یہ تو صاحب نے زبردستی کروایا ہے اور پلائی بھی ہے، توبہ ہے، اللہ مجھے بخشے۔ شراب اور وہ بھی زنڈی کے ہاتھ سے۔" وہ ایک منٹ تک اپنی رُندھی ہوئی آواز میں پھُس پھُس کرتا رہا، پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ "مجھے گناہ کی کوئی فکر نہیں، یہ سب کچھ تو مجھے مجبوراً کرنا پڑا ہے مگر مجھے اپنی اس رقم کا بہت دُکھ ہے جو نہایت بے دردی سے میرے ہی اُوپر خرچ ہو رہی تھی، صاحب سو گیا ہے تو میری جان چھوٹی ہے، کنجر نے قسم کھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ میں سگریٹ پی لوں؟"

"ہاں ہاں"۔ ہیسکر نے بے ساختہ کہا۔ "ضرور پیو، مگر تم نے اپنے بھائی ٹھیکے کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔"

سگریٹ سلگا کر وہ آدمی ایک بار پھر ہنس پڑا۔ "سچ پوچھو تو وہ بھی بکواس ہے"۔ ایک لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "وہ آٹا تو ان سپلائی کرتا ہے بڑا ہی گندا کام ہے، یہ بھی اب دیکھو نا، آٹے میں سوکھی روٹیاں اور ہلدی میں بُرادہ نہ ملایا جائے تو ٹیڈی پیسہ بھی نہیں بچ سکتا۔ اس ٹھیکے کے لیے ڈاکٹر کو قابو کرنا پڑتا ہے مگر اللہ معاف کرے، ہے یہ سب کچھ حرام۔"

"یہ ٹھیکے داری تم باپ دادا سے کر رہے ہو یا؟"

"اوں ہوں"۔ اُس آدمی نے ہیسکر کی بات پوری ہی نہ ہونے دی۔ "اس سے پہلے تو میں ایک اور چکر چلاتا تھا۔" وہ رُکا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "دراصل میں محکمۂ بجلی میں لائن مین تھا، جب میں نے بجلی کا میٹر اُلٹا چلانے کا فن سیکھ لیا تو میری آمدنی دُگنی ہو گئی، میں مہینے کے آخری دنوں میں کچھ لوگوں کے میٹر اُلٹے چلا کر پیسے جمع کرنے لگا، پھر جب مجھے تیل کی ایک بڑی مِل والے نے اسی کام کے لیے ملازم رکھا تو میں نے نوکری بھی چھوڑ دی اور گلی گلی میٹر اُلٹانے کا دھندا بھی بند کر دیا کیونکہ مجھے اتنی رقم ملنے لگی تھی، جس سے میں مطمئن ہو گیا، تھیں حیرت ہو گی کہ مجھے وہاں سے چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔"

"اس کا مطلب ہوا۔" ہیرا کہنے لگا۔ "کہ وہ مِل کا مالک ہزاروں روپے کی بجلی جلاتا تھا؟"

"نہیں، یہ بات نہیں"۔ ٹھیکے دار جلدی سے بولا۔ "بجلی تو وہ مشکل سے پانچ سو روپے کی جلاتا تھا، جسے میں گھما کر سو سوا سو پر لے آتا تھا۔"

"تو پھر اُسے کیا فائدہ ہوا؟" ہیرا پوری بات سُنے بغیر بے صبری سے بولا۔

"میں یہی بات بتانے والا تھا مگر تم سنو تو۔" سگریٹ فرش پر رگڑ کر بجھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ "اس طرح وہ اپنا ٹیکس بچاتا تھا۔ انکم ٹیکس والوں نے بجلی کے بلوں کے ذریعے سے جب آمدنی کا اندازہ کرنا شروع کیا تو مجھے اچھی ملازمت مِل گئی۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے ساڑھے تین برس یہی کام کیا ہے اور اسی سے ٹھیکے دار بنا ہوں۔"

وہ آدمی خاموش ہوا تو ہیسکر نے حیرانی سے دو ایک بار اُس کی طرف دیکھا اور بالکل خاموش رہا۔ ابھی چند منٹ پہلے جو ہیرا یہاں موجود تھا، نہ جانے اب وہ کہاں تھا، کسی تیز اور کرخت آواز کی بجائے ہیسکر نے بڑے نرم لہجے میں اُس سے پتہ پوچھا، جب وہ بتا چکا تو ہیرا بولا۔ "بس اب تم جلدی سے چلے

جاؤ۔ دیکھنا کسی سے راستے میں کچھ کہنا نہیں، سمجھے ناں ؟"

"سمجھ گیا، سمجھ گیا" ٹھیکیدار جلدی سے اٹھا اور مزار کی اندھیری ڈیوڑھی سے نکل کر باہر چلا گیا۔

ہیرا باہر آیا تو وہ ڈولتا ہوا دور جا رہا تھا۔ وہ کوفت جو ہیرے کے ذہن میں دب سی گئی تھی، باہر آتے ہی اُبھر آئی۔ اُس نے دو ایک بار کندھے اُچکائے، منہ یوں بنایا جیسے کڑواہٹ محسوس کر رہا ہو اور پاؤں کے بل بیٹھ کر بے چینی سے کسی بھی راہ گیر کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے پھر اُس نے کرب میں لپٹی ہوئی ایسی چیخ سُنی کہ تیزی سے گردن موڑتے ہوئے رگوں میں سرد جاگ اُٹھا۔ اُس نے عمر بھر چوریاں کی تھیں، ڈاکے ڈالے تھے، لڑائیاں دیکھی اور لڑی تھیں، زخمیوں کی چیخ پکار سُنی تھی، مگر جانے یہ کیسی چیخ تھی کہ اُس کا دل بھی دہل گیا۔ اُس نے آواز پر نگاہیں جما کر دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا مگر پھرتیلا لڑکا پوری رفتار سے بھاگا چلا آ رہا ہے، اُس کے پیچھے بھاگنے والا کوئی موٹا سا آدمی ریچھ کا ریچھ تھا جو دُبلے پتلے لڑکے کی چیخ پکار سے ذرا بھی متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہیرا سگریٹ دُور پھینک کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ دُبلا پتلا لڑکا کسی کسائی بیکون میں اور بھی دُبلا دکھائی دینے لگا تھا۔ جب وہ ہیرے کے قریب پہنچا تو لاشعوری طور پر اُس سے لپٹ گیا۔ "بچاؤ، مجھے بچاؤ" اس کے منہ سے ہکلاہٹ میں دو ایک بار نکلا اور پھر اس کی آواز گنگ ہو گئی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

لڑکے کے پیچھے بھاگنے والا ریچھ نما آدمی یہ غیر متوقع بیا دیکھ کر اُلٹے قدموں بھاگ گیا۔ ہیرے نے لڑکے کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے پوچھا "معاملہ کیا ہے ؟"

"یہ لوگ، یہ لوگ مجھے چھوڑتے نہیں تھے" لڑکا برابر ہانپ رہا تھا۔

"کون لوگ ؟ اور کیوں ؟ تو یہاں آ کیسے گیا ؟" ہیرے کی آواز میں اطمینان اور دلاسا تھا۔

"میں گانا سُننے آیا تھا"

"تم ؟" ہیرے نے حیران ہو کر پوچھا "تم گانا سُننے آئے تھے ؟"

"ہاں میں آیا تھا" لڑکا بولا "میرے پاس دو ہزار روپے تھے"

"تم ابھی بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہو۔ اتنی رقم تمھارے پاس کہاں سے آ گئی ؟"

لڑکا ایک منٹ کے لیے پریشان سا ہو گیا۔ شاید وہ اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا یا اُس کے پاس اس سوال کا جواب تھا ہی نہیں۔

"فکر نہ کرو" ہیرا اُسے پچکار کر بولا "تمھیں اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سب کچھ صاف صاف کہہ دو۔ گھر سے لیا تھا ؟"

"اُونہوں، نہیں" لڑکا بولا۔

"پھر ؟"

"چوری کی تھی" ــــــــ "ہاں"۔

"چوری ؟ تم چوری کر سکتے ہو ؟"

"ہاں ! ہم نے چوری کی تھی"

"مگر تم چور ہو کر اس آدمی سے کیوں ڈر گئے ؟"

"ہم نے چوری ضرور کی تھی مگر ہم چور نہیں ہیں"۔

"چوری کرنے والا تو چور ہی ہوتا ہے"

"مگر، مگر" وہ لڑکا ایک پل تک رُکا رہا۔ پھر بولا "ہم نے تو مذاق مذاق میں ایک آدمی کو نقلی پستول دکھایا تھا۔ بس وہ ڈر گیا اور اپنا تھیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس تھیلے میں ہماری اُمید کے خلاف چار ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ ہم نے دو دو ہزار تقسیم کر لیے"

"پولیس نے تمھیں کچھ نہیں کہا ؟" ہیرے نے جیب سے سگریٹ نکالا اور پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اتنا جھکا کہ تیلی جلنے سے روشنی اُس کی جھولی ہی میں سمٹ گئی۔ ایک لمبا کش لے کر اُس نے سگریٹ مٹھی میں اس حد تک چھپا لیا کہ گہرے اندھیرے کے باوجود سگریٹ کی روشنی دبیز تاریکی میں گھُل مِل گئی۔ اُس نے بڑے اطمینان سے بات آگے بڑھائی "دوسرے دن پولیس تو اس جگہ آئی ہو گی ؟"

"ہاں ! وہاں پولیس آئی تھی مگر تسنیال پارک میں جو کچی آبادی ہے نا ؟ وہ تو وہاں سے آئی تھی اور وہیں سے انھوں نے چار پانچ آدمیوں کو گرفتار بھی کر لیا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے روپے چھیننے کا اعتراف بھی کر لیا ہے"

"تمھارے سب ساتھی محفوظ رہے ؟"

"جی ہاں، پولیس انھیں پکڑ ہی نہیں سکتی تھی"

"وہ کیوں ؟" ہیرے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ" وہ لڑکا اسی لہجے میں بولا "وہ سب کے سب شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی، یعنی" اس لڑکے کو ایک لمحے تک کوئی معقول لفظ نہیں ملا۔ پھر اُس نے کہا "یعنی وہ سب کے سب رئیس خاندانوں سے تھے اور پھر سب کے سب بڑے افسروں کے لڑکے تھے، میں خود پولیس کے"

اس سے پہلے کہ لڑکا اپنے والد کے متعلق کچھ بتاتا، ہیرا بولا "تم تو

ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان جب یروشلم کی ایک گلی سے گزرا تو ایک شخص نے برابر سے نمودار ہو کر اُسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ "بے دین گمراہ ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔ خدا تجھے ذلیل اور برباد کر دے۔"

نوجوان نے مسکرا کر اس شریر انسان کو دُعائیں دینی شروع کر دیں۔ ایک تیسرے شخص نے حیرت سے دریافت کیا۔ "جب یہ شریر تمہیں گالیاں دے رہا تھا تو تم نے اُسے دعائیں کیوں دیں تم بھی جواباً گالیاں دے سکتے تھے۔"

شریف نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔ "جس کے پاس دینے کے لیے جو کچھ ہوتا ہے دُوسروں کو وُہی دیتا ہے۔ ان کے پاس گالیاں تھیں، مجھے گالیاں دیں۔ میرے پاس دعائیں تھیں، میں نے دُعائیں دے دیں۔" یہ شریف نوجوان حضرت مسیحؑ تھے جو یہودیت کی بُرائیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔

بڑے کام کے آدمی ہو۔"

"کیوں نہیں؟ ہم نے ایک بار ٹیکسی والے کو بھی۔۔۔"

"خیر چھوڑو یہ باتیں۔ تم یہ کہو کہ یہ روپے تم نے خرچ کیسے کیے؟"

"وہ تو سب کے سب بار میں شراب پینے چلے گئے تھے" لڑکا بولا "اور میں گانا سُننے چلا آیا۔"

"سُنا پھر گانا؟"

"ہاں گانا تو سُنا تھا۔ گھر والوں کے ڈر سے میں نے سارا روپیہ تو چھوٹی والی کو دے دیا۔ پھر جب صبح کے تین بج گئے اور میرا روپیہ بالکل ختم ہو گیا تو طبلہ بجانے والا شخص مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اُس نے مجھے ایسے سگریٹ پلائے کہ مجھے چکر آ گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے میرے سارے کپڑے اُتار دیئے، مجھ میں کچھ بولنے تک کی سکت نہیں تھی، دوسرے دن میں دوپہر کے بعد جاگا تو میرے جسم پر سارے کپڑے موجود تھے مگر کمرہ باہر سے بند تھا۔ میں نے دو ایک بار دروازہ بھی کھٹکھٹایا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ دوپہر سے لے کر اب تک میں اُس آدمی کا انتظار کرتا رہا تھا۔ یہ تمام وقت میں نے اکڑوں بیٹھ کر گزارا ہے حالانکہ میرے جسم کا ہر حصہ دُکھ رہا تھا۔ اب اس آدمی نے دروازہ کھولا ہے تو میں نکل بھاگا ہوں۔ اب یہ میرے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ آپ کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ آپ کون ہیں؟"

"میں کوئی بھی ہوں" ہیرا بولا "اسے چھوڑو، اب کیا چاہتے ہو؟ تمھیں گھر چھوڑ آؤں؟ میں تمھیں گھر چھوڑ آتا" ہیرا خود ہی بول پڑا "مگر مجھے اس وقت بہت ضروری کام ہے، اگر تم تھوڑی دیر انتظار کر سکو تو اس گلی کی بغل میں پیر بابا کا مزار ہے، وہاں بیٹھو میں فارغ ہو کر تمھیں ابھی گھر چھوڑ آتا ہوں۔"

لڑکا مزار کے دروازے پر ایک منٹ کے لیے جھجکا مگر پھر اندر چلا گیا۔

ہیرے نے سگریٹ کا کش لے کر نگاہ اُٹھائی تو مخالف سمت سے بوسیدہ کمبل اوڑھے کوئی شخص جھکا جھکا چلا آ رہا تھا۔ ہیرا اس وقت ذرا بھی نہ چونکا نہ اس نے چاقو فضا میں لہرانے کی ضرورت محسوس کی، نہ ہی مٹھی میں دبایا ہوا سگریٹ دُور پھینکنے کی کوشش کی، اُس نے پہلے کی طرح نہیں بلکہ بڑے سلیقے سے کہا "جناب ذرا سنیے۔"

کمبل میں لپٹا لپٹایا آدمی قریب آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ ہیرے نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ یہ آدمی بالکل نوجوان دکھائی دیتا تھا مگر اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں اور اس گہرے اور سرد اندھیرے میں اُس کی زرد رنگت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں جی؟" ہیرے نے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔

"پیسے؟ میرے پاس؟؟" نوجوان نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ مزار کے اندر بیٹھا ہوا لڑکا چونک کر گلی تک آ گیا۔ مگر گلی سے باہر آنے کی جرأت اسے بھی نہ ہوئی۔

ہیرا کچھ دیر تک حیرت سے اس نوجوان کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر ذرا تلخی سے بولا "بکواس مت کرو۔ آہستہ بول۔"

مگر نوجوان اسی آواز میں ہنستا چلا گیا۔ اسی دوران اُس کے ہاتھ سے کوئی چیز گر پڑی، دونوں اس شے کی طرف لپکے، ہیرے نے دیکھا وہ کتابیں تھیں جنھیں اس نوجوان نے جلدی سے اُٹھا لیا تھا۔ پھر گہری سنجیدہ آواز میں اُس نے کہا "میرے پاس پیسے ہوتے تو میں اس ٹھٹھرتی سردی میں کھمبے کے نیچے کھڑا ہو کر پڑھنے کی بجائے گھر میں دیا جلا لیتا۔" اس نوجوان کے چہرے پر اتنا کرب اُمنڈ آیا تھا کہ کچھ اور کہنے کی بجائے اُس نے گردن جھکا لی اُس کا چہرہ پہلے سے زیادہ بھیانک دکھائی دینے لگا تھا۔

ہیرے کا سارا غصہ اس ایک جملے نے شرمندگی میں بدل دیا۔ اُس نے چاقو بند کر کے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا "کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"ایف اے میں۔"

"اچھا کالج میں پڑھتے ہو؟ خوب" ہیرا مسکرایا۔

"پڑھ کیا رہا ہوں، کوشش کر رہا ہوں" وہ نوجوان بے ساختگی سے بولا

"بوڑھی ماں ہے بے چاری' مجھے جج بنانے کے خواب دیکھتے اور لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھتے ہوئے اس نے جسم کا روگ بھی لگا لیا ہے اور آنکھوں کی بینائی بھی کھو دی ہے' میں ابھی ایف اے میں ہوں' اس کا خیال ہے' میں بہت جلد جج بننے والا ہوں' اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں آئندہ دس سال تک جج کیا' کچھ کمانے کے قابل بھی نہ ہو سکوں گا تو شاید وہ پاگل ہو جائے' ویسے اب بھی وہ کچھ کچھ پاگل ہو چکی ہے' مجھے ابھی سے جج صاحب کہتی ہے' بے چاری' مجھے تو اسی کی فکر ہے خود تو فاقہ بھی برداشت کر لیتا ہوں' اور سردی بھی' مگر میری ماں اس قابل نہیں ہے کہ وہ ایک دن کا بھی فاقہ برداشت کر سکے یا ایک رات کی سردی۔"

نوجوان خاموش ہوا تو دور دور تک ایک گہرا سناٹا سا تن گیا۔ وہ کتا جو کچھ دیر پہلے منی بائی کے کوٹھے کے سامنے سے مٹی کرید رہا تھا اب دوسرے کتے کے ساتھ مل کر رو رہا تھا۔ دونوں کتے دردناک آواز میں رو رہے تھے' بین کر رہے تھے'

ہیرے نے دکھ سے آہ بھری' اسے یاد آیا کہ وہ بھی سیدھے راستے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا۔ یہ نوجوان بھی سیدھے راستے کا متلاشی ہے' یہ بند گلی میں آ پہنچا ہے' میں اس گلی کی دیوار پھلانگ کر بھٹک رہا ہوں' اس کے آس پاس دیواریں ہیں اور میرے اردگرد چٹیل میدان ہیں' بڑے اضطراب میں اس نے دو ایک بار پھنکار کر اس نوجوان سے کہا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

نوجوان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ اب کھمبے کے نیچے دونوں کتے پھر زمین کرید رہے تھے۔

ہیرا کچھ دیر ٹہل کر اپنا اضطراب کم کرتا رہا۔ پھر اس نے مزار کی گلی میں جھانک کر جھی کی آواز نکالی' نوک دار جوتوں اور زنگ پتلون والا لڑکا باہر آیا تو ہیرے نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "میں تمہیں گھر چھوڑ کر نہیں آ سکتا' تم جوں توں کر کے خود ہی گھر پہنچ جاؤ' ابھی ابھی تم سے قیمتی انسان یہاں سے گزرا ہے' وہ پیدل سردی میں ٹھٹھرتا گھر چلا گیا ہے' تم بھی سیدھے گھر چلے جاؤ اور دوبارہ ان الجھے ہوئے راستوں کی طرف لوٹو تو یہ سوچ لینا کہ پھر سیدھے گھر نہ جا سکو گے جاؤ۔"

لڑکا گردن جھکا کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔

اسی وقت گھنٹے نے تین بجائے' اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک چکا ہے' تھکن کے اس احساس کے ساتھ ہی اسے سردی نے آدبوچا تو اسے چائے یاد آ گئی' اسے معلوم تھا کہ چمن خاں کی حویلی کے شکستہ گیٹ سے اندر داخل ہوں تو راستہ کس گلی میں جا نکلتا ہے' بالکل اس گلی میں جہاں ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے ہیں اور ان کوٹھوں کے نیچے ایک کبھی نہ بند ہونے والا محرم علی کا ہوٹل ہے۔ وہ سیدھا محرم علی کے ہوٹل میں چلا آیا۔ ہوٹل میں ابھی تک کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

وہ بھی کمبل کندھوں پر ڈال کر کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ اسے خیال آیا کہ پیسہ تو اس کی جیب میں ہے نہیں' صرف دس کا ایک نوٹ ہے جو آستین میں سلا ہے اور جس کا یہاں نکالنا مناسب نہیں ہے' اسی ادھیڑبن میں دو منٹ گزر گئے' پھر ایک نعرے کے ساتھ بلاکی اندر داخل ہوا۔ "ابے!" اس نے کہا

ہیرے نے گردن اٹھا کر آنکھیں کھولیں تو بلاکی کی سنہری مونچھوں سے مسکراہٹ کھیل رہی تھی' وہ اتنی تیزی سے اٹھا کہ میز الٹتے الٹتے بچی' دونوں بغل گیر ہو کر یوں ملے کہ سب لوگوں نے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے بلاکی کے لیے چائے کا آرڈر دیا تو بلاکی نے میز پر مکہ مارتے ہوئے ہوٹل کے چھوکرے سے کہا۔ "سن بے' آرڈر اپنا چلے گا' چائے بھی لاؤ' اور کھانے کے لیے بھی" پھر اس نے ہیرے سے کہا۔ "کوئی سگریٹ ہے؟"

ہیرے نے تڑپ کر سگریٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ابھی بھرا ہے۔"

کش لینے سے پہلے ہی بلاکی جھوم گیا۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگانے سے پہلے سر لوا سے لگا کر منہ چھت کی طرف کر لیا اور لمبے لمبے کش لگا کر دھواں چھوڑتا ہوا سگریٹ بڑی احتیاط سے انگلیوں میں سیدھا پکڑ کر بولا۔ "آج کھڑے کھڑے دو چار سودے مل گئے تھے۔"

"سودے" ہیرے نے تڑپ کر نگاہیں اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں گاڑ دیں۔ "سودے سے تمہارا کیا تعلق؟"

"یہ ناتا ٹوٹ بھی سکتا ہے بھلا" بلاکی چہک کر بولا۔

"مگر کیوں؟ تم نے تو مدت ہوئی پیٹھ دکھا دی تھی۔"

"ہاں" بلاکی کہنے لگا۔ "میں نے یوں بھی سوچا تھا۔" اس نے ایک لمبا کش لے کر سگریٹ ہاتھ سے مسل دیا۔ "خیال تھا اس کم بخت سے چھوٹ جاؤں گا' دو بچوں کا باپ ہوں' جوان ہو کر کیا کہیں گے۔ ہمارا باپ دھاڑیا ہے۔ اسی کارن میں نے علاقے میں آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"مگر سودے کا چسکا بھی تو مرنے کا ہوتا ہے" ہیرا فوراً بولا۔

"ارے نہیں یار تو غلط سمجھا" بلاکی نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے سودا اٹھاتے تھے اور جیل ویل چلے جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا سودا لوں یا نہ لوں کوئی فرق نہیں' جیل بھی جاؤں گا' مار بھی کھاؤں گا۔ ورنہ پولیس کا ماہوار لوا کروں' انھیں اس بات سے سروکار نہیں کہ میں سودا لوں یا چھوڑ دوں' انھیں تو بس اپنا حصہ چاہیے۔ اور جی حضوری اور خدمت گزاری الگ۔"

"تم نے انھیں بتایا نہیں کہ تم اب شریف آدمی بن چکے ہو" ہیرا بولا۔

# خون کا عطیہ دیجئے



انسانی زندگی کو بچائیے

PBS پاکستان برماشل

United PBS-PR 1/72

"جو ایک بار دس نمبریا ہو جائے لوگ اُس کی اولاد پر بھی شک کرتے ہیں تم میری شرافت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو؟"

چھوکرے سے دوبارہ چائے منگوا کر دونوں پرچ میں انڈیل انڈیل کر پینے لگے۔ اسی دوران بلاکی پھر بولا۔ "آج پہلا دن تھا بڑی گراؤنڈ کے پاس پُل پر ڈھائی بجے تک آٹھ چھلتر کا سودا ہوا۔"

"نیگے یا سبزے؟" ہیرے نے بے تابی سے پوچھا۔

"سبزے میاں! ایک سبز تو ابھی گن نہیں رہا ان میں، وہ علاقے کے حوالدار کی تپّی تھی۔ معاملہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ آدمی وہ بھی ایمان دار ہے اور زبان اپنی بھی پتھر کی لکیر ہے۔ گشت اس طرف آ ہی رہی تھی کہ وہ مجھے سائیکل پر آکر اطلاع دے گیا۔ بلکہ پیچھے بٹھا کر گوروں کے قبرستان تک چھوڑ بھی آیا۔ ایسا سچا انسان کیا کہوں، جب تک گشت گراؤنڈ کے پاس پُل پر آئی ہوگی میں نے دس روپے اور بنا لیے تھے۔ ایک چھلتر تو حوالدار کا حق تھا ہی! تو اپنی سُنا، کچھ ملا آج؟"

"اوں ہوں۔" ہیرے نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کوئی سگریٹ بیڑی بھی نہیں؟"

"نہیں!"

"وجہ؟"

"کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، اور رہیں بیڑیاں تو وہ زمانہ گیا جب لوگوں کے پاس شیفر اور پارکر کی بیڑیاں ہوتی تھیں، اب تو اسکول کے چھوکرے سے ہیڈ ماسٹر تک ایک ہی آٹھ آنے والی پنسل ہوتی ہے۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔" بلاکی حیرت سے بولا۔ "آدمی نیک نیتی سے اڈے پر کھڑا ہو اور خالی رہے؟"

"ہاں یار۔ تو نے بڑی دور کی بات کی۔ نیت میری ہی خراب تھی، کچھ دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ سوٹے بازی چھوڑ دوں اور کوئی سیدھا راستہ تلاش کر لوں۔ آج میرا ارادہ تھا کہ کوئی بڑا سودا ملے تو لے لوں، ورنہ یہ معلوم کروں کہ لوگ کیسے کماتے ہیں، شاید میرے لیے وہی راستہ بہتر ہو۔"

"پھر؟" بلاکی جلدی سے بولا۔ "معلوم ہوا راستہ؟"

"راستے تو بہت سے ملے ہیں، مگر جس پر بھی چلیں، اپنے ہی اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

بلاکی نوشکرا حیرت سے بولا۔ "میں نہیں سمجھا تمھاری بات؟"

"جتنے لوگ مجھے آج ملے تھے، میں نے سب سے ان کے پیشے کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان سب کا پیشہ اور میرا تمھارا پیشہ ایک ہی ہے۔"

"وہ سب دھاڑیے تھے کیا؟"

"نہیں" ہیرا ہنس کر بولا۔ "یہ بات نہیں بلکہ کوئی خوراک میں زہر ملاتا ہے اور کوئی سیمنٹ میں دریا کی مٹی۔ کوئی ٹیکس بچاتا ہے تو کوئی ناپ تول میں لوگوں کو لوٹتا ہے اور ہیرامنڈی آکر لٹتا ہے۔ ایک ان میں ایسا بھی تھا جو صحیح معنوں میں بھوکا مر رہا تھا۔ سب سے زیادہ ہمدردی مجھے اسی شخص سے ہوئی مگر میں اس کا پیشہ کیا بتاؤں؟ وہ بھی میری طرح رات کا مسافر تھا۔ وہ کھمبے کے نیچے کھڑا ہو کر رات بھر سردی میں پڑھتا اور روگ خریدتا ہے، فاقوں کا علاج تو اس کے پاس ہے نہیں، البتہ وہ اپنے جسم میں پلنے والی بیماریوں کا علاج، پڑھ لکھ کر عمر کے آخری حصے میں ضرور کر سکے گا۔ میرے لیے سب کے سب بیکار تھے، عجیب پیشہ ہے ان سالوں کا۔ سب کے سب ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں۔"

"کمال ہے" بلاکی بولا۔ "اُن سے تو ہمارا پیشہ باعزت ہے، ہم نے تو کبھی ایک دوسرے کو نہیں لوٹا۔"

ہیرے نے مسکرا کر بلاکی کی طرف دیکھا۔ بلاکی کی سنہری مونچھیں شرارت سے کانپ رہی تھیں، اُس نے بات بڑھائی۔ "یار تو تو سیانا آدمی ہے، جو ایک ہی رات میں سب کچھ سمجھ کر سیدھی راہ پر آگیا۔ مجھے دیکھو سال بھر بھٹک کر پہنچا ہوں یہاں۔ ذرا ہاتھ ادھر کرو ناں۔"

ہیرے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو بلاکی نے مضبوطی سے تھام کر کہا "لے، تو آج خالی رہا ہے نا۔ آدھے تو لے لے۔" اُس نے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہاتھ کی مٹھی میں کچھ نوٹ دے دیے۔ لمحے بھر کے تردد کے بعد ہیرے نے نوٹ لے لیے، پھر بولا۔ "کل کیا پروگرام ہے؟"

"کل کا پروگرام تو کل ہی بتا سکوں گا۔ بس اتنا یاد رکھ، بڑا سودا ہے، مل کر اُٹھائیں گے۔ مولا نے چاہا تو!"

"اچھا" ہیرا بولا۔ "مگر تم ذرا جلدی آجانا۔ کام سے پہلے مجھے پیر بابا کے مزار پر موم بتیاں بھی جلانا ہیں۔" ذرا رک کر اس نے بات بڑھائی۔ "میں نے سیدھے راستے کی تلاش میں منت مانی ہوئی ہے۔"

باہر کسی کتے سے کوئی سائیکل سوار ٹکرا گیا تھا۔ کتے کی چیخ سن کر دونوں نے باہر دیکھا جہاں صبح کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ اونچی منزلوں میں روشنیاں دم توڑ رہی تھیں اور رات بھر جاگنے والے کتے تھوتھنیاں لٹکائے کھولیوں کی طرف جا رہے تھے۔









تاریک تھی۔ مگر عورت راستے سے واقف تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتی گئی۔

تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ مگر دھیمی رفتار قائم تھی —— اندھیرے میں اسے سامنے بی۔ آر۔ بی نہر کا باٹا پور والا پُل نظر آیا۔ نقاہت سے لڑتے ہوئے اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو تاروں بھرے آسمان کی ہلکی روشنی کو ایک مینار کا تاریک ہیولا کاٹ رہا تھا۔

یہ مینار نہر کے غربی کنارے پر ایک یادگار ہے۔ یہ اس خون کی یادگار ہے جو ایک عظیم مقصد کے لیے نہر کے گدلے پانی اور سڑک کے سخت سینے پر فوّاروں کی مانند اُبلا۔ حمایت علی شاعر نے کہا ہے کہ: "یہ خون رنگِ رخِ چمن ہے، خوابِ دُلھن ہے، ہر باپ کا بدن ہے، بھائی کا بانکپن ہے، ہر ماں کے دل کی دھڑکن ہے، بچّوں کا بھولپن ہے، کھیت کی پھبن اور مزدور کی لگن ہے —— یہ خون سرمایۂ وطن ہے۔"

یہ یادگار زنجیروں کے حاشیے میں ایستادہ ہے..... گول فرش پر چبوترا ہے جس کے ماتھے پر تھرڈ بٹالین کے متاعِ حیات لُٹانے والے شہیدوں کے نام کھُدے ہوئے ہیں۔ چبوترے کے اوپر چوکور مینار فضا میں اُبھرتا ہے۔ جس پر کندہ ہے:

"اُن شہدا کی یاد میں جو پاک و بھارت جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کام آئے۔ اس راہ سے گزرنے والے ہموطنو! اسلام کے اُن سپاہیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے جاؤ جو اپنا سب کچھ قربان کر کے ہماری بقا کا سامان کر گئے۔"

مینار کی چوٹی پر ایک گنبد ہے۔ مسجد کے مینار والا گنبد۔ اُس ماحول کا نمائندہ جس کی بقا کے لیے خون بہا، جوان جسموں کے چیتھڑے اُڑے، سڈول اور بھرپور رانوں کی قاشیں کٹ گئیں، فولادی ہاتھوں اور نورانی پیشانیوں کے شفق رنگ ٹکڑوں نے توپوں کی پُرہول گھن گرج کے ساتھ سرخ فضا میں ابدیّت کا رقص کیا۔ جن سے مسحور ہو کر دشمن ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ عورت رات کی تاریکی میں اس یادگار کے پاس آکر رُکی۔ وہ یہاں پہلی دفعہ نہیں آئی تھی۔ اپنے گاؤں سے سات میل کا فاصلہ پیدل چل کر وہ دو چار دفعہ پہلے بھی یہاں آئی تھی۔ کبھی ساتھ والے درخت کے نیچے بیٹھ کر قرآن پڑھتی رہتی اور کبھی حاشیے والی زنجیریں تھام کر چبوترے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی جس پر دینو کا نام درج تھا۔

دینو اُس کا ہمسایہ تھا —— بچپن اور جوانی کا ہمسایہ —— جو بعد میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔

وہ کھیت پر اُس کے لیے لسی لے کر جایا کرتی تھی کیوں کہ دونوں کی زمینیں ملحقہ تھیں۔ جب وہ اپنے بابا کے لیے روٹی لے جانے لگتی تو دینو کے گھر میں بھی جھانکتی: "ماسی میں جارہی ہوں اُدھر۔ لسی دینی ہے تو دے دو۔"

اور ماسی لگاتار دعائیں دیتے ہوئے اسے ایک پوٹلی اور مٹی کا برتن دے دیتی جو وہ اپنے لچکدار کولھے پر ٹکا کر دھڑکتے دل اور لرزاں قدموں سے دینو کے آگے لے جا کر رکھ دیتی۔

یہ عورت اُن دنوں ہلکی پھلکی نازک اور سبک چھبیلی تھی —— وہ رِم جھم کر کے چلتی تو دینو کے دل پر برکھا ہونے لگتی۔ جو گاؤں میں گتکا کھیلنے والا پٹھا تھا، کبڈّی کا پھرتیلا کھلاڑی تھا، اور چاندنی راتوں میں سریلے گلے کی اونچی تان پر ماہیا گانے والا تھا۔

ان کا گاؤں سرحد کے پاس ہی تھا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا اور ہجرت کی خون بھری داستانیں ابھی تازہ تھیں۔ قافلوں کے لیے، معصوموں کے قتل اور بربریّت کی گواہیاں ابھی لوگوں کی آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ لُٹی ہوئی عصمتیں

اِس ماہ کے لیے ممتاز مصوّر اقبال مہدی کا اِنتخاب ○ اُردو کے مشہور ادیب مسعود مفتی کی دو مختصر کہانیاں

کی پژمردہ راکھ ابھی سُلگ رہی تھی۔ کشمیر کی جنگ جاری تھی۔ ایسے میں شام کے وقت لوگ حقے کے کش لگاتے ہوئے ذکر چھیڑتے کہ شاید ہندوستان حملہ کردے اور ان کا گاؤں تو سرحد کے پاس ہی تھا۔

"کیا وہ ڈراما پھر ہوگا؟" دینو غصّے سے کھَول کر سوچتا۔ اور یہی سوچتے سوچتے اس نے ایک دن فوج میں نام لکھوالیا۔

"یہ زمینداری کرتے کرتے تمھیں فوج کی کیا سوجھی دینو؟" چودھری نے گلی سے گزرتے ہوئے پوچھا۔

"چودھری جی!" دینو نے بڑے جذبے سے کہا تھا۔ "ہم لوگ مرنے کو تیار ہوں گے تو گاؤں کی بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہ سکے گی۔ آئیں تو سہی ہندوستانی اِدھر۔ چمڑا نہ اُدھیڑ دوں اُن کا......"

اور دروازے کی اوٹ میں چھُپ کر سننے والی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اب وہ کس کے لیے لسّی لے کر جایا کرے گی؟ —— دینو چلا گیا۔

لڑکی کی شادی گاؤں کے ایک اور نوجوان سے ہوگئی۔ اور جب ایک دن دینو وردی پہنے گاؤں میں آیا تو اس نے بڑے دُکھے ہوئے دل سے اس لڑکی کی شیر خوار بچّی کو پانچ روپے اور ایک جھنجھنا دیا تھا۔ اور بڑے ٹ

بوٹ بجاتا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ بچّی کی ماں گہری آنکھوں سے جانے والے فوجی کو دیکھتی رہی اور پھر مُڑ کر بے اختیار اپنی بچّی کو چُوم لیا۔ جس کی حفاظت کے لیے اُس نے وردی پہنی تھی۔

وہ بچّی سولہ سالہ مٹیار تھی اور اس کی ماں ایک بھرپور عورت تھی۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے واقعی حملہ کردیا۔ مگر دینو کی وردی نے دونوں کی عصمت بچالی۔ اور وہ اس کے لیے سراپا تشکر تھیں۔ اس لیے کبھی کبھار اس مینار پر فاتحہ خوانی کے لیے آتی تھیں۔ اور ایک دفعہ تو لڑکی بھی آئی تھی، مگر آج وہ عورت اکیلی تھی۔ اس کا خاوند جو ایک بڑے زمیندار کا مزارع تھا، پیچھے گھر میں تھا۔

یادگار کے پاس پہنچ کر اُس نے دوڑنا شروع کردیا۔ حالانکہ وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ جب وہ مینار کے پاس پہنچی تو اُبلتی ہوئی سسکیاں اس کے سینے میں طوفان مچارہی تھیں۔ زنجیر کی پروا کیے بغیر وہ پھلانگی اور قریباً لڑھکتی ہوئی چبوترے تک جا پہنچی۔ والہانہ طور پر اس نے اپنا چہرہ دینو کے نام پر رکھ دیا اور بازو پھیلا کر اوندھے منہ لیٹ گئی۔

پہلے دَبی گھُٹی سسکیاں اُبھریں، پھر ہچکیوں کا تار بندھ گیا جن سے اس کا سارا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ پھر چبوترے پر دونوں ہاتھ بیتابی سے پھیرتے ہوئے بولی۔ "دینو! تم کیوں مرے؟ اگر اب بھی ..... زمیندار ....." سسکیوں کے ریلے نے اُسے مزید نہ بولنے دیا۔ تب اس نے لپٹی ہوئی چادر ڈھیلی کی اور اپنی سولہ سالہ کنواری لڑکی کی خون آلود شلوار دینو کے نام پر رکھ دی۔ پھر وہ بلک بلک کر چیخیں مارنے لگی۔

ایک خون کی یادگار کو، دوسرا بالکل مختلف قسم کا خون، آنسوؤں میں گھُل گھُل کر بھگو رہا تھا۔

❋❋




سڑک کے کنارے عارضی کھمبے کھڑے کیے گئے جو لوہے کے پائپ کے تھے۔ یہ دو مزدوروں نے لگائے تھے۔ جب مزدوری لینے کے لیے اُنھوں نے رجسٹر میں انگوٹھے لگائے تو اُس صفحے پر پندرہ فرضی انگوٹھے بھی لگے تھے۔

جس بیل گاڑی میں یہ کھمبے لائے گئے تھے اُس کے گاڑی بان نے دس رُوپے کرایہ مقرر کیا تھا مگر رسید بیس روپے کی بنا کردی تھی۔ ادائیگی کرنے والے نے اُسے پانچ رُوپے فالتو دیے اور پانچ روپے اپنے کوٹ کی اندرُونی جیب میں ڈال لیے۔

جس دکان سے یہ پائپ لائے گئے تھے اُس کے پچھلے گودام میں لوہے کا اور بھی سامان تھا۔ مثلاً مشینوں کے پُرزے جو بڑی محتاط اسمگلنگ کے ذریعے وہاں پہنچے تھے۔

جس سڑک پر یہ کھمبے لگائے گئے تھے۔ جب وہاں سے جلُوس گزُرا تو تمام کھمبوں پر جھنڈے لہرا رہے تھے جن پر چاند تارے کا اِسلامی نشان تھا۔

# بازگشت

اسٹیسی آمانیر

شاہدہ پروین

آپ کسی مصنّف، مصوّر، سنگتراش، یا شاعر سے ملیں تو وہ اپنی کسی بھی تخلیق کے حوالے سے بہ آسانی خود کو متعارف کروا سکتا ہے۔ ”دیکھ لیجیے، یہ ہے میرا فن۔“

”بہت خوب! یہ یقیناً آنے والی نسلوں تک یادگار رہے گا۔“

لیکن ایک اداکار کے پاس اس قسم کی کوئی یادگار چیز نہیں ہوتی یادوں کے سوا۔ اداکاروں کے فن کی بقا کا انحصار محض اُن شائقین کی یادداشت پر ہوتا ہے جنھوں نے کبھی اُن کی اداکاری دیکھی ہو اور اُسے پسند کیا ہو۔ اگر کوئی شخص آپ سے کہے ”افسوس تم نے کلارک گیبل کی اداکاری نہیں دیکھی بڑے غضب کا فن کار ہے۔“

آپ شاید تکلفاً تو اُس کی بات تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جب تک آپ کلارک گیبل کو اداکاری کرتے ہوئے خود نہ دیکھ لیں یہ ستائش آپ پر کوئی ٹھوس تاثر قائم نہیں کرے گی۔

جب میں پہلی بار کولن برینکر سے مِلا تو یہ سارے خیالات میرے ذہن میں چکر لگانے لگے۔ یہ مُلاقات ایک لائبریری میں ہوئی تھی خمیدہ قامت ہونے کے باوجود اُس کی چال میں ایک وقار تھا۔ میں ہر دوسرے روز لائبریری جایا کرتا تھا اور اسے بھی تقریباً وہی رسالے اور کتابیں کھنگالنے میں مصروف پاتا تھا جنھیں پڑھنے کی خواہش مجھے یہاں کھینچ لاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک خاص کتاب کے سلسلے میں اُس سے بات چیت شروع ہوئی۔ اگرچہ یہ ملاقات دو چار جملوں کے تبادلے سے آگے نہ بڑھی، پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ضرور ہو گئے لیکن یہ تعارف بہت دنوں تک علیک سلیک تک ہی محدود رہا۔ اس کے بعد ایک روز اتفاق سے ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے اور مختلف باتیں کرتے ہوئے دُور تک اکٹھے چلتے رہے۔ اُس کی باتوں نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ سادہ اور شُستہ انداز، مہذّب لہجہ اور پُرلُطف باتیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور قطعی غیر اہم باتوں کا ذکر اس انداز سے کرتا کہ آدمی کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے مثلاً اگر وہ صرف یہ جملہ کہہ دے کہ ”آج تو موسم بہت خوشگوار ہے۔“ تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے چاروں طرف بہاریں رقصاں ہیں۔

ایک روز اُس نے مجھے اپنے ”غریب خانے“ پر مدعو کیا۔ اُس کا گھر ایک چھوٹی سی عمارت کی اوپری منزل پر تھا۔ وہ تنہا آدمی تھا۔ مگر ادھیڑ عمر کی ایک خادمہ، گھریلو کام کاج کے سلسلے میں وہیں رہا کرتی



تھی۔ کمرے چھوٹے لیکن آراستہ تھے۔ فرنیچر خاصا قیمتی تھا اور کمروں میں بے شمار آرائشی اشیا اور تصویریں موجود تھیں۔ مجھے اس اداکار پر رحم سا آیا۔ اگر وہ ایک مصور ہوتا تو میں اُس کی تصاویر دیکھ کر اُن کے متعلق رائے زنی کرتا اور اُس کے فنکارانہ مقام کا تعین کر سکتا تھا۔ لیکن ایک ایسے بوڑھے اداکار سے آپ اُس کے فن کے متعلق کیا گفتگو کر سکتے ہیں جس کی زندگی میں صرف ماضی ہو۔ یہ صورتحال کیسی افسوس ناک تھی۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے زمانے میں ضرور صفِ اوّل کا اداکار ہوگا لیکن میں تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اُس سے دریافت کر سکوں کہ اُس نے اپنی زندگی میں کون کونسے کردار ادا کیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہونی چاہیے تھی۔ وہ خود بھی یہ تفصیلات بتانے سے احتراز کرتا تھا لیکن مختلف آثار و قرائن سے کچھ کچھ عیاں ہوتا تھا کہ اُس نے اپنی فن کارانہ زندگی میں کس قسم کے کردار ادا کیے ہوں گے کمرے میں کئی ایسی تصویریں تھیں جن میں وہ شیکسپیئر کے مختلف کرداروں کا رُوپ دھارے کھڑا تھا۔ وہاں چند دوسرے مشہور ترین اداکاروں کی تصویریں بھی نظر آئیں۔ رفتہ رفتہ میں اُس کی گزشتہ زندگی کے چند پہلو محسوس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ تھیٹر کی دُنیا میں اُس کا کیا مرتبہ تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی اُس میں کم سے کم ایک شخص کو متاثر کر لینے کی بھرپور صلاحیت ضرور موجود تھی اور وہ ایک شخص میں تھا۔ اُس کے کمرے کی ہر شے یادوں کا مدفن نظر آتی تھی۔ مشہور زمانہ اداکار اور موسیقار ہینری ارونگ کی تصویر کے نیچے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ "بہت ہی پیارے دوست کولن برینکر کے لیے۔" میز پر ہاتھی دانت کا ایک سگار کیس رکھا تھا جو نیلی فیرن نے اُسے دیا تھا۔ جب وہ اپنی ماں کا ذکر کرتا تو اُس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو جاتی۔ اُسی سے معلوم ہوا کہ اُس کی ماں فرانس کی ایک مشہور اداکارہ تھی۔ پیانو پر ایک پنکھا رکھا تھا جو فرانس کی ملکہ یوجین نے دیا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے اُس سے اتنی اُنسیت ہو گئی کہ میں ہر جمعرات کو اس کے گھر جانے لگا جمعرات کو میری بیوی اپنی ایک اپاہج خالہ سے ملنے چلی جایا کرتی تھی اس لیے میں بے فکری اور فرصت کے ساتھ کولن سے ملتا اور گھنٹوں اُس کی پُرلطف باتیں سُنتا رہتا۔ اُس کے کمرے میں پڑی ہوئی کوئی شے چھونے کی دیر تھی کہ وہ اس شے سے وابستہ کہانی شروع کر دیتا۔ اُس کا اندازِ بیان اتنا مسحور کُن تھا کہ میں تصور ہی تصور میں اُس کے ساتھ اسی ماحول میں پہنچ جاتا تھا۔ مجھے مختلف اداکار مختلف بہروپوں میں نظر آتے۔ قہقہے لگاتے ہوئے آنسو بہاتے ہوئے کام کرتے ہوئے، عشق کرتے ہوئے اور پھر وہ تصویر میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ اس کا کوئی آغاز کوئی انجام نہیں تھا۔ یہ تو بس ایک تاثر تھا۔ ایک تصویر ہٹتی تو دوسری آموجود ہوتی۔

کچھ عرصے بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ میں اور میری بیوی ایلس اکثر اُسے تحائف بھیجا کرتے۔ یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ ایلس عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی ہے۔ اُس کا اندازِ نظر تنقیدی نہیں بلکہ تفریحی ہے وہ ہر چیز میں تفریح کا عنصر تلاش کر لیتی ہے اور کیوں نہ کرے، بہرحال وہ ایک نوجوان، خوبصورت اور زندگی سے بھرپور عورت ہے وہ تحفے تحائف بھیجنے کے باوجود کولن برینکر سے کبھی ملی نہیں تھی لیکن ایک روز حسنِ اتفاق سے ہم تینوں ٹالبوٹ روڈ کے چوراہے پر یکجا ہو گئے۔ اُس روز میں نے اپنے ہیرو کا ایک اور رُخ دیکھا۔ اُس نے بڑے خوبصورت انداز میں ایلس کو سلام کیا۔ جب میں نے دونوں کا تعارف کرایا تو اُس نے ایلس کا ہاتھ تھام لیا اور نہایت دھیمے لہجے میں بولا "مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے"

ممکن ہے پڑھتے وقت یہ جملہ کوئی خاص تاثر نہ چھوڑے لیکن ایلس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا تھا۔

اب وہ بھی اکثر اُس سے ملنے چلی جاتی۔ ہم دونوں نے اُس کے گھر کا گوشہ گوشہ چھان مارا تھا۔ میزوں کی تلاشی لے ڈالی تھی کہ کوئی ایسی شے نہ رہ جائے جس کے متعلق کوئی پُرلطف کہانی موجود ہو۔ میں یہ اعتراف کر لوں کہ میں جنون کی حد تک ان کہانیوں کا شائق ہو چکا تھا۔

ایک روز میں کسی ایسی ہی شے کی تلاش میں اُس کے گھر کا معائنہ کرتا پھر رہا تھا کہ مجھے گیلری کی میز پر ایک سفید فراک رکھا ہوا نظر آیا۔ میں فراک اُٹھا کر فوراً اُس کمرے میں پہنچا جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے مسٹر برینکر؟"

اُس نے فراک کی طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر کچھ عجیب و غریب تاثرات پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے تو اُس کی آنکھوں میں حیرت اور اُلجھن نظر آئی، پھر ناگواری سے اُس کی بھویں تن گئیں مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ میں حیران ہو کر اُس کے

قریب گیا اور اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "آپ کچھ پریشان ہو گئے، مجھے یقین ہے کہ اس فراک سے کوئی دردناک قصہ وابستہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ ....."

اُس نے فوراً میرا ہاتھ دبایا "نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن میں وہ قصہ آج نہیں سُنا سکوں گا۔" وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں نے بھی اُسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر وہ اچانک میری طرف مڑا اور بولا۔ "کل آنا، ایلس کو بھی ساتھ لانا۔ میری طرف سے تم دونوں کل رات کے کھانے پر مدعو ہو۔ پھر میں تمہیں سفید فراک کی کہانی سناؤں گا۔"

اگلے روز ایلس کو ایک تقریب میں شریک ہونا تھا لیکن وہ تو برینگر کی دعوت کا سُن کر اُچھل پڑی۔ میں بہت پریشان ہوا کیونکہ ایلس ایک اعلا خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور صرف پُرتکلف امیرانہ دعوتوں میں شرکت کی عادی تھی۔ میں نے سوچا بیچارہ برینگر بھلا اپنے چھوٹے سے گھر میں ایلس کی کیا دعوت کر سکے گا۔ میں نے ایلس کے سامنے تجویز رکھی کہ ہم دونوں کوئی معمولی سا لباس پہن لیتے ہیں اور جانے سے پہلے تھوڑا سا کھانا بھی کھا لیتے ہیں لیکن ایلس نہ مانی اور اُس نے سبز موتیوں والا گاؤن پہن لیا۔ میں بہرحال اپنے سادہ سوٹ میں تھا۔

اُس روز میں نے برینگر کا ایک اور رُخ دیکھا۔ وہ بے حد نفیس ڈنر سُوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کمرہ آج نئے انداز سے سجایا گیا تھا اور کھانے کی میز پر ننھے ننھے قمقمے روشن تھے۔ میں نے اُس سے معذرت کی کہ میں نے ڈنر سُوٹ نہیں پہنا۔ اس پر اُس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ وہ میری اس سادگی اور غیر رسمی انداز کی شرکت پر بے حد مسرور ہے۔ لیکن میں ایک حسّاس آدمی ہوں اس لیے غیر موزوں لباس مجھے گرد و پیش سے لُطف اندوز نہیں ہونے دیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں بے کیف سا رہا۔ مگر ایلس اور وہ خوب باتیں کرتے رہے۔ بوڑھا اداکار اُس روز بڑے اچھے موڈ میں تھا اور ایلس بھی اُس کے فقروں پر دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ میں خود کو اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔

اور جب کھانا شروع ہوا تو میری حیرت دوچند ہو گئی۔ تمام چیزیں نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ تھیں۔ چاندی کے برتن اور بلّوریں گلاس، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم کسی نواب کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوں۔

کھانے کے بعد ہم آتشدان کے قریب چلے گئے، صوفے کی پشت پر وہی سفید فراک پھیلا ہوا تھا۔ برینگر کے ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس تھا اور وہ کسی خیالی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ اُس زمانے کا قصہ ہے جب اداکار صحیح معنوں میں فنکار ہوا کرتے تھے۔ میں ایک مشہور تھیٹریکل کمپنی، چارلس کارسائڈ کمپنی سے وابستہ تھا۔ ہم ہر روز اپنے کردار تبدیل کر لیتے تھے۔ میں اور اوبین روزانہ ایک دوسرے کے کردار آپس میں بدل لیا کرتے تھے۔ اوبین میرا دوست ..."

وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھ دیکھنے لگا۔ ہم دونوں منتظر رہے۔ "جب میں کہتا ہوں کہ اوبین میرا دوست، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں میں ایسی دوستی تھی جو صرف دو فنکاروں میں ہو سکتی ہے۔ ہم نے تین سال ایک ساتھ کام کیا تھا لیکن کبھی ہمارے درمیان پیشہ ورانہ چشمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آہ، وہ بھی کیا دن تھے۔"

وہ پھر خاموش ہو کر اپنی لانبی سفید انگلیاں دیکھنے لگا، پھر ایلس سے مخاطب ہو کر بولا "اور یہ بات میں خاص طور پر آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہوں۔ میری جوانی کے زمانے میں محبّت کا مفہوم ہی کچھ اور تھا لیکن آجکل کے جدید عہد میں تو محبّت سراسر موقع پرستی اور کاروبار کا نام ہے۔ کوئی شخص ایثار کرنے اور خطرات مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میری اور اوبین کی رفاقت مثالی تھی۔ ہماری محبّت کا چرچا ہر طرف تھا لیکن پھر اس شیرینی میں تھوڑی سی تلخی اُس وقت شامل ہو گئی جب سونیا ہماری کمپنی میں آئی۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی آواز لرز رہی تھی اور وہ شاید اپنے جذبات چھپانا چاہتا تھا۔ اُس کی نظریں بدستور ایلس پر مرکوز تھیں "سونیا اتنی ہی خوبصورت اور نازک تھی جتنی آپ ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بہت سی چیزیں الفاظ کا روپ دھارے بغیر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ میں نے اور اوبین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم سمجھ گئے، ہم نے اپنی زبانوں سے کچھ نہیں کہا۔ ہم نے سونیا کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم ایک دوسرے کے احساسات کے بارے میں متردّد تھے لیکن سونیا کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے اوبین کے جذبات کا پاس نہ ہوتا تو میں سونیا سے اظہارِ محبّت کر چکا ہوتا۔ صرف دو مہینے گزرے تھے کہ یہ ڈراما نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ ایک روز میں نے اوبین کی نگاہوں میں پیاس دیکھی، وہ سونیا کے کمرے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں ضبط نہ کر سکا اور اُس کے قریب جا کر بولا۔ "جاؤ، وہ تمہاری

منتظر ہے۔ تبھی اس کی محبت کے اہل ہوؤ۔" وہ سمجھ گیا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا "تم صحیح کہتے ہو کولی! یہ اضطراب اب برداشت نہیں ہوتا۔ شو کے اختتام پر تم میرے کمرے میں آجانا۔"

بوڑھے اداکار کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں اس ملاقات کی تفصیل بتانے سے قاصر ہوں جو شو کے بعد اوبین کے کمرے میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایثار کرنا چاہتے تھے۔ یہ مراحل بڑے تکلیف دہ تھے۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ فال نکالی جائے۔ سکہ اُچھالنا یا اسی قسم کا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا تو ایک طرح کی حماقت تھا۔ ہم نے شطرنج کی بساط بچھائی۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جیتنے کا موقع دے رہے ہیں۔ چھوڑو اسے! میں اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے گلدان میں لگا ہوا ایک پھول نکال لیا۔ اوبین اگر اس پھول میں طاق پنکھڑیاں ہوں گی تو سونیا تمہاری ہے اور اگر جفت ہوئیں تو میری، وہ راضی ہو گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ پھول کی پنکھڑیاں الگ کر دیں۔ جب آخری پنکھڑی ہاتھ میں آئی تو تعداد جفت تھی۔ اوبین کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ لڑکھڑانے لگا۔ میں نے اُسے سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔

دوسری صبح میں سونیا کے سامنے موجود تھا۔ میں نے اپنا کلیجا نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے دو مہینوں کے ایک ایک جانگداز لمحے کی تفصیل اُس سے بیان کر دی لیکن اُس نے مجھے مسترد کر دیا۔ نہیں اُس نے کلی طور پر مجھے مسترد نہیں کیا تھا، اس نے بڑی ہمدردی سے میری داستان سُنی تھی لیکن اُس کے انداز میں اتنی بے نیازی تھی کہ میرا دل ٹوٹ گیا۔ اس عمر میں یہی عالم ہوتا ہے۔ انسان ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ میں ایک ہفتے تک دن رات سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا رہا لیکن اُس کی بے نیازی کا عالم نہیں بدلا۔ آخر میں نے اوبین سے کہہ دیا کہ اب اُس کی باری ہے۔ اب ایک ہفتہ اُس کا تھا۔ آج بھی میں اپنی اُس کیفیت کا تصور کرتا ہوں جو اُس ایک ہفتے میں مجھ پر طاری رہی تھی تو بے قرار ہو جاتا ہوں۔ میرا عزیز ترین دوست میری محبوبہ سے اظہارِ عشق کر رہا تھا۔ ہفتے کے اختتام پر وہ میرے پاس آیا اور بولا۔ "سونیا مجھے پسند تو کرتی ہے لیکن محبت نہیں کرتی۔ ہم ساری رات سونیا کے متعلق دل نشین اور دل گداز گفتگو کرتے رہے اور ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ اب جنگ کھلے میدان میں ہونا چاہیے۔ جسے بھی موقع ملے وہ سونیا سے گفتگو کرے اور اس میں کسی قسم کی رنجش یا تلخی درمیان میں نہ آنے پائے۔ تین مہینے اور گزر گئے۔ مجھے اوبین کی فتح کا یقین ہوتا جا رہا تھا۔ سونیا اپنا زیادہ وقت اُسی کے ساتھ گزارتی تھی۔ میں ہر لمحے کسی اندوہناک اطلاع کا منتظر رہتا تھا لیکن پھر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔"

بریکر دم لینے کے لیے رُکا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں اُس کے سفید لیکن بے حد گھنے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ "اوبین کے چچا کا انتقال ہو گیا اور اوبین ان کی وسیع و عریض جائداد کا تنہا مالک قرار پایا۔ اُس کی دولت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ کمپنی کے سب لوگ بہت خوش تھے، ایک فرد کے سوا۔"

وہ پھر رُکا اور ایلیس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "میں آج تک عورت کے دل کی گہرائیاں نہیں پا سکا۔ عجب پُراسرار سی شے ہے سونیا نے اوبین کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تاکہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اُس نے اوبین سے دولت کی وجہ سے شادی کی ہے۔ میں الگ کشمکش میں گرفتار تھا۔ ایک طرف اوبین کی محبت تھی۔ دوسری طرف سونیا کی کشش۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اوبین کی دولت اُس کے لیے زہر ثابت ہوئی۔ جب ہم لندن آئے تو اُس نے بے تحاشا پیسہ لُٹانا شروع کر دیا۔ وہ خوب شراب پیتا اور دھڑلے سے جوا کھیلتا۔ موسم بہار میں اُس نے کمپنی سے علیحدگی اختیار کر لی اور لندن کے نواح میں ایک خوبصورت گھر خرید کر رہنے لگا۔ دُنیا بھر کے لُچّے لفنگے وہاں جمع رہتے۔ بے شمار لڑکیاں اُس سے شادی کی خواہش مند تھیں اور آخر اُس نے ایک بے حد تیز طرار عورت اینابل سے شادی کر لی جو فوٹوگرافر تھی۔ ایک سال بعد اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔"

آتشدان میں لکڑیاں چٹخنے کی آواز آئی۔ ایلیس ٹکٹکی باندھے بوڑھے اداکار کو دیکھے جا رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "اور پھر میں نے عورت کے کردار کا ایک عجیب رُخ دیکھا۔ سونیا جو اوبین سے اُس کی دولت کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اور جو اینابل سے چڑتی تھی۔ اُس کی بچی لوسی پر فریفتہ ہو گئی۔ اب اُس کے اِرد گرد صرف میں تھا۔ میں بڑے صبر اور استقامت سے اُس کا دل جیتنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ میں دس سال تک اُس کے ساتھ غلاموں کی طرح لگا رہا لیکن وہ نہ پسیجی اور ننھی لوسی کی کنیز بنی رہی۔ لوسی کی وجہ سے وہ اسی شہر

میں رہنا چاہتی تھی لہٰذا میں بھی اُس کے ساتھ ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں شامل ہوتا رہا۔ اب میں ہر قسم کا کردار ادا کرنے پر مجبور تھا کبھی کبھی تو مجھے محض دو منٹ کا کردار ملتا اور میں اُسے بھی غنیمت سمجھتا لیکن اس پر بھی سوینا مجھ سے بے نیاز ہی رہی۔ وہ اپنی ساری آمدنی لوسی کے لیے کھلونے اور دیگر تحائف خریدنے میں صَرف کرتی اور میں اُس کے احکام کی تعمیل میں اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا۔ بھلا یہ ماننے والی بات ہے۔"

اور اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایلس نے کہا۔"کیوں نہیں؟"

وہ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔"ہاں! جب کسی معاملے میں مرد و عورت فریق ہوں تو مرد ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے، اور تو اور سوینا نے اینابل سے بھی دوستی کر لی۔ وہ اُسے پیارے پیارے خطوط لکھا کرتی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اوبین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں غرق رہتا۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلتی چند گھونٹ مزید چڑھا لیتا۔ ایک روز اُس نے اندھیرے میں دھوکے سے امونیا پی لی۔ جو اُس کی فوٹوگرافر بیوی استعمال کرتی تھی۔ امونیا پیتے ہی وہ کپڑے پھاڑتا ہوا سڑک پر نکل گیا۔ سڑک کے ایک کونے پر اُس کی رُوح ہمیشہ کے لیے اُس سے جُدا ہو گئی۔"

برینکر کے چہرے پر اس اندوہناک واقعے کا تاثر پوری شدّت سے موجود تھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کی جھلملاہٹ سے چمک رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ بالکل خاموش بیٹھا آگ کے شعلے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔"یہ میری زندگی کا بہترین دَور تھا، میری صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ اسی دوران میرے دوست جم نے مجھے لندن میں ایک بڑے اچھے کردار کے لیے بلوایا لیکن میں شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ سوینا کی لوسی سے محبّت روز افزوں تھی۔ اینابل کا برتاؤ بچّی کے ساتھ بالکل مختلف تھا۔ وہ کبھی تو اُسے بیش قیمت لباس اور کھلونے خرید کر دیتی اور کبھی ذرا سی بات پر بے تحاشا مارنے لگتی۔ سوینا کو بھی اس کا علم تھا۔ وہ اکثر اینابل کو سمجھاتی لیکن اُس کے سمجھانے کا اثر دیرپا نہیں ہوتا تھا۔ نتیجتاً لوسی ہو بہو اپنی ماں کی تصویر بن گئی۔ دس سال کی عمر میں اُسے فیشن کے سوا کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اُسے اپنی خوبصورتی کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ گھر میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے اور وہ ان سب کے درمیان بیٹھ کر اُلٹی سیدھی باتیں سُنا کرتی تھی۔"

برینکر نے رُک کر پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ جذبات کا دباؤ اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ تکلیف دہ واقعات کی یاد بھی اتنی ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ ہماری موجودگی سے بے خبر اپنے ماضی میں گم تھا اور گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔"میرے پاس ایسے کئی فراک ہیں جو سوینا نے ننھی لوسی کے لیے تیار کیے تھے اگر کسی شام وقت ملے تو آیئے گا میں آپ کو دکھاؤں گا۔" اُس نے ایلس سے مخاطب ہو کر کہا۔ اُس کی آواز میں بڑا اشتیاق تھا جیسے یہ اُس کی سب سے بڑی خواہش ہو۔ میرا دل اُس کے لیے رو رہا تھا لیکن خلافِ توقع ایلس کچھ نہ بولی۔ وہ اُسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اُس کا جائزہ لے رہی تھی، وہ کچھ جھجکا اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔"فراک! بڑے خوبصورت فراک سوینا انھیں اپنے ہاتھوں سے سیا کرتی تھی۔ لوسی کو یہ فراک بہت پسند آتے تھے۔ میری زندگی کا تاریک ترین باب بھی ایک فراک ہی سے شروع ہوا تھا۔ لوسی کی دسویں سالگرہ ایک نیا ہنگامہ ساتھ لائی۔ ایک شرابی نواب سے اینابل کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ لوسی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اُس نے بھی جی بھر کے اُسے بگاڑا۔ اپنے ساتھ رقص کے لیے لے جاتا بلکہ میں نے تو یہاں تک سُنا تھا کہ وہ میک اپ بھی کرنے لگی تھی۔ لوسی کے قریب ایک اور خاندان رہتا تھا۔ یہ لوگ بھی بہت متموّل تھے اور انھوں نے بھی اپنے بچّوں کو غلط تربیت دی تھی۔ ان کے ہاں آئے دن تقریبات ہوتیں اور بچّوں کو نمائشی ملبوسات پہنا کر مقابلہ کیا جاتا۔ یہ دیکھ دیکھ کر میرا خون کھولتا تھا۔ سوینا کی لوسی سے محبّت مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی لیکن بہرحال وہ میرے مرحوم دوست کی نشانی تھی۔

اُس سال مجھے اور سوینا کو کمپنی کے ساتھ دورے پر جانا پڑا۔ سوینا ہیروئن تھی اور میں محض خانساماں۔ یہ دورہ بڑا تھکا دینے والا تھا کیونکہ موسم بہت ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ سوینا کو پہلے تو زبردست زکام ہوا اور پھر نمونیا ہو گیا۔ وہ مرتے مرتے بچی۔ دس روز تک بستر پر پڑی رہی لیکن اُس نے اصرار کر کے پھر اسٹیج پر آنا شروع کر دیا۔ دورے کے اختتام میں چند روز باقی تھے کہ لوسی کا خط موصول ہوا۔ مجھے آج بھی اس خط کے الفاظ یاد ہیں۔"اچھی آنٹی! کرسمس کی شام کو پڑوسیوں کے ہاں پارٹی ہے۔ آپ میرے لیے ایک بہت اچھی سی فراک تیار کر دیجیے اینابل اس روز سنہرا اور سبز چمکدار فراک پہنے گی۔ آپ کی لوسی۔"

سونیا یہ خط پڑھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ دوسروں کے کام کر کے ہمیشہ بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ ایک ہفتے تک تو وہ فراک کا ڈیزائن سوچتی رہی۔ ایسا فراک جو لوسی کو سب سے ممتاز کر دے، اور پھر ایک روز وہ میرے کمرے میں آئی اور میرا بازو تھام کر بولی۔ "میری سمجھ میں آ گیا۔ میں ایسا فراک تیار کروں گی جو سب سے علیحدہ دکھائی دے گا اور یہ بالکل سادہ اور سفید ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ پڑوسی بڑے نمائشی اور پست ذوق کے لوگ ہیں۔ گہرے گہرے رنگوں اور جھلملاتے ہوئے کپڑوں میں لوسی کی سادگی نمایاں نظر آئے گی اور اس طرح شاید لوسی بھی یہ نکتہ سمجھ لے کہ خوش ذوقی اور نفاست ہمیشہ قابلِ ستائش ہوتی ہے، میں نے سونیا کے خیال کی تعریف کی اور پھر ہم کپڑا خریدنے بازار گئے۔ لیکن اُس روز سونیا بازار میں بے ہوش ہو گئی۔ اُس کی صحت بہت گر گئی تھی پتہ نہیں وہ کس طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اُسے یہ فکر بھی تھی کہ لوسی کا فراک بروقت اُسے مل جانا چاہیے۔ ہم کرسمس کی شام پانچ بجے لندن پہنچے۔ میری حالت قابلِ دید تھی۔ سونیا کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند لمحوں کی مہمان ہے۔ میں اُس کی طرف سے اتنا فکر مند تھا کہ میں نے لندن میں پہلے سے قیام کا بندوبست بھی نہیں کیا تھا لیکن اُس وقت میرا ایک پرانا دوست کام آیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے ایک چھوٹے سے ہوٹل کا پتہ بتایا کہ وہاں یقیناً جگہ مل جائے گی۔ اسٹیشن سے ہم نے ٹیکسی لی، میرا دوست بھی ساتھ تھا۔ میں نے راستہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کمرہ ملتے ہی ہم نے سونیا کو بستر پر لٹا دیا لیکن ابھی چند ٹانکے باقی رہ گئے تھے سونیا کی آنکھیں رہ رہ کر بند ہو جاتیں لیکن وہ ہڑبڑا کر اٹھتی اور پھر سلائی میں مصروف ہو جاتی باہر برف باری شروع ہو گئی تھی، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

کولن برینکر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے سفید فراک اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہ بدستور ماضی میں کھویا ہوا تھا۔ "سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں فراک لیے ہوٹل سے نکلا، ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو برق رفتاری سے گاڑی چلانے کی ہدایت کر کے سیٹ میں دھنس گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ فاصلہ کیسے طے ہوا۔ میں دیوانہ وار گھر میں داخل ہوا اور فراک لوسی کے سامنے رکھ دی۔ وہ اپنے بال بنانے میں مشغول تھی مجھے دیکھتے ہی کِھل اٹھی۔ "میں تو سمجھی تھی آنٹی مجھے بھول گئیں۔"

"میں نے جلدی سے کہا۔ تمہاری آنٹی نے تو اس فراک کے لیے اپنی زندگی کی پروا نہیں کی۔"

"یہ فراک"۔ لوسی نے فراک اٹھایا اور پھر بولی۔ "یہ کیسا فراک ہے۔ بالکل دقیانوسی"۔ یہ کہہ کر اُس نے فراک فرش پر پھینک دیا۔ میرا جی چاہا کہ اُسے ایک تھپڑ لگاؤں لیکن پھر مجھے خیال آ گیا کہ وہ اوبین کی بیٹی ہے میرے مرحوم دوست اوبین کی بیٹی۔ بہرحال میں اپنے غصّے پر قابو نہ پا سکا۔ "احسان فراموش لڑکی تم اپنی آنٹی کو مار ڈالنا چاہتی ہو؟" اُس نے غصّے سے سر جھٹکا اور نوکر کو بلوانے کے لیے گھنٹی بجانے ہی والی تھی کہ میں فراک اٹھا کر باہر نکل آیا۔ برف اب بھی گر رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ راہگیر مجھے گھور رہے تھے لیکن مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں سونیا کا سامنا کس طرح کروں گا پھر مجھے سونیا کا خیال آیا۔ اُس کی حالت تشویشناک تھی۔ پتہ نہیں اب وہ کیسی ہے۔ اگر وہ میرے پہنچنے سے پہلے مر گئی تو یہ احساس ساتھ لے جائے گی کہ اُس کا تیار کردہ فراک لوسی نے بڑے چاؤ سے پہنا ہوگا۔ اُس کی زندگی کے آخری لمحات مسرت اور سکون سے بسر ہوں گے لیکن اُس کی سوچ میں میرے لیے کہیں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی اُس کے لیے تج دی تھی اور وہ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کون جانے ۔ ۔ ۔ کون جانے؟"

وہ سسکیاں لینے لگا۔ مجھ میں ایلیس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ کمرے میں بے پناہ سکوت طاری تھا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر کی خادمہ اندر آ گئی۔ اس وقت اُس کا وجود بڑا غیر حقیقی سا معلوم ہو رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا"۔ وہ بولی۔

بوڑھے اداکار نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ فراک سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں نے اپنی بھانجی کے لیے ایک سفید فراک سِیا تھا وہ نہیں مل رہا ہے۔ ارے؟ ۔ ۔ ۔ لائیے مجھے دے دیجیے ۔ ۔ ۔ شکریہ ۔ ۔ ۔"



میں اور ایلیس سونے کے لیے لیٹے تو اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ ہنری ارونگ کی تصویر پر اُسی کی اپنی تحریر ہے ۔ ۔ ۔ ؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

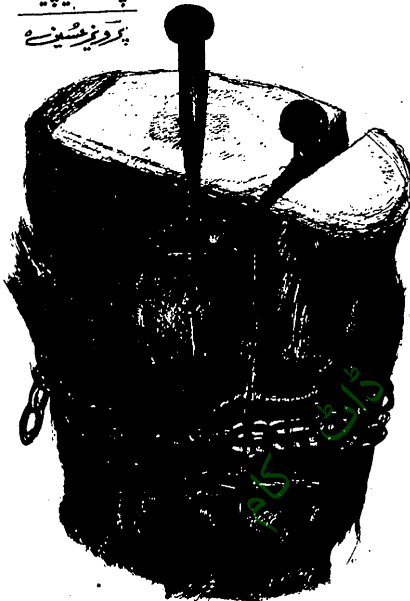
"کچھ نہیں۔ عورتیں مردوں سے زیادہ عقل مند ہوتی ہیں۔"

عظیم امریکہ کی ایک کہانی

دوسری کہانی



چارلس ڈبلیو چینٹ
پرویز حسین






کی بستی میں شاذونادر ہی کوئی قتل ہوا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ وہاں گزشتہ پچاس برس کی مدت میں اگر قتل کی اکا دکا وارداتیں ہوئی ہیں تو کوئی بھی عمر رسیدہ شخص آپ کو ان کا احوال پوری تفصیل سے سنا دے گا۔یہی نہیں بلکہ اسے یہ تک یاد ہوگا کہ کس واردات میں قاتل کو سزا ملی کس مقدمے میں وہ رہا ہو گیا یا کس موقع پر قاتل فرار ہو گیا۔چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب بستی میں بوڑھے ریٹائرڈ کیپٹن واکر کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تو ہر گھر اور ہر محفل میں لوگ دانتوں میں انگلیاں دے دے کر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

ابتدائی تفتیش سے یہ ظاہر ہوا کہ وقوعے کے روز یعنی جمعے کی صبح ایک سیاہ فام اجنبی شخص کو بستی سے نکل کر جاتا ہوا دیکھا گیا تھا بعض دوسری وجوہ کی بنا پر بھی یہ شک پایا جا رہا تھا کہ وہ اجنبی ضرور اس جرم میں ملوث ہے۔چنانچہ انسپکٹر جارج نے اپنے دو مددگاروں کو اس شخص کے تعاقب میں دوڑا دیا جو شام گئے بڑی مشکلوں سے اسے گرفتار کر کے لانے میں کامیاب ہو گئے۔انسپکٹر جارج نے اسے فوری طور پر آبادی سے دور مقامی قید خانے میں بند کر دیا۔

صبح سویرے بستی کے لوگوں میں اس سیاہ فام شخص کی گرفتاری کی خبر بھی عام ہو گئی۔لوگوں کی ایک بڑی تعداد جو پوری کی پوری سفید فام باشندوں پر مشتمل تھی،متوفی کیپٹن واکر کے گھر لواحقین سے تعزیت کے لیے جمع ہو گئی اور ان میں سے ہر ایک کی زبان پر متوفی کی خوبیوں کا ذکر تھا اور ہر شخص اس سفاک قاتل کو جلد از جلد پھانسی پر چڑھانے کی رائے دے رہا تھا۔

اسی شام ایک نجی محفل میں چند انتہا پسند سفید فام گفتگو کر رہے تھے، کسی نے کہا۔"میں نے سنا ہے کہ جج ہملٹن کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے عدالتی کارروائی اگلے ہفتے سے قبل شروع نہ ہو سکے گی" محفل میں موجود تمام افراد کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

"میں تو ہمیشہ سے ان رسمی کارروائیوں کے خلاف ہوں، اگر کسی نے قتل کیا ہے تو اسے پھانسی پر چڑھانے میں دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیئے" دوسرے نے رائے دی۔"ان کالوں نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔"

لوگوں کے اشتعال اور نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ہر شخص اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں مصروف تھا۔"اگر ان لوگوں نے تمام اچھے سفید فام لوگوں کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر ہمیں بھی جوابی کارروائی کرنی پڑے گی۔آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ ان حالات میں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔"

تھوڑی ہی دیر میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس نیگرو کو کسی عدالتی کارروائی سے پہلے ہی پھانسی دے دی جائے۔ ان لوگوں کو قانون کی بالادستی اور شہری حقوق جیسے معاملوں کا پورا علم تھا مگر اس وقت ان کی آنکھوں

پر تعصب کا پردہ پڑ گیا تھا اور انھیں صرف ایک ہی بات کا احساس تھا کہ ایک سفید فام آدمی ایک نیگرو کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔

"آنجہانی کیپٹن کی رُوح کو یہ جان کر سکون ملے گا کہ کسی تاخیر کے بغیر اس کے قاتل کا کورٹ مارشل کر دیا گیا ہے۔" کسی نے ازراہِ مذاق کہا۔ مگر اب واقعی یہ طے پا گیا تھا کہ ملزم کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام لوگ اسی روز شام کے پانچ بجے دوبارہ اکٹھا ہوں اور وہاں سے قید خانے کا رُخ کریں۔ اس فیصلے کے بعد محفل برخاست ہو گئی اور ان میں سے کچھ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور کچھ لوگ "کورٹ مارشل" کی تیاریوں کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

پانچ بجنے میں بیس منٹ باقی ہوں گے کہ ایک نیگرو لڑکا ہانپتا کانپتا جیل کے قرب میں واقع انسپکٹر مچاسچ کے گھر پہنچا اور اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"کیا بات ہے سیم؟" انسپکٹر نے نیگرو لڑکے کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔

"انسپکٹر، وہ لوگ تمھارے قیدی کو پھانسی دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں اناج کے ایک گودام میں بوریوں پر لیٹا ہوا تھا کہ ان لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا اور بھاگا بھاگا تمھیں اطلاع دینے آ گیا۔"

"کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟ ان کے نام بتا سکتے ہو؟"

"ڈاکٹر کینیل، مسٹر سوران اور مسٹر میکڈانلڈ وغیرہ۔"

"بہت بہت شکریہ سیم!" انسپکٹر نے آہستہ سے کہا۔ اُس کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔ "کوئی بھی میرے قیدی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا..... مگر وہ لوگ کتنے ہیں؟"

"مجھے خود معلوم نہیں، مگر اتنا جانتا ہوں کہ وہ لوگ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہوں گے، اس لیے تم مجھے اپنے مکان کے عقبی دروازے سے جانے کی اجازت دے دو۔"

سیم کے جاتے ہی انسپکٹر اپنے کمرے میں گیا۔ بندوق اور ریوالور میں گولیاں بھریں اور جیبوں میں بھی گولیاں بھر لیں۔ اسی وقت اُس کی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی۔ "ابا، تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں قید خانے کی طرف جا رہا ہوں۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "مشتعل لوگوں کا ایک گروہ وہاں سے قیدی کو چھڑا کر خود ہی پھانسی دینے کا ارادہ رکھتا ہے مگر میرے ہوتے ہوئے ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"ابا، خدا کے لیے مت جاؤ!" بیٹی نے منّت کی۔ "وہ لوگ تمھیں بھی گولی مار دیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو بیٹی، میں اپنی اور اپنے قیدی کی بخوبی حفاظت کر سکتا ہوں۔ ابھی اس بستی میں کوئی ایسا مائی کا لال پیدا نہیں ہوا جو مجھے گولی مار سکے۔" انسپکٹر نے اپنی بیٹی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ "آخر میں اپنا فرض ادا کرنے کے لیے موت کا خطرہ مول لینے سے کیوں ڈروں... تم گھر اندر سے بند رکھنا اور ضرورت پڑے تو میری خواب گاہ میں رکھی ہوئی پرانی بندوق استعمال کرنے سے نہ ہچکچانا۔" اس کی بیٹی زیادہ بحث نہ کر سکی اور اُس نے چپ چاپ اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

انسپکٹر خاندانی اعتبار سے علاقے کے معزز لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اُس نے اسٹیٹ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور مسلسل مطالعے کی وجہ سے دنیا میں آئے دن رونما ہونے والے واقعات اور جدید خیالات سے بخوبی واقف تھا۔ وہ انسانی حقوق اور قانون کی بالادستی کا زبردست حامی تھا۔ سخت قسم کا اصول پرست ہونے کی وجہ سے وہ عوام کے ہر طبقے میں بے حد مقبول تھا۔ بستی کی آبادی بہت کم تھی، وہاں عموماً پولیس فورس یا سپاہیوں کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، ہنگامی حالات میں علاقے کے چند نوجوان ہی انسپکٹر کی مدد کو پہنچ جایا کرتے تھے، یہ نوجوان، انسپکٹر کے مدّاحوں میں سے تھے۔

انسپکٹر نے قید خانے میں داخل ہو کر بھاری بھرکم دروازہ بند کر لیا اور باہر کی طرف دیکھا۔ اُسے بہت سے گھڑسوار اپنے گھر کے سامنے رکتے دکھائی دیے۔ اُس کی بیٹی نے برآمدے ہی میں سے کوئی بات کی اور جیل کی طرف اشارہ کر دیا۔ گھڑسوار قید خانے کی طرف آ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" انسپکٹر نے اندر ہی سے پوچھا۔

"ہم تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں انسپکٹر!" وہ شخص غالباً گروہ کا سربراہ تھا۔ انسپکٹر نے دروازے میں بنی ہوئی بہت چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور کہا۔ "کہو کیا کہنا ہے، میں تم میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ بھلا تم لوگوں کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"ہم تمام شہریوں کے نمائندے ہیں اور جیل میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔"

"کس لیے؟ جیل میں داخل ہونا تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر لوگ اس سے باہر رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔"

وہ لوگ اس وقت کسی لطیفے سے محظوظ ہونے کے موڈ میں نہیں تھے انسپکٹر کا یہ جملہ انھیں بہت ناگوار گزرا۔ "ہم لوگ اس نیگرو سے بات کرنا چاہتے

ہیں جس نے کیپٹن واکر کو قتل کیا ہے۔"

"اُسے عدالت میں لایا جائے گا تم لوگ وہاں اُس سے بات کر سکتے ہو آیندہ ہفتے عدالت کا اجلاس ہونے والا ہے صرف چند دن اور انتظار کر لو میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو مگر کان کھول کر سن لو کہ کوئی شخص میرے قیدی کو چھو بھی نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر نے اپنا لہجہ تبدیل کر دیا "تم لوگ میرے پیٹ پر لات مارنے کے چکر میں کیوں ہو؟ میری روزی کیوں چھیننا چاہتے ہو؟ اس وقت قید خانے میں یہی ایک قیدی ہے اور مجھے اس کی نگرانی کے لیے پچھتر سینٹ یومیہ ملتے ہیں، صرف تم لوگوں کی خوشنودی کی خاطر میں اپنے گھر والوں کو بھوکا تو نہیں مار سکتا۔"

مجمع میں سے دو تین نوجوان اس بات پر ہنس دیتے کہ انسپکٹر محض پچھتر سینٹ یومیہ کمانے کے لیے یہ ملازمت کر رہا ہے کیونکہ وہ اُس کی نجی جائیداد اور دولت مندی سے بخوبی واقف تھے۔ "اگر تم نے ہمیں اندر نہ آنے دیا تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔" ایک شخص چلایا۔

"جس کا دل چاہے وہ دروازہ توڑ دے۔" انسپکٹر نے بلند آواز سے کہا "مگر ایک بات سن لے کہ جو شخص بھی یہ کوشش کرے گا اُسے اپنی کھوپڑی میں میری بندوق کی گولیوں کو جگہ دینی ہوگی، مجھے اپنے فرائض معلوم ہیں اور میں انھیں پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتوں گا۔"

"خواہ مخواہ اُلجھنے سے کیا فائدہ انسپکٹر۔" ہجوم میں سے ایک نے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔ "تمھیں معلوم ہے کہ اس نیگرو کا کیا انجام ہونا ہے، اُسے یقیناً پھانسی لگنی ہے تو پھر ہم اجتماعی طور پر تشدد کا مظاہرہ کر کے ان سیاہ فام جاہلوں پر یہ بات کیوں نہ ثابت کر دیں کہ وہ آیندہ کسی سفید فام شہری کی زندگی سے اس طرح کھیل نہیں سکتے۔"

"باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں جیل سے باہر ڈیوٹی پر نہ ہونے کی صورت میں بے شک ایک سفید فام باشندہ ہوں مگر جیل کے اندر محض ایک انسپکٹر ہوں، اگر اس نیگرو کو موت کی سزا ہو گی تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے تیار ہوں، لیکن غیر قانونی طور پر تم لوگوں کے ہاتھوں اس کی تکا بوٹی کروانے کے لیے تیار نہیں ہوں، بہتر یہی ہے کہ اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، تم لوگ مجھ سے اچھی طرح واقف ہو، میں اس سے پہلے بھی ہزاروں بار گولیوں میں گھر چکا ہوں اور اس وقت بھی میرا ہتھیار ڈالنے کا قطعی ارادہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کھڑکی بند کر لی اور کوئی ایسا محفوظ مقام تلاش کرنے لگا جہاں سے وہ مؤثر طور پر عمارت کا دفاع کر سکے۔

ہجوم عمارت سے کچھ فاصلے پر جا کر ٹھیر گیا اور سرکردہ لوگ آپس میں مشورے کرنے لگے۔ جیل کی دو منزلہ عمارت بہت پختہ اور اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت محفوظ تھی، جس میں شاذ و نادر ہی ایک سے زیادہ قیدی رکھنے پڑتے تھے، چاروں کوٹھریاں اکثر و بیشتر خالی پڑی رہتی تھیں، انسپکٹر نے اوپری منزل سے دفاع کرنا مناسب سمجھا مگر جس کمرے میں نیگرو قید تھا اُس کے سوا کسی اور کمرے میں کوئی کھڑکی ایسی نہیں تھی جہاں سے ہر طرف دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ انسپکٹر قیدی کی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا قیدی کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، وہ فرش پر پڑا ہوا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "انسپکٹر، خدا کے لیے مجھے ان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔" اُس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ مجھے جان سے مار ڈالیں گے، میں نے اُس شخص کو قتل نہیں کیا ہے۔"

"اٹھو!" انسپکٹر کے لہجے سے حقارت اور نفرت عیاں تھی۔ "تمھیں بہر حال پھانسی ہونی ہے، اب نہیں تو بعد میں، مگر میں پوری کوشش کروں گا کہ تمھاری موت ان لوگوں کے ہاتھوں واقع نہ ہو۔ میں تمھاری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دیتا ہوں، اگر میں جیل کا دفاع کرنے میں ناکام ہو گیا تو تمھیں خود اپنی حفاظت کی کوشش کرنی ہو گی اور اگر میں مارا گیا تو اپنے فرض سے خود بخود سبکدوش ہو جاؤں گا۔"

انسپکٹر نے اُس کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دیں جو ایک جھٹکے سے فرش پر گر پڑیں۔ "کھڑکی سے ہٹ کر کھڑے ہونا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "انھوں نے تمھیں دیکھ لیا تو گولی مار دیں گے۔"

انسپکٹر نے کوٹھری میں پڑی ہوئی واحد بنچ گھسیٹ کر کھڑکی کے قریب کر لی اور اپنا ریوالور نکال کر اُس پر رکھ دیا اور پھر بندوق تان کر اور چھپ کر ہجوم کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

ہجوم کو غالباً اس قدر شدید اور کڑے جواب کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی انہیں کسی قسم کی مسلح مزاحمت کا خطرہ تھا۔ پھر بھی ان میں سے کوئی شخص جیل پر مسلح حملے کی سربراہی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہجوم کی سرکردہ شخصیتوں نے لوگوں سے ہٹ کر کچھ دیر تک آپس میں تبادلۂ خیال کیا اور پھر ان میں سے ایک شخص جا کر ہجوم سے مخاطب ہوا۔

"ساتھیو! غالباً فی الحال ہمیں اپنا ارادہ ترک کر دینا پڑے گا کیونکہ انسپکٹر اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہے اور ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہماری

متفقہ رائے ہے کہ جیل پر مسلح حملہ کسی صورت میں بھی مناسب نہیں ہوگا کیونکہ انسپکٹر جارج ایک اچھا آدمی ہے اور ہم اچھے آدمیوں سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے۔ بہرحال اس نیگرو کی زندگی زیادہ طویل نہیں ہے اور میں نے انسپکٹر کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ بھی قانونی طریقے پر اس کے لیے موت ہی کی سزا تجویز کرے گا۔"

ہجوم میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، چند نوجوانوں نے مخالفانہ نعرے بھی لگائے مگر پھر بڑے بوڑھوں کے سمجھانے پر سب لوگ واپس لوٹنے پر متفق ہو گئے۔ انسپکٹر نے غور سے ان لوگوں کی ایک ایک بات کا جائزہ لیا اور اُس وقت تک کھڑکی کے قریب کھڑا رہا جب تک تمام آدمی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے اُس کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اُسے قیدی کے قریب آنے اور بنچ سے ریوالور اُٹھا لینے تک کا احساس نہیں ہوا جب خطرہ ٹل گیا اور انسپکٹر قیدی کی طرف مڑا تو فضا میں ایک دھماکا ہوا اور جنگلے سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آکر انسپکٹر کے قریب دیوار میں گھس گئی۔ انسپکٹر نے چیتے کی سی پھرتی سے پینترا بدلا اور اندازہ لگا کر اُس مقام پر دو گولیاں داغ دیں جہاں غالباً حملہ آور چھپا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی مقام کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے اپنی بندوق کھڑکی کے سہارے کھڑی کر کے دوسرا ہاتھ بنچ پر رکھتے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھایا۔ جیسے ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اُس نے پلٹ کر دیکھا اُس کی نظریں قیدی کے بجائے ریوالور کی نال پر پڑیں جو اُس کی طرف تنی ہوئی تھی۔

"انسپکٹر! اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔" قیدی کی آنکھیں فرطِ جذبات سے چمک رہی تھیں، انسپکٹر اس لاپروائی پر دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ پہلے اُسے یہ یقین تھا کہ قیدی نیگرو سفید فام افسر کی موجودگی میں ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا مگر اب وہ اس مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ آخر انسپکٹر نے سکوت توڑا۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"فرار ہونا چاہتا ہوں۔"

انسپکٹر اُس کا جواب سن کر اچنبھے کا شکار ہو گیا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ قیدی یا تو بہت بیوقوف آدمی ہے یا بہت خطرناک آدمی ہے۔

"میں نے اپنی جان پر کھیل کر تمھاری جان بچائی ہے اور اب تم اس طرح احسان چکا رہے ہو؟" انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔ "اگر میں تمھیں نہ بچاتا تو اس وقت تم باہر کسی درخت کی شاخ سے ٹنگے ہوتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، یقیناً تم نے میری جان بچائی ہے مگر کتنے عرصے کے لیے؟" قیدی نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ عدالت کی کارروائی اگلے ہفتے شروع ہوگی اور مجھے موت کی سزا دی جائے گی اور اس وقت باہر مشتعل لوگ بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اب مسئلہ محض ان دو پھندوں میں سے ایک کے انتخاب کا ہے۔"

"جان ہے تو جہان ہے، زندگی ہے تو امید بھی باقی ہے۔" انسپکٹر نے اُسے باتوں کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی، اُس کا دماغ بڑی شدت سے کوئی حل تلاش کر رہا تھا۔ "اگر تم زندہ رہے تو ممکن ہے اپنی بے گناہی ثابت کر سکو۔"

"میں نے اُسے قتل نہیں کیا ہے۔" نیگرو نے آہستگی سے کہا۔ "مگر میں یہ ثابت نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ نہ صرف میں اُس کے گھر پر تھا، میں نے اُس کی لاش سے جو کوٹ چرایا تھا وہ گرفتاری کے وقت میرے قبضے سے برآمد ہوا تھا۔ انصاف مجھے ہر صورت میں قاتل سمجھے گا، تاوقتیکہ اصل قاتل خود اپنے جرم کا اعتراف کر لے۔"

انسپکٹر نے دل ہی دل میں اُس کی بات سے اتفاق کیا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نیگرو نے ریوالور ہلا کر کہا۔ "تم جلدی سے دروازہ کھولو۔"

انسپکٹر نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر بڑھ کر جنگلے کا تالا کھول دیا۔

"اب نیچے جا کر دروازے کا تالا بھی کھول دو۔" قیدی نے کہا۔

انسپکٹر کے جی میں آئی کہ وہ نیچے جاتے جاتے راہِ فرار اختیار کر لے مگر نیگرو ریوالور تانے ہوئے سائے کی طرح اُس کے سر پر مسلط رہا۔ انسپکٹر نے دروازے کے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ نیگرو چلایا "خبردار" اُس کی آواز میں دھمکی نمایاں تھی "اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو کھوپڑی پاش پاش کر دوں گا۔"

انسپکٹر نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔ قیدی نے کہا۔ "اب اسی طرح ہاتھ اٹھائے ہوئے دوبارہ اُوپر کی کوٹھری میں چلو۔"

انسپکٹر کا خیال تھا کہ نیگرو اُسے کسی کوٹھری میں بند کر کے خود فرار ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔

"میں یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا ہوں لیکن میں فی الحال فرار ہو کر دوبارہ گرفتار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں جہاں کہیں بھی پکڑا جاؤں گا مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ لہٰذا اپنے مکمل دفاع اور حفاظت کے لیے مجھے مجبوراً تمھیں گولی مارنی پڑے گی۔"

"اُف میرے خدا!" انسپکٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ذرا سی دیر کے لیے اُس کے سامنے اپنی بیٹی کا چہرہ گھوم گیا جس کی کفالت تنہا اُس کی ذمے داری تھی۔ "تم بھلا کس دل سے اپنے محسن کو مارو گے؟"

"بے شک تم میرے محسن ہو، تم نے میری جان بچائی ہے مگر میں مجبور ہوں" نیگرو نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "میری یہ زندگی واقعی تمھاری مرہونِ منت ہے۔"

انسپکٹر چونکا اور پھر بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔ "تم ہو کون؟"

"میرا نام ٹام ہے اور میں سیسلی کا بیٹا ہوں" نیگرو نے کوٹھری کا دروازہ بند کرلیا اور آہنی سلاخوں کی آڑ سے انسپکٹر کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ "کیوں کیا تم اس سیسلی کو بھول گئے؟ وہی عورت جسے تم نے اُس کے بچے سمیت فروخت کر دیا تھا۔"

انسپکٹر کو سب کچھ یاد آگیا۔ وہ بارہا اس واقعے پر نادم ہوا تھا مگر اُس وقت مقروض ہونے کی وجہ سے وہ یہ حرکت کرنے پر مجبور تھا۔ اُن دنوں یوں بھی غلاموں کی خرید و فروخت عام تھی" خدایا... تو کیا تم اپنے باپ کو قتل کرو گے؟"

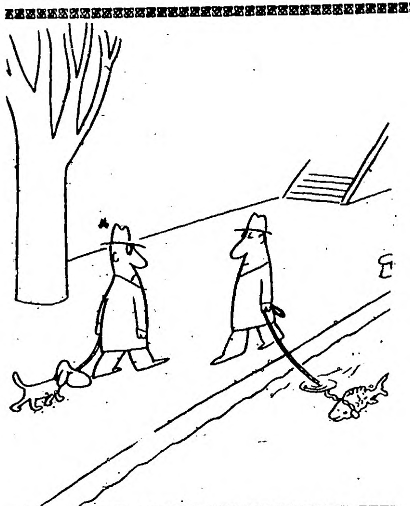
"باپ؟" نیگرو نے حقارت سے کہا۔ "اگر یہ دعوا میں کرتا کہ میں ایک سفید فام اور معزز شہری کا رشتے دار ہوں تو کچھ اچھا معلوم ہوتا مگر تمھارے منہ سے یہ باتیں زیب نہیں دیتیں، تم نے میرے لیے کون سے پدری فرائض انجام دیے؟ کیا تم نے مجھے اپنا نام اور تحفظ دیا؟ دوسرے سفید فام باشندوں نے اپنے رنگ دار بچوں کو آزادی اور دولت دے کر آزاد ریاستوں میں بھیج دیا مگر تم نے مجھے قرض چکانے کے لیے بیچ ڈالا؟"

"مگر میں نے کم از کم تمھیں یہ زندگی تو عطا کی جس کی بنا پر تم اس وقت مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔"

"زندگی؟" نیگرو نے حقارت سے قہقہہ بلند کیا۔ "کس قسم کی زندگی؟ تم نے مجھے اپنا خون دیا مگر ماں سیاہ فام دی، وہ بے چاری اپنا حق مانگتی ہوئی کوڑے کھاتی ہوئی جاں بحق ہوگئی اور میری رُوح غلامی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔"

"مگر اب تو تم آزاد ہو" انسپکٹر نے کہا۔

"آزاد... مگر کیا کرنے کے لیے؟" نیگرو نے کہا۔ "نام کی آزادی ہے میں تو سفید فام اور سیاہ فام دونوں نسلوں کے نزدیک ایک ناقابلِ اعتبار اور کم تر شخص ہوں۔"



"مگر تم نے تو تعلیم بھی حاصل کی ہے" انسپکٹر نے قیدی کی شستہ زبان سے یہ اندازہ لگا لیا تھا۔

"ہاں میں اسکول بھی جایا کرتا تھا، اور خواب دیکھا کرتا تھا کہ اب سب کچھ بدل جائے گا مگر بہت جلد میرے خواب بکھر گئے۔ چکنا چور ہوگئے بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ تعلیم اور تو سب کچھ کر سکتی ہے مگر میری جلد کا رنگ نہیں بدل سکتی۔ ذلت کا یہ لبادہ میں ہمیشہ اوڑھے رہوں گا۔ مجھے آزادی کی خواہش نہیں رہی ہے اور نہ ہی اب میں تم سے کسی رعایت کا طلب گار ہوں مگر تم سے بدلا لے کر میرا جذبۂ انتقام ضرور سرد ہوگا اور میری ماں کی رُوح کو ضرور تسکین ملے گی، میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا ہے، میں نے اُس بوڑھے کیپٹن کا خون بھی نہیں کیا ہے..."

نیگرو نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اگر میں تمھیں قتل نہ کروں تو کیا تم یہ وعدہ کر سکتے ہو کہ تم خطرے کی گھنٹی نہیں بجاؤ گے؟ اور صبح ہونے سے پہلے مجھے دوبارہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

وہ دونوں اس گفتگو میں اتنے منہمک تھے کہ انھیں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ بھی نہ سنائی دی۔

قیدی کی پیشکش پر انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ زندگی سے محبت اور فرض کے احساس میں کشمکش ہونے لگی، اُس نے واقعی اپنے بچے کو بیچا تھا مگر اب اُس کا ضمیر جاگ چکا تھا اور وہ کوئی وعدہ کرنے سے پہلے

اچھی طرح سوچ لینا چاہتا تھا۔
نیگرو کو اس کش مکش کا اندازہ ہوگیا۔ "خیر تم خواہ مخواہ اُلجھ گئے" اُس نے کہا "میری وجہ سے کسی قسم کا وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ شاید اس وقت تمھیں سب سے بڑھ کر اپنے فرض سے محبت ہے اور اگر تم وعدہ کر بھی لو تو کوئی بعید نہیں کہ اس سے مکر جاؤ اور مجھے گرفتار کروا دو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اُس نے ریوالور تان لیا... ایک دھماکا ہوا اور قیدی کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آگیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ انسپکٹر ایک لمحے کے لیے حیرت میں پڑ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے اوسان بجا ہوئے اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ اور دروازہ کھول کر اس نے پھرتی سے اپنا ریوالور اُٹھا لیا، اور قیدی کو کوٹھری میں دھکیل کر تالا لگا دیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی بیٹی کی طرف رجوع ہوا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کی زردی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے "ابا! میں وقت پر پہنچ گئی نا؟" یہ کہہ کر وہ انسپکٹر کے سینے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میں نے مشتعل ہجوم کو جاتا ہوا دیکھ لیا تھا پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور تمھیں بھی گولیاں چلاتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر تم باہر نہیں نکلے تو میں یہ سمجھ کر کہ تم شاید زخمی ہوگئے ہو، وہ پرانی بندوق اُٹھا کر یہاں چلی آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میرا ماتھا ٹھنکا اور جب مجھے اوپری منزل میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی تو میں دبے قدموں اوپر آگئی۔ جب اس نے آپ کو قتل کرنے کی دھمکی دی تو بے اختیار مجھ سے گولی چل گئی۔"

جب اُس کی بیٹی کے حواس بجا ہوئے تو انسپکٹر نے اُسے ابتدائی طبی امداد کا سامان لانے کے لیے گھر بھیج دیا اور خود کوٹھری میں داخل ہوا۔ قیدی کے بازو سے خون رس رہا تھا مگر اُس کے چہرے پر خوف یا مایوسی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ طبی سامان آگیا تو انسپکٹر نے جیسے تیسے پٹی باندھنے کی کوشش کی۔ "صبح ڈاکٹر کو بلوا کر صحیح مرہم پٹی کروا دوں گا۔" اُس نے قیدی سے کہا۔ "فی الحال اگر تم نے کوئی گڑبڑ نہیں کی تو یہ پٹی آرام دے دے گی۔ اگر ڈاکٹر تم سے اس زخم کی وجہ پوچھے تو یہ کہہ دینا کہ جنگلوں کی طرف سے کسی نے گولی چلائی تھی۔ اگر تم نے یہ بتایا کہ یہ گولی تمھیں فرار ہونے سے روکنے کے لیے ماری گئی ہے تو پھر تم جانتے ہو کہ اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟"

نیگرو اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ پٹی بندھ گئی تو باپ بیٹی اپنے گھر لوٹ گئے۔

اس رات انسپکٹر کسی گہری سوچ میں تھا۔ اُس نے بے خیالی میں اپنی کافی میں نمک اور کیک پر سرکہ ڈال لیا اور بیٹی کے استفسار پر کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکا اور جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو کئی گھنٹوں تک کروٹیں بدلتا رہا۔

رات جب کافی ڈھل گئی اور ہر طرف قیامت کا سکوت طاری ہوگیا تو انسپکٹر نے اپنے آپ کو خدا کے روبرو پایا اور اُس کے دماغ میں غیر معمولی خیالات کا ایک طوفان اُمنڈنے لگا۔ ابھی چند گھنٹے قبل جب اُس نے اپنی موت اپنے سامنے دیکھی تھی تو اُس کی حالت بالکل ایسی ہوگئی تھی جیسے بھرے ہوئے سمندر میں کسی نوآموز پیراک کی ہوتی ہے۔ اُس کا ضمیر، اُس کے اعمال، زمانے کی تمام مصلحتوں سے بالاتر ہو کر اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے تھے... سچائی کے اس لمحے میں اُسے شدت سے اپنی اُس کوتاہی اور لاپروائی کا احساس ہوا جو اُس نے اپنے خون جگر کی جانب سے برتی تھی۔ انسانی فطرت میں اولاد کے لیے جو ہمدردی اور ذمے داری کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اُسے قانون اور رواج کی بندشیں بھی ختم نہیں کرسکتیں۔ اب ایک احساسِ گناہ اس پر غالب آگیا تھا، رفتہ رفتہ اس کے دل سے اس قیدی کے لیے نفرت اور حقارت کا جذبہ ختم ہوگیا اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے پر عائد شدہ الزامات کی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کرے گا اور اُسے بری کروا کر ہی دم لے گا۔ وہ اُسے فرار ہونے میں بھی مدد دے سکتا تھا۔ مگر ان حالات میں بھی وہ اپنی سرکاری حیثیت کا حلف توڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ قانونی طور پر اپنے بیٹے کی رہائی کے بعد اُس کے لیے کسی مستقل منصوبے پر عمل کرے گا۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی اُس پر نیند کا غلبہ ہوگیا اور وہ آرام سے سوگیا۔

صبح وہ ناشتہ کیے بغیر جیل کی طرف چلا گیا۔ وہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کا دل لرز کر رہ گیا۔ قیدی مُنہ کے بل فرش پر پڑا ہوا تھا اور اُس کے قریب خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

"صبح بخیر!" انسپکٹر نے کہا مگر قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دیکھا تو قیدی کے بازو کی پٹی کھلی ہوئی تھی۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اُس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اس نے بڑھ کر نبض دیکھی، قیدی کا جسم بالکل یخ ہو رہا تھا اور غالباً اُسے مرے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔



اِس کہانی کی خصوصیت
یہ ہے کہ اسے
جوان سال شاعر شعور انوار
نے لکھا ہے :
نوجوانوں کیلئے
ایک کہانی ،



اس کے

فلیٹ میں پانچ لڑکیاں آتی تھیں یہ پانچوں لڑکیاں اس کے دوستوں کی محبوبائیں تھیں جب سے عاطف محمود نے یہ فلیٹ لیا تھا اس کے ان دوستوں کی دوستی میں زیادہ گہرائی اور جاں نثاری پیدا ہوگئی تھی، عاطف دوستوں کے کام آنے والا آدمی تھا۔ اس لیے دو کمروں پر مشتمل یہ خوب صورت فلیٹ اکثر اس کے دوستوں کے کام آتا رہتا تھا۔ وہ لوگ اپنی دھڑکتے دلوں اور جلتی آنکھوں والی محبوباؤں کے ساتھ کچھ دیر کے لیے آتے اور تنہا عاطف کو اداس کر جاتے۔

شہر کے گنجان محلوں سے کچھ دور ایک نو تعمیر آبادی میں لیے جانے والے اس فلیٹ کی خوبی ہی یہ تھی کہ وہاں لڑکیوں کی آمدورفت کوئی مسئلہ نہیں تھی، عاطف کے دوستوں نے اس گوشۂ عافیت میں اپنے دل کے ارمان خوب نکالے کیوں کہ انھیں ان معاملات میں پیروی کرنے کا فن آتا تھا۔ پیروی اور تخلیے کی حیثیت مقناطیس کی سی ہے، لڑکیاں خود بہ خود کھنچی چلی آتی ہیں۔

**

عامر کی محبوبہ ڈورتھی سانولے رنگ اور چھریرے بدن کی ایک

خوش شکل لڑکی تھی، عمر سترہ اٹھارہ برس، آنکھیں پُرکشش، بال تراشیدہ، اس کے لب و رُخسار میں ملاحت تھی اور وہ ہر وقت کچھ شرارتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ڈوروتھی ایک فرم میں ٹیلی فون آپریٹر تھی اور موجودہ ملازمت سے پہلے کوئی دو سال قبل عامر کے دفتر میں اُس کے ساتھ کام کرتی تھی، وہیں ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور ڈوروتھی نے اسکرٹ وغیرہ ترک کر کے ساڑھی پہننی شروع کر دی۔ عامر شاید پیش بندی کے طور پر بڑے فخر کے ساتھ عاطف سے کہتا تھا: "ڈوروتھی نے اس پورے عرصے میں میرے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی، ٹیلی فون پر اُسے چھیڑنے اور ستانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے مگر وہ کسی کو لفٹ نہیں دیتی۔ ایسی وفادار لڑکی مشرقی لڑکیوں میں بھی نہیں ملے گی۔ ڈوروتھی سب کچھ ہے لیکن آوارہ نہیں ہے۔ کسی ایک لڑکے سے تعلق رکھنا آوارگی کی نشانی نہیں ہے۔"

بہرحال ڈوروتھی جب عامر کے ساتھ پہلی بار عاطف کے ہاں آئی تو اس نے خوب میک اپ کر رکھا تھا، دبیی پوڈی کرلون کی لپٹیں اُس کے ہمر کاب تھیں، وہ سرخ سوتی ساڑھی میں ایک شرمیلی سی گھریلو لڑکی لگ رہی تھی، عاطف اُس سے مل کر کچھ جھجکا اور شرمایا مگر عامر نے ایک جملے میں دونوں کی جھجک دُور کر دی، اس نے ڈوروتھی سے کہا: "عاطف سے شرما رہی ہے؟ اس کا کیا ہے یہ اپنا لنگوٹیا یار ہے، میں اس کے سامنے بالکل ننگا ہوں۔"

عاطف گھُل مل کر بے تکلفی کے ساتھ ڈوروتھی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا لیکن چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ڈوروتھی کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع صرف عامر کی ذات ہے، وہ ہر پھر کر عامر ہی کے متعلق گفتگو کرنے لگتی۔ وہ بڑی محبت سے عامر کی حرکات اور عادتوں کا تذکرہ کر رہی تھی اور شاید عاطف کی زبان سے بھی اپنے محبوب ہی کے تذکرے کی خواہاں تھی چنانچہ عاطف بھی گفتگو کو طول دینے اور ڈوروتھی کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے بڑھ چڑھ کر عامر کی تعریفیں کرنے لگا۔ ایک قتالہ داب اور جاذب لڑکی کے سامنے کسی دوسرے نوجوان کی تعریف کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ عامر ڈوروتھی کے سامنے عاطف کے منہ سے اپنے قصیدے سُن کر بہت خوش نظر آ رہا تھا اور ڈوروتھی اُسے شریر نظروں سے دیکھے جا رہی تھی، عامر کے لیے ڈوروتھی کی یہ رغبت اور اشتیاق دیکھ کر عاطف نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے یہ لمحے گراں گزرنے لگے اور اس کے دل میں کسی اور ہی جذبے نے سر اُبھارا۔ چنانچہ اس نے بڑی خوب صورتی سے گفتگو کا رُخ موڑ دیا اور ڈوروتھی سے کہنے لگا: "لیکن یہ آپ کا دوست بہت بے مروّت آدمی ہے، ہفتوں شکل تک نہیں دکھاتا، اس سے ذرا دُور ہی رہیئے۔ میری بھی آج بس آپ کے طفیل میں اس سے ملاقات ہو گئی ہے۔"

دفعتہً ڈوروتھی بھی عاطف کی ہاں میں ہاں ملا کر بڑے پیار سے عامر کی شکایتیں کرنے لگی: "آپ ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میرا بھی خیال نہیں کرتا۔ بہت ستاتا ہے، مجھے گھنٹے گھنٹے اپنے انتظار میں سڑک پر کھڑا رکھتا ہے، بڑا ناٹی ہے مگر میں اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں۔"

عامر اس گفتگو سے بہت جز بز ہوا۔ پہلے تو اُس نے ٹالنے کی کوشش کی، عاطف کا مذاق اُڑایا لیکن کچھ دیر بعد بڑی صفائی سے ایک آنکھ میچ کر عاطف کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس پر ڈوروتھی نے جھینپ کر اس طرح دوسری طرف منہ موڑ لیا جیسے وہ بھی یہی چاہتی ہو کہ عاطف یہاں سے چلا جائے، وہ کھسیانا ہو کر کسی فرماں بردار ملازم کی طرح دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی عامر نے اُٹھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد عاطف کو دیواریں اپنے اُوپر گرتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ایک رسالہ اُٹھا لیا اور ورق گردانی شروع کر دی مگر دل نہ بہلا۔ اگر سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو جاتا تو شاید اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اس نے دروازے سے کان بھی لگائے اور تاک جھانک کرنے کی کوشش بھی کی مگر کچھ سننے اور دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ دروازے میں کوئی درز، کوئی شگاف نہیں تھا۔ آخر تھک ہار کر اس نے سگریٹ پہ سگریٹ پھونکنے شروع کر دیئے۔

تقریباً پچاس منٹ کی ایک بے چین صدی کے بعد دروازہ کھُلا تو عامر کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں اور آنکھوں میں چوری سی تھی، اس کے بال بکھرے ہوتے تھے، عاطف نے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ پھر وہ اندر گیا تو ڈوروتھی بڑے اطمینان سے مسہری پر بیٹھی ہوئی کنگھی کر رہی تھی، کنگھی کرنے کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا آئینہ پرس میں رکھا اور لپ اسٹک نکال کر دوبارہ سُرخ رُو ہونے کی کوشش کرنے لگی، عاطف کو دیکھ کر اس نے نظریں جھُکا لیں، ساڑھی کا پلّو درست کیا اور قریب رکھا ہوا ایک انگلش میگزین اُٹھا کر اس پر جھک گئی۔ عاطف خاموشی سے عامر

کے سامنے بیٹھ گیا۔ ایک فتح مند شخص کی طرح عامر کے ہونٹ مسکرانے کے لیے مچل رہے تھے مگر اس نے اپنے آپ پر سنجیدگی منڈھ رکھی تھی پھر وہ عاطف سے اس طرح سیاسیات پر بحث کرنے لگا جیسے اسی مقصد سے یہاں آیا ہو۔ عاطف بھی بات چیت کے لیے سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ اس لیے کسی اُمید کے تحت وہ بھی عامر سے بحث میں اُلجھ گیا اور عالمانہ انداز میں اس سے اختلاف کرنے لگا۔ اس نے کتابوں اور رہنماؤں کی تقریروں وغیرہ کے تفصیل حوالے دینے شروع کر دیئے اور سیاست پر کچھ فتوے بھی صادر کیے۔ اس کا انداز فلسفیانہ تھا۔ وہ ہر جملہ کہنے کے بعد ڈورتھی کی طرف دیکھتا مگر ڈورتھی نے ابھی تک میگزین نہیں چھوڑا تھا۔ وہ غالباً ماڈل لڑکیوں کی تصویروں میں کھوئی ہوئی تھی، اس لیے بے تعلق ہی بیٹھی رہی، جیسے عامر اور عاطف کسی اور زبان میں باتیں کر رہے ہوں۔

تھوڑی دیر کی بے نتیجہ بحث و تکرار کے بعد عامر نے عاطف سے رُخصت طلب کی۔ "اتنی جلدی؟" عاطف نے پوچھا۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

عامر نے گھڑی دیکھتے ہوئے ڈورتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے پہنچا کر گھر جاؤں گا۔"

عاطف نے مسکرا کر کہا۔ "انھیں یُوں ہی رُوکھا پہنچا دوگے؟ کچھ خاطر تواضع نہیں کروگے؟ ہمیں کچھ ان کی خدمت کا موقع نہیں دوگے؟"

"اب کسی خدمت کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" عامر نے معنی خیز انداز میں کہا اور پھر ڈورتھی کو مخاطب کیا۔ "کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

ڈورتھی نے محجوب ہو کر شکایتی نظروں سے عامر کو گھورا مگر عامر نے بے تکلفی سے اس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔ "چہرہ گلنار ہو رہا ہے، شرمانے کی کیا بات ہے؟ میرے اور عاطف کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے اس میرے یار کو بتا دے کہ ......"

"ہاں"۔ ڈورتھی نے بڑی بے بسی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ عاطف کو شرم آگئی، پھر ڈورتھی عامر کی طرف دیکھ کر کھلکھلا پڑی، عاطف یہ بیچارگی کی ہنسی نہ سہہ سکا۔ اس نے فرش پر نظریں جما دیں اور جلدی سے کہا۔ "یار عامر! مذاق چھوڑو۔ مس ڈورتھی آج پہلی بار میرے گھر آئی ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ یہ کچھ کھائے پیے بغیر چلی جائیں، تنہائی کی زندگی بھی عذاب ہوتی ہے، گھر میں کوئی چیز موجود نہیں ہے تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں بازار سے کچھ لے آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں" ڈورتھی نے ہاتھ ہلا کر منع کیا۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔ میرا گھر ویران ہے لیکن دل ویران نہیں، چلیے کسی ریستوران میں چل کر چائے پئیں گے۔"

عامر نے قہقہہ لگایا۔ "ابے ہم کوئی مہمان ہیں کیا؟ تیری جیب میں زیادہ پیسے آ گئے ہوں تو مجھے دے دے، میں کنگلا ہوں آج کل۔"

ڈورتھی کو شاید عاطف پر ترس آ گیا۔ اس نے ساڑھی کا پلو سر پر رکھ کر کانوں میں اٹکایا اور اٹھلا کر عامر سے بولی۔ "ان کے ساتھ چائے پی لیتے ہیں ڈیئر! کیا حرج ہے؟"

ڈورتھی راستے بھر مدھم آواز میں ہنس ہنس کر عامر سے باتیں کرتی رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ گفتگو کبھی ختم نہ ہوگی، عاطف چلتے چلتے کبھی ڈورتھی کے پہلو میں آ جاتا اور کبھی عامر کی طرف ہو جاتا۔ ریستوران میں پہنچ کر ڈورتھی نے عاطف کے اصرار پر بڑی مشکل سے کچھ کھایا۔ عامر کیک کا ٹکڑا کھانے کے بعد پانی پی رہا تھا کہ عاطف نے کہا۔ "تم تو کچھ کھاؤ، کچھ کھاتے پیتے رہو، معلوم ہوتا ہے تم نے اپنی صحت کی طرف دھیان کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

ڈورتھی نے نمکین بسکٹوں کی پلیٹ اُٹھا کر عامر کو پیش کی "بہت مزے کے ہیں۔"

عامر نے پیار کی نظر سے اُسے گھورا اور تنبیہی انداز میں کہا۔ "تجھے معلوم ہونا چاہیے۔ میں پانی پینے کے بعد کچھ نہیں کھاتا۔ شادی کرنی ہے تو ذرا میری عادتیں بھی یاد رکھا کر۔"

"سوری" ڈورتھی واقعی نادم ہو گئی اور پلیٹ ہٹا کر دور رکھ دی۔ بل آیا تو ڈورتھی نے عامر کے اشارے پر اپنے پرس سے دس روپے کا ایک مڑا تڑا نوٹ نکالا مگر عاطف نے اُسے روک کر جلدی سے پیسے ادا کر دیے۔ ڈورتھی کچھ دیر تک دس کا نوٹ اُنگلیوں میں جھلاتی گھماتی رہی، پھر اسے چپکے سے عامر کی طرف بڑھا دیا۔ عاطف نے دزدیدہ نظر سے دیکھا کہ عامر نے وہ نوٹ کسی جھجک کے بغیر جیب میں ڈال لیا جیسے وہ ڈورتھی کے پرس سے نہیں بلکہ خود اس کی جیب سے نکلا ہو۔ عاطف نے دُنیا کے اس سب سے خوش قسمت انسان کو غور سے دیکھا۔ اسے عامر کے

سامنے اپنا قد بہت چھوٹا معلوم ہوا۔ بہت بونا سا۔ مگر اس نے اپنے طرزِ عمل سے اس احساسِ کمتری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

دوسرے دن عاطف نے خاصا وقت، محنت اور فن کاری صرف کر کے اپنے دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے میں ایک چھوٹی سی جھری بنالی جسے اُس کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور کسی آؤٹ سائڈر کو اتنی چھوٹی سی چیز پر توجہ دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پلنگ اس نے دروازے کے قریب بچھا دیا تھا اور کمرے کی ترتیب بدل ڈالی تھی، نتیجے کے طور پر اُس کے کنوارے گھر کی بکھری ہوئی چیزیں کچھ اور بکھر گئی تھیں۔

اس کے بعد جب بھی عامر کے ساتھ ڈورتھی آتی، عاطف اسے اپنی تنہائی کے زخم دکھانے کی کوشش کرتا۔ وہ بڑی اُداسی اور کرب کی باتیں کرتا۔ رفتہ رفتہ ڈورتھی عاطف کے عورت سے محروم گھر کی بے ترتیبی دیکھ کر افسوس کا اظہار کرنے لگی۔ وہ بڑی ہمدردی سے عاطف کو شادی کر لینے کا مشورہ دیتی پھر فوراً التجائی نگاہوں سے اُسے دیکھتی اور جھجک کر کہتی: "اپنے فرینڈ کو بھی سمجھاؤ۔ اس کو بولو جلدی میرے ساتھ شادی بنائے، اس طرح کب تک گزارا ہوگا؟ کب تک بات چلے گی؟"

عاطف یہ سن کر عامر کو ڈانٹتا۔ اُسے خود غرضی کے طعنے دیتا اور ڈورتھی سے وفادار رہنے کی تلقین کرتا۔ عاطف نے محسوس کیا کہ ان باتوں سے ڈورتھی کے دل میں اس کی قدر و عزت بڑھ گئی ہے، مگر یہ قدر و عزت اُس محبت کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی جو عامر کے لیے ڈورتھی کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ کسی کے دل سے کسی کی محبت کھرچنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔

عامر عاطف کی تنبیہہ و تاکید سن کر قہقہے لگاتا اور ڈورتھی کے ساتھ کچھ اور کھلی ہوئی، کچھ اور بے حجابانہ گفتگو شروع کر دیتا۔ وہ عاطف پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ڈورتھی کسی اور لڑکے کے لیے قطعاً ناقابلِ تسخیر ہے۔

ڈورتھی شادی کے لیے اصرار کرتی رہی اور عامر اُسے عاطف کے فلیٹ میں لا کر اپنا اعتماد بحال کرتا رہا۔ عامر کی آنکھوں سے جو مکاری جھانکتی تھی اُسے صرف عاطف سمجھ سکتا تھا۔ ڈورتھی اُسے محسوس نہیں کر سکتی تھی، محبت کرنے والی کوئی لڑکی یہ بات محسوس نہیں کر سکتی۔

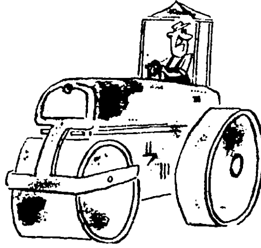
**

گورے رنگ، نازک بدن اور دلکش خدوخال والی شہلا اصغر کی گیارھویں محبوبہ تھی۔ اصغر ایک خوش حال، وجیہہ، خوش پوش اور خوش گفتار نوجوان تھا۔ وہ طبعاً ہرجائی آدمی نہیں تھا لیکن سگریٹ کے برانڈ اور لڑکیاں بار بار بدلتا رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا ایسا کرنے سے اُس کی قوّتِ کار اور ذہنی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی دو کمزوریاں تھیں، لڑکیاں اور سگریٹ۔ وہ ایک با اصول مرد کی حیثیت سے اپنی محبوباؤں کو حتی الامکان کسی اور لڑکے سے بے تکلف نہیں ہونے دیتا تھا۔ محبوبہ کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا تھا۔ انھیں بدنام کرنے کا قائل نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اُن کے نام وغیرہ عموماً غلط بتایا کرتا تھا۔ اگر اُسے بروقت کوئی دوسری جگہ مل جاتی تو وہ شہلا کو لے کر عاطف کے فلیٹ میں ہرگز نہ آتا اور اُسے کسی طرح اس راز میں شریک نہ کرتا۔ وہ ایک مشّاق اور ماہر محبوب تھا لڑکیوں کے نام خطوط لکھنے اور انھیں متاثر کرنے کا گُر اُسے اچھی طرح آتا تھا۔ وہ محبت کو ایک مشغلہ، ایک مہم سمجھتا تھا اور عموماً اس میں کامیاب رہتا تھا اس لیے کہ وہ اس میدان کا شہسوار تھا۔ فن کار تھا۔

نوعمر شہلا کسی گرلز کالج کی طالبہ تھی۔ سفید قمیص اور سفید شلوار کی یونیفارم میں اُس پر ایک پری زادی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ جب عاطف کے ہاں آئی تو اصغر کے پیچھے پیچھے کتابیں اور اوڑھنی سنبھالے گردن جھکائے جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عاطف پہلے کمرے میں بیٹھا رہ گیا۔ وہ اسے پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ اصغر نے بھی سامنے سے گزرتے ہوئے اسے صرف ایک شکریے کی مسکراہٹ دی، توجہ نہیں دی۔ اس کے پاس رسمی تکلفات کے لیے وقت کہاں تھا۔

پھر جب دروازہ بند ہو گیا تو عاطف نے حسبِ معمول دروازے کی جھری میں آنکھ لگا کر اچھی طرح شہلا کا جائزہ لیا۔ اندر کا نظارہ دیکھتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن کبھی بہت تیز ہو جاتی اور کبھی بالکل سُست۔ شہلا کے سر پر اب اوڑھنی نہیں تھی۔ اُن دونوں کی گفتگو سن کر عاطف کو اندازہ ہوا کہ وہ پہلے بھی ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں مگر انھیں تخلیے کا موقع آج پہلی بار ملا ہے۔

اصغر اپنے مخصوص، میٹھے اور پُرتاثر لہجے میں شہلا کو لیکچر دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ساری باتیں اُسے زبانی یاد ہوں اور اس نے انھیں ادا کرنے کی خوب مشق کی ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "ہاں، اوّل تو اس فانی دُنیا میں عصمت و عفت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور اگر ہوتی





بھی ہے تو وہ یقیناً بدن کے کسی ایک حصّے میں مقید نہیں ہوگی بلکہ سارے بدن میں خون کی طرح گردش کر رہی ہوگی۔" اصغر نے شہلا کا نرم ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں بھر لیا اور مسکرایا۔ "میں نے تمہارا ہاتھ چھو لیا، وہ تقدس ختم ہوگیا جس کی تم دعوے دار ہو۔" پھر شہلا کے کسمسانے کے باوجود وہ اس کے اور قریب کھسک کر بولا۔ "میں نے تمہیں چوم لیا، تمہاری وہ عفت جاتی رہی جس پر تمہیں ناز ہے، اب میں تمہارے قریب ہوں، اتنے قریب کہ تمہارے دل کی دھڑکنیں صاف سن سکتا ہوں۔ عفت کیا بلا ہے؟ عصمت کس چڑیا کا نام ہے؟ عورت اور مرد جب قریب ہوتے ہیں تو وہ صرف عورت اور مرد رہ جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر پوری طرح اعتبار کرتے ہیں۔" شہلا اس کی گود میں مچلنے لگی، اصغر نے اپنے بازو کچھ اور کس لیے۔

"اب تم مجھ سے کیا چیز بچا رہی ہو؟ کس چیز کی حفاظت کر رہی ہو؟ اس چیز کی حفاظت جو اس سماج کے ناپختہ ذہنوں کا بے وجود ہیولا ہے؟"

"لیکن....." شہلا کی گھنٹی جیسی آواز ابھری۔ اس نے رندھی ہوئی سرگوشی میں کچھ کہنا چاہا مگر اصغر نے اس کے گلابی ہونٹوں کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ کہنے لگا۔ "ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے؟ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرنا چاہیے۔ تم نے میر تقی میر کا نام سنا ہے؟"

"ہاں میری اردو کی کتاب میں ان....."

اصغر نے شہلا کی جھجکار پر حاوی ہوتے ہوئے کہا۔ "شاید تم نے ان کا یہ شعر پڑھا ہو ؎

مت کہو اتحاد ہے ہم کو
یہ کہو اعتماد ہے ہم کو

"پڑھا تو ہوگا، یاد نہیں ہے۔" شہلا اس طرح خفیف ہوگئی جیسے کلاس ٹیچر نے اسے بھری کلاس میں ذلیل کر دیا ہو۔

"یہی باتیں تو یاد رکھنے کی ہوتی ہیں گڑیا۔" اصغر نے اس پر ایک بھرپور نگاہ کی۔ "ارے تم بوکھلوں کی طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ جگہ اپنی ہے، یہ گھر اپنا ہے، میرا یہ دوست جو یہاں رہتا ہے، بے چارہ بڑا دردمند انسان ہے۔ اطمینان سے بیٹھو بلکہ سرہانے سے سر ٹکا لو۔"

"نہیں نہیں، میں ٹھیک بیٹھی ہوں۔"

"اچھا، جیسے تمہاری مرضی۔" اصغر نے اپنا کوٹ پائنتی سے اٹھا کر احتیاط کے ساتھ لٹکا دیا اور دوبارہ شہلا کی طرف مڑا۔ "تم بہت عقل مند اور زود فہم لڑکی ہو، تم جیسی ذہین اور طباع لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لڑکیوں سے میری ملاقات ہی بہت کم ہوتی ہے۔ ویسے لڑکوں میں بھی اتنی ذہانت مشکل ہی سے ملتی ہے، تمہاری ذہانت ہی نے تو مجھے تمہارا گرویدہ کیا ہے۔"

شہلا کے رخسار اور دہکنے لگے، اصغر اسی پُراثر لہجے میں بولا۔

"انسان کی زندگی حباب کے مانند ہے، ابھی ہے، ابھی نہیں ہے، جو لمحہ گزر گیا، وہ گزر گیا۔ ماضی ہم سے بچھڑ چکا ہے، مستقبل کا کوئی بھروسا نہیں، وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں سے ہمیں صرف ایک بوند ملی ہے، صرف ایک لمحہ، وہ لمحہ جو ہمیں اس وقت میسر ہے۔ برطانیہ میں ایک فلسفی تھا تم نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ لارڈ برٹرینڈ رسل، ساری دنیا جانتی ہے، اس نے کہا ہے کہ جب میں کسی نوجوان جوڑے کو کسی درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے راز و نیاز میں محو پاتا ہوں تو وہ مجھے دنیا کے سب سے خوش قسمت لوگ نظر آتے ہیں کیونکہ یہ لمحے جو وہ گزار رہے ہیں، یہ ان کی زندگی کے سب سے قیمتی اور سنہرے لمحے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں، اس نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا، یاد نہیں رہا۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے، دنیا بھر کے پڑھے

لکھے لوگ یہی بات کہتے ہیں۔ اگر تم اسی طرح گُپ چُپ گُم سُم بیٹھی رہو گی تو وقت نکل جائے گا اور یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔"

شہلا غور سے اس کی باتیں سُن رہی تھی اصغر کے دقیق اور تقریباً ناقابلِ فہم الفاظ اُسے بے حد مرعوب کر رہے تھے، شاید اصغر اس نکتے پر یقین رکھتا تھا کہ لڑکی خود کو محبوب پر نثار کرنے کے لیے کسی دلیل کی منتظر رہتی ہے ترغیب سے بڑی دلیل کیا ہو گی؟ اور اصغر تو مسلسل دلیلیں دے رہا تھا۔ عاطف دروازے کے ساتھ کھڑے کھڑے تھک چکا تھا مگر اُس کی آنکھ جھری سے نہیں ہٹتی تھی اور وہ ہمہ تن گوش تھا۔

اور اصغر نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے شہلا سے کہا۔ "جو لمحہ ہمیں اس وقت میسر ہے اُس سے ہمیں مکمل فائدہ اُٹھانا چاہیے، ہم اسے جتنا خوش گوار بنا سکتے ہیں بنانا چاہیے ؎

کیا ہے جز ایک لمحہ موجود — سو تجھی پر نثار ہوتا ہے"

شعر شہلا کی سمجھ میں آیا یا نہیں آیا مگر اُس نے اس طرح گردن گھمائی اور آنکھیں پٹ پٹائیں جیسے اب اُس کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہو چنانچہ شہلا نے اپنے آپ کو ذہین ثابت کیا اور وہ اس ناپائدار لمحے کو لمحہ جاوداں بنانے پر آمادہ ہو گئی، اس کی دوشیزگی کا پندار اصغر کے فلسفیانہ نکات کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا۔

عاطف کے پاؤں لرزنے لگے۔ اس کا ہاتھ زور سے دروازے پر پڑا اور چند لمحوں تک خاموشی رہی، اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ توڑ دے اور کمرے کو آگ لگا دے لیکن شہلا کو کسی طرح بچا لے، مگر اُس کے قدم بوجھل ہو گئے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکا کہ دروازے سے ہٹ گیا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے پھر جھانکا تو حسین اور زرخیز شہلا کے لمبے لمبے بال پُشت پر نیچے تک بکھرے ہوئے تھے اور وہ اصغر کے کھلے سینے میں منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی، اصغر اپنے رُومال سے شہلا کے آنسو خشک کرتا ہوا کسی نئے سگریٹ کا دُھواں اُڑا رہا تھا۔ عاطف کے پیروں میں مزید لڑکھڑانے کی طاقت نہیں رہی۔

❋ ❋

افتخار کی دوست ریحانہ لطیف کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہو گی وہ ایک متوسط گھرانے کی پڑھی لکھی اور آزاد خیال لڑکی تھی، یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی، بے باکی اور زبان درازی اس کا نمایاں وصف تھا۔ اس کی باتوں سے سماج کی مسلّمہ قدروں کے خلاف سرکشی اور بغاوت کی بُو آتی تھی، وہ اگر مغرب میں ہوتی تو شاید اس کا تعلق ہپیوں کے گروہ سے ہوتا۔

وہ بڑی بے پروائی سے آتی، آتے ہی اپنی ضخیم کاپی اور کتابیں ایک طرف پھینک کر کُرسی گھسیٹ کے بیٹھ جاتی یا دوڑ کر مسہری پر اوندھی لیٹ جاتی، جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو اور عاطف اس کا ملازم ہو، ریحانہ، افتخار جیسے کھلاڑی پر حاوی تھی، تخلیے میں بھی وہ اس پر محبوبانہ تسلط جمائے رکھتی، افتخار مُسکرا مُسکرا کر اس کا یہ رویّہ برداشت کرتا۔

وہ افتخار کی موجودگی میں قطعاً بے جھجک ہو کر عاطف سے ہر طرح کی گفتگو کرتی اور ہر معاملے میں خود کو جدت پسند اور اقدار شکن ثابت کرنے کی کوشش کرتی، اسے قائل ہونا نہیں آتا تھا، اس کی سرکشی اور باغیانہ باتوں پر عاطف کئی بار کھولا۔ ایک دن زچ ہو کر اس نے ریحانہ کو آئینہ دکھانا چاہا۔ کہنے لگا۔ "تم ماشاءاللہ شریف خاندان کی لڑکی ہو پھر بھی ایک غیر لڑکے کے ساتھ اس طرح آزادانہ یہاں چلی آتی ہو، کیا تمھیں اس کا انجام نہیں معلوم؟ کیا تمھارے گھر والوں کو تمھاری ان سرگرمیوں کا علم ہے؟ بتاؤ۔"

"نہیں"۔ اُس نے تُنک کر اعتراف کیا۔

افتخار خاموشی سے اس نوک جھونک کا لطف لے رہا تھا۔ عاطف نے کہا۔ "محترمہ! معلوم ہوتا ہے آپ کے والدین کو آپ پر بہت اعتماد ہے اسی لیے . . . . . "

"ہاں اعتماد تو ہے"۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق فوراً بات کاٹ دی، اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں، پھر اُس نے پوچھے بغیر عاطف کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا اور کھانس کر بولی۔ "تم پچھلی صدی کے آدمی معلوم ہوتے ہو، صرف والدین کے اعتماد سے کیا ہوتا ہے، اولاد کو بھی تو اُن پر اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ ہمارا مزاج اور معیار سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ہمیں ہماری مرضی کے خلاف کہیں نہیں باندھیں گے۔ عجیب بات ہے تم ایسی باتیں کر رہے ہو"۔ اُس نے ایک کش لگایا اور سگریٹ افتخار کو دیتے ہوئے شوخی سے کہا۔ "لو پیو۔ میرے منہ کا سگریٹ تمھیں لطف دے گا۔"

ریحانہ کے بھرے بھرے ہونٹوں اور چمکدار آنکھوں میں غضب کی جاذبیت تھی، اس کے دانت سچے موتیوں کی طرح شفاف اور

روشن تھے، ایک مرتبہ عاطف نے بہت اصرار کرکے افتخار کو اعتماد میں لیا اور ریحانہ سے ذرا الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے پہلے ہی اقدام پر وہ ایک دم بپھر گئی۔ اس نے فوراً ٹوک دیا: "دیکھیے مسٹر! اوقات میں رہیے۔ آپ افتخار کے دوست ہیں اس لیے میں آپ کے گھر آ جاتی ہوں، اس سے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیے گا۔ آپ سیدھے آدمی ہیں، میں آپ کی قدر کرتی ہوں، بات یہیں تک رہنے دیجیے۔"

"قدر تو میں بھی آپ کی کرتا ہوں۔" عاطف نے ہمت کی۔ "اور جانتا ہوں کہ آپ کا متناسب بدن ایک ایسا دعوت نامہ ہے جو آپ صرف اپنی پسند کے لوگوں کے نام جاری کرتی ہیں۔ واقعی آپ جیسی نادر لڑکیاں اس زرخیز معاشرے نے کم پیدا کی ہوں گی۔ روایت شکنی کا کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے مگر کسی دن کوئی آپ سے زیادہ سرکش شخص آپ سے یہ اختیار چھین لے گا۔"

سترہ سالہ سرو قد نسرین، خالد کی محبوبہ تھی، ایک شائستہ، خوبصورت اور بہادر لڑکی، خالد سے اس کی محبت محض اتفاق پر مبنی تھی اور ایک عجوبے سے کم نہیں تھی۔

ایک دن خالد کہیں ٹیلی فون کر رہا تھا، نمبر غلط ڈائل ہو گئے۔ دوسری طرف سے توقع کے خلاف کسی لڑکی کی نہایت سُریلی آواز نے کانوں میں رس گھولا: "ہیلو۔ کون ہے؟"

خالد کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اُس نے اپنی پاٹ دار آواز میں یہ فلمی شعر سنا دیا ؎

عشق کہتے ہیں مجھے حسن کا دیوانہ ہوں
حسن والے مرا ارمان کیا کرتے ہیں

دوسری طرف سے جواب ملا: "بڑی خوش فہمی ہے آپ کو؟"

خالد کو اپنی پبلک ریلیشننگ اور شخصی وجاہت پر ناز تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے برجستہ کہا: "یہ خوش فہمی نہیں، حقیقت ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔"

لڑکی بھی موڈ میں تھی، چنانچہ اسی قسم کے دو چار جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر اس نے خالد کو اپنے کالج کا پتہ بتا دیا۔ یہ ایک مخلوط کالج تھا۔ خالد دوسرے دن واقعی وہاں جا پہنچا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملے اور ایسے ملے کہ پھر نہ بچھڑے، عاطف کے فلیٹ نے یہ دوستی اور مستحکم کر دی

---

ایک موقع پر کسی نے سکندرِ اعظم سے پوچھا۔ "تم اپنے باپ کے مقابلے میں ارسطو کی عزت بہت زیادہ کرتے ہو، جبکہ باپ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہیں یہ جسمانی زندگی عطا کی ہے۔"

ارسطو نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے لیکن باپ نے اگر مجھے جسمانی زندگی عطا کی ہے تو اُستاد نے مجھے رُوحانی زندگی۔

ان دونوں کے عطیات میں بس فرق اتنا ہے کہ باپ کی بخشی ہوئی جسمانی زندگی فانی ہے جو کچھ مدت بعد ختم ہو جائے گی اور استاد ارسطو کی عطا کردہ رُوحانی زندگی لافانی ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ اب تم خود ہی اس بات کا فیصلہ کر لو کہ دونوں میں کون زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ وہ جس نے فانی زندگی بخشی یا وہ جس نے لافانی حیات عطا فرمائی ہے۔"

---

نسرین دولت مند تاجروں کی ایک ایسی برادری سے تعلق رکھتی تھی جہاں صرف آپس میں شادیاں کی جاتی ہیں تاکہ گھر کا پیسہ گھر ہی میں رہے، گھر کی دولت باہر نہ جائے۔ لیکن نسرین نے خاندان سے بغاوت کر کے، محل، دولت، پیرالات اور کے تمام آسائشیں ٹھکرا کر تلاش خالد سے محبت کی اور اتنے ٹوٹ کر محبت کی کہ خالد بھی اس کے بوجھ سے ٹوٹ گیا۔ نسرین نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی کہ خالد دو بچوں کا باپ ہے اور اُس کی پہلی بیوی موجود ہے۔ زبردست لگاوٹوں، رنگینیوں سے گزر کر اُس نے خالد سے شادی کر کے ہی دم لیا۔

عاطف کبھی کبھی حیرت سے سوچتا کہ کیا کسی فلمی شعر میں اتنا گہرا اور پائیدار اثر بھی ہو سکتا ہے؟ نسرین اور خالد نے محبت کے ابتدائی مراحل عاطف کے گھر پر عاطف کے سامنے طے کیے تھے۔ نسرین جب بھی آتی، کمروں کی خوب صفائی کرتی اور ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر سلیقے سے رکھ جاتی۔ یہ کام اسے اپنے ماں باپ کے گھر میں کبھی نہیں کرنے پڑے ہوں گے۔

شادی کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ البتہ کچھ مہینوں بعد خالد نے ٹیلی فون پر عاطف سے کہا: "شاید تمہارے فلیٹ کی ضرورت پڑ جائے۔ خیال رکھنا۔"



ناہید کی عمر اٹھارہ اور بیس برس کے درمیان ہو گی، اُسے عاطف کے دوست آفاق نے غالباً کسی پوشیدہ سائنسی حقیقت کی طرح

بڑی جستجو اور محنت سے دریافت کیا تھا۔ اس لیے اُس پر اپنا اتنا حق سمجھتا تھا جیسے کوئی موجد اپنی ایجاد پر حق رکھتا ہے، یوں تو سبھی محبوب تنگ دل ہوتے ہیں مگر آفاق کا دل کچھ زیادہ ہی چھوٹا تھا۔ اس کی ایک دوسری لڑکی سے باقاعدہ منگنی ہو چکی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بیش قیمت انگوٹھی جگمگاتی رہتی تھی۔ عنقریب شادی بھی ہونے والی تھی، ناہید جیسی تازہ اور شگفتہ لڑکی سے آفاق کے ملنے کا مقصد بہرِ دل کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آفاق ناہید کی زندگی کا پہلا مرد تھا جس پر وہ ایمان لائی تھی۔

عاطف ان تجربات سے ہراساں ہو کر سوچتا کہ کیا فلمیں دیکھنے، ناول پڑھنے اور سہیلیوں کے قصے سننے والی تمام لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ کیا سب لڑکیاں جوان ہو کر کسی بھی نوجوان کو خوش آمدید کہنے کے لیے مستعد رہتی ہیں؟ جیسے ہی کوئی شخص ان کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے وہ تھوڑی بہت ردّ و قدح کے بعد اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتی ہیں۔ عاطف جب جھری کے ذریعے اندر جھانکتا تو اسے تمام مرد ایک جیسے نظر آتے لیکن باہر نکل کر وہ کتنے مختلف دکھائی دیتے تھے؟

ایک شام آفاق نے عاطف سے کہا ”میں کل دس بجے کے قریب ناہید کو لے کر تمھارے حجرے میں آ رہا ہوں، کچھ دودھ، مٹھائی اور پھلوں وغیرہ کا انتظام کر رکھنا، ذرا معاملہ ایسا ہی ہے۔“

دوسرے دن وہ سمٹی سمٹائی برقع پوش ناہید کو لے کر آ گیا، ناہید کی پلکیں اُوپر نہیں اُٹھ رہی تھیں، آفاق نے غالباً اُس پر اپنا بہت رنگ جما دیا تھا، وہ باتوں اور لفظوں کے جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ اصغر کی طرح وہ بھی دلیلوں سے کام لیتا تھا، بے چاری ناہید آفاق کے ساتھ ایک شوہر پرست بیوی کی طرح پیش آ رہی تھی، ہر نئی آنے والی لڑکی کی طرح اُس سے بھی عاطف کا تعارف ہوا۔ اُس نے اسے ”عاطف بھیّا“ کہہ کر مخاطب کیا۔ عاطف کی آنکھیں نمناک ہو گئیں، ناہید کے لباس سے غربت اور چہرے بشرے سے سادہ لوحی ٹپکتی تھی، آنکھوں میں اُمید کی شمع روشن تھی، مگر عاطف اپنی غریب بہن سے یہ نہیں کہہ سکا ”اے سادہ دل لڑکی! تجھے شاید یہ بات معلوم نہیں کہ جس شخص پر تو اُس قدر فریفتہ ہے اُس کی حیثیت ایک پرندے کی سی ہے جو کھیت چُگ کر پھر سے اُڑ جاتا ہے اور پھر کسی دوسرے گلشن میں اپنا آشیانہ بناتا ہے۔“

اُس روز ناہید آفاق کے لیے بچھی جا رہی تھی، لیکن عاطف نے جھری سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ اُس کی طرف سے مکمل سُپردگی کے باوجود آفاق کے چہرے پر وہ کیفیت نہیں تھی جو عاطف اپنے گھر آنے والے دوسرے دوستوں کے چہروں پر دیکھ چکا تھا۔ آفاق پسینے میں نہا رہا تھا۔ عاطف نے ایک گونہ اطمینان محسوس کیا۔

اُنھیں اندر گئے ہوئے کوئی دو گھنٹے گزر گئے تھے، عاطف تھک کر جھری سے چلا آتا اور جب دوبارہ دیکھتا تو اُس منظر میں کوئی خاص تبدیلی نہ پاتا۔ مگر پھر جلد ہی ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور پہلی بار اُس پر سرشاری کا غلبہ ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے آفاق کو شکست دے دی ہو۔

تمام حجت کے بعد کہیں دروازہ کھلا تو اُن دونوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ عاطف اُن کی خجالت ختم کرنے اور توجہ ہٹانے کے لیے ہنس ہنس کر دلچسپ باتیں کرنے لگا۔ اور باتوں باتوں میں اُس نے ناہید سے اپنی اذیت ناک تنہائی کا رونا بھی رو دیا اور کہا ”بی بی! تم کسی اچھی لڑکی سے مجھے ملوا دو، میں اُس سے شادی کر لوں گا، میرا کوئی نہیں ہے۔“

ناہید اس فرمائش پر چونک پڑی، آفاق نے شاید کچھ خطرہ محسوس کیا اور اسے فوراً دوسری باتوں میں اُلجھا لیا۔

تیسرے چوتھے دن عاطف صبح کے وقت دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ”کون؟“ وہ زور سے چیخا۔ کوئی جواب نہیں آیا مگر دستک دوبارہ ہوئی ”نہ معلوم کون آ گیا اِس وقت؟“ وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا دروازے پر پہنچا اور وہاں قطعاً غیر متوقع طور پر ناہید کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ”آئیے آئیے“ وہ بڑی عزّت سے اُسے اندر لایا۔ ناہید ایک کرسی پر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

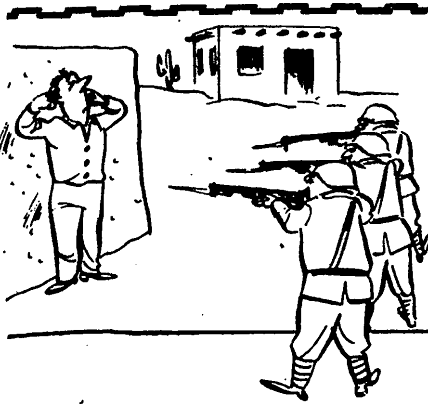
”کہیے“ عاطف نے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا ”کیا آفاق بھی آنے والے ہیں؟ مجھ سے تو انھوں نے آنے کے لیے نہیں کہا تھا، شاید کہنا بھول گئے ہوں۔“

”جی نہیں۔ میں خود آئی ہوں۔“ ناہید نے دبی زبان سے کہا اور چُپ سادھ لی۔ پھر چند لمحوں کے توقف سے بولی ”انھیں بتائیے گا بھی نہیں۔“

عاطف کچھ نہیں سمجھا۔ ہکا بکا ہو کر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ عاطف نے پوچھا ”خیریت تو ہے؟“

”جی۔۔۔ جی ہاں۔“

"آفاق سے ملاقات ہوئی تھی؟" عاطف نے ٹوہ لی۔
"جی نہیں"۔ اُس کے رخساروں کا رنگ جلدی جلدی بدل رہا تھا۔ عاطف تذبذب سے اُٹھا اور آئینے کے سامنے ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا۔ وہ کھڑی ہوگئی "آپ شاید آفس جا رہے ہیں؟"
"جی ہاں۔ ارادہ تو ہے"۔
"تو میں چلتی ہوں..." پھر اُس نے بڑی مشکل سے کہا "اماں نے آپ کو بلایا ہے"۔
اماں نے؟ کیوں؟" عاطف اُس کی طرف حیرت سے مڑا۔
"وہی بتائیں گی"۔ ناہید نے برقع کا پلو دانتوں میں دبا لیا۔
"لیکن آپ کی اماں مجھے کیسے جانتی ہیں؟"
"میں نے ذکر کیا تھا... آیئے گا ضرور۔ ضروری کام ہے"۔ اُس نے اپنے گھر کا تفصیلی پتہ لکھ کر دے دیا۔
اتوار کے دن عاطف عجب گومگو کی حالت میں ناہید کے گھر پہنچا۔ وہ اس کے سامنے نہیں آئی۔ اُس کی بیوہ ماں نے اپنی بساط سے بڑھ کر عاطف کی خاطر مدارات کی۔ اس نے خاصی طولانی اور بے معنی گفتگو کے بعد بڑی عاجزی کے ساتھ عاطف سے کہا "بیٹا! اگر تم مناسب خیال کرو اور اس گھر کو کسی لائق سمجھو تو میری ناہید کو قبول کرلو۔ ناہید نے مجھے بتایا تھا کہ تم اپنا گھر بسانا چاہتے ہو۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں، شریف لڑکے ملتے کہاں ہیں"۔
وہ جلد جواب دینے کا وعدہ کر کے وہاں سے آگیا۔ ناہید کے محبوب آفاق سے اُس کی تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی مگر عاطف اُس کی افتادِ طبع سے واقف تھا اس لیے اُس نے مصلحتاً اس سلسلے میں آفاق کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر ایک روز اُس نے گفتگو کے دوران میں آفاق سے ناہید کا ذکر چھیڑ دیا اور اُس سے پوچھا "ناہید کے متعلق کیا خیال ہے؟"
"کوئی خیال نہیں ہے"۔
"تم ناہید سے شادی تو یقیناً نہیں کرو گے؟" عاطف نے پوچھا۔
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" وہ تمسخر سے ہنسا۔
"مگر آفاق! یہ تو سوچو کہ وہ ایک غریب اور بیوہ عورت کی بیٹی ہے"
"پھر؟ تمھیں کیا تکلیف ہے؟"
"دیکھو نا اُس نے تمھیں خون سے خط لکھے ہیں، وہ خطوط تم نے



مجھے دکھائے تھے"۔
"میں نے معائنہ نہیں کرایا تھا کہ وہ خون ناہید کا تھا یا بکرے وغیرہ کا تھا۔ خون سے تو ہر لڑکی خط لکھنا چاہتی ہے۔ ہر لڑکی کے لیے آدمی سنجیدہ نہیں ہوسکتا۔ ویسے ناہید سے مجھے ایک تعلقِ خاطر ضرور ہے"
عاطف کسمسانے لگا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر ٹھیر ٹھیر کر بولا "کچھ بھی سہی، ناہید کی شادی ہونی چاہیے اور یہ کارِ خیر تمھارے ہاتھوں انجام پائے تو بہتر ہے کیوں کہ تمھیں اُس سے تعلقِ خاطر کا دعوا ہے"۔
"خوب! مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میری منگنی ہوچکی ہے"۔
"تو..." عاطف نے جھجکتے ہوئے لہجے میں سوال کیا "تو تم ناہید کو کیوں خراب کرنا چاہتے ہو؟"
"تم مصلح کب سے بن گئے۔ اِس سوسائٹی میں کون سی لڑکی پاک باز ہے، کیا کسی کے بارے میں تم دعوا کرسکتے ہو؟ مجھے تو اپنی منگیتر پر بھی یقین نہیں ہے، صرف کمٹ منٹ کی بات ہے"۔ آفاق کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
عاطف نے نرمی سے کہا "خیر کمٹ منٹ تو تم نے ناہید سے بھی کیا تھا... بہرحال سنو! اتفاق سے ناہید کی والدہ مجھے ایک جگہ مل گئی تھیں، ان کی خواہش ہے کہ میں ناہید سے شادی کرلوں اگر تمھیں کوئی اعتراض......"
عاطف کو اُمید نہیں تھی مگر آفاق یکایک چراغ پا ہوگیا "مجھے پڑھانے کی کوشش نہ کرو عاطف! میں تم جیسوں کو اپنی جیب میں رکھتا ہوں، میں اب سمجھا کہ ناہید اُس دن کے بعد سے غائب کیوں ہے؟

تم نے اُسے درمیان سے اُڑا لیا ہے۔ تم نے دوست ہو کر مجھ سے غداری کی ہے۔ میں تمھارے بارے میں اب تک سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ تم پر اعتبار کیا جائے۔ دوست تو اُسے کہتے ہیں جو اپنے دوست کی کسی منظورِ نظر طوائف کے پاس بھی نہیں جاتا۔ تم نے تو میری محبوبہ پر ہاتھ ڈال دیا۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر۔ تم تو بہت چھوٹے نکلے۔“

”مجھے غلط نہ سمجھو آفاق!“ عاطف نے درشتی سے کہا۔ ”اسے غداری نہ سمجھو۔ اگر میں غدار ہوتا اور میری نیت خراب ہوتی تو میں تمھاری معشوقہ کے بجائے تمھاری منگیتر کو ورغلانے کی کوشش کرتا۔ اسے بھی تو تم میرے گھر لا چکے ہو۔“

آفاق آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اتنا قیل مچایا۔ ہمیلیا ہنگامہ بپا کیا کہ عاطف کو ہمیشہ کے لیے اُس کے پاس سے اٹھ کر آنا پڑا۔ پھر بھی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ معصوم ناہید سے شادی ضرور کرے گا۔ اس سلسلے میں اس نے بہت سے سُہانے خواب دیکھے اور کئی خوش گوار منصوبے بھی بنا لیے۔ ناہید حیرت انگیز طور پر بڑی سرعت سے اس کے تصورات میں رچ بس گئی۔

لیکن آفاق نے معلوم نہیں کیا تماشا کیا۔ کیسی چال چلی کہ جب عاطف کوئی ایک ہفتے بعد مٹھائی وغیرہ لے کر بڑی امیدوں کے ساتھ ناہید کے گھر پہنچا تو اُس کی ماں نے نہایت حقارت اور نفرت سے اسے دھتکار دیا۔



اس واقعے کے بعد عاطف بے حد دل برداشتہ ہو گیا۔ وہ بکھر گیا۔ اس نے سب دوستوں کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ آیندہ کسی لڑکی کو لے کر اس کے ہاں نہ آئیں۔ اس نے وہ کمرہ ہی استعمال کرنا چھوڑ دیا جہاں لڑکیاں آتی تھیں۔ رات کو دوسرے کمرے میں صوفے پر سو جاتا تھا۔ سارا گھر اسی کی طرح بکھر گیا تھا۔

طبیعت کے انتشار اور تکدر کا اثر جسم پر بھی ہوا۔ اس کا دل ڈوب سا گیا تھا۔ اس نے زندگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ وہ دفتر میں ہمیشہ مستعدی سے کام کرنے والا شخص تھا مگر اب لوگ اُسے بے پروا اور کاہل سمجھنے لگے تھے۔ اسی کیفیت میں چھ مہینے گزر گئے۔

دفتر کے ایک بزرگ ساتھی کو اس کی حالت پر بہت تشویش تھی۔ وہ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اکثر پرسشِ احوال کرتے رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے عاطف کو کچھ ایسی شفقت سے شادی کی ترغیب دی اور اس کے فائدے گنوائے کہ وہ بے چون و چرا تیار ہو گیا۔ پھر اُن کی بیوی نے یہ مہم سر کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور سات روز کے اندر اندر عاطف کی رضامندی سے ایک اچھے خاندان میں چُپ چاپ شادی کی بات پکی کرا دی۔ منگنی ہو گئی اور اس کی طبیعت بحال ہونے لگی۔



رنگ برنگے قمقموں کی آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی روشنیوں میں عاطف کے دوست احباب ہنسی مذاق کرتے ہوئے اُسے حجلۂ عروسی کی طرف لے جا رہے تھے۔ دروازے تک پہنچا کر انھوں نے برجستہ کچھ فقرے کسے اور پلٹ کر نیچے شامیانے میں آ گئے اور خوش گپیاں کرنے لگے۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عاطف گریباں چاک کسی پاگل کی طرح نیچے آیا۔ سب دوست کھڑے ہو گئے۔ خالد نے کہا۔ ”کمال ہے، تم یہاں کیسے؟ بڑے بدذوق آدمی ہو۔“

عامر نے پوچھا۔ ”پھیر حلال کر لی؟“

عاطف نے کوئی جواب نہیں دیا اور کسی کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔ اس نے صرف اصغر کو اشارے سے قریب بلایا۔ اصغر ہنسا۔ ”اچھا، سمجھا! میرے تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟ آج کی رات فیس معاف، مفت مشورہ دوں گا۔“

دوستوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

عاطف نے گھبرا کر اصغر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

اصغر نے پُرمعنی انداز میں مسکرا کر دوستوں کی طرف دیکھا اور عاطف کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر عاطف رُک گیا۔ اُس نے اصغر کے چہرے پر سمجھ میں نہ آنے والی ایک نظر ڈالی اور اندر کی طرف اشارہ کیا۔ ”جاؤ، فرحت سے مل لو، وہ تمھارا انتظار کر رہی ہے۔“

”کون فرحت؟“ اصغر مجسم حیرت بنا ہوا تھا۔

عاطف نے شکست خوردہ لہجے میں اٹک اٹک کر کہا۔

”فرحت کو نہیں جانتے؟ اندر جاؤ گے تو پہچان لو گے، وہی تم نے جس کا نام شہلا رکھا تھا۔“ یہ کہہ کر عاطف نے مجنونانہ انداز میں اصغر کو اندر دھکیل دیا اور زور کے ساتھ دروازہ باہر سے بند کر کے وہیں گر گیا۔ آج اُسے جھری کے ذریعے اندر جھانکنے کی جستجو بھی نہیں تھی۔



**عرب نوجوان** جابر بن یوسف الباز کو اپنی زندگی میں ایسے غیر معمولی واقعات و حادثات سے سابقہ پڑا جنھیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ جابر بن یوسف ایک وجیہ، جذباتی، ضدی، اور شگفتہ مزاج نوجوان تھا۔ آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران اس کی ملاقات انگلستان کی حسین ترین لڑکی فلورا سے ہوئی مگر جابر اپنی تمام تر وجاہت، ذہانت اور مہارت کے باوجود اُس کا التفات حاصل نہ کر سکا۔ آخر فارغ التحصیل ہونے کے بعد جابر بیروت واپس آگیا۔ یہاں اس کا باپ پولیس کے ایک اعلا عہدے پر فائز تھا۔ بیروت میں ایک دن اچانک جابر کو فلورا نظر آئی۔ جابر بے تابانہ اُس سے ملا لیکن اُس کی غیر متوقع اور پُراسرار آمد کا مقصد معلوم نہ کر سکا۔ پھر جابر نے بڑے پُرتپاک اور پُرجوش انداز میں فلورا کو پورا بیروت گھمایا اور اس دوران میں برابر اُسے اپنے سے قریب لانے کی کوششیں کرتا رہا۔ جابر کی مہمان نوازی اور حسنِ سلوک سے فلورا بے حد متاثر ہوئی لیکن لیے دیے رہی۔ اُس کے محتاط رویّے نے جابر کی آتشِ شوق اور بھڑکا دی۔ بیروت میں چند روز قیام کے بعد فلورا کو ڈربن جانا تھا۔ اُس نے جابر کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ جابر کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔ حُسنِ اتفاق سے اُنھی دنوں جابر کے باپ نے اُسے ایک بند سرکاری لفافہ لے کر ہانگ کانگ جانے کی ہدایت کی۔ جابر ہانگ کانگ روانہ ہونے کے بہانے فلورا کے ساتھ ڈربن جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔ جہاز میں سفر کے دوران میں ایک دفعہ جابر نے فلورا کو ایک پستہ قد اجنبی مسافر سے رازدارانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی طرف سے مشکوک ہوگیا لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔ ایک دن وہ بے خیالی میں ریلنگ کے قریب ایک بدہیئت اور بوڑھی افریقی ساحرہ سے ٹکرا گیا۔ ساحرہ عجیب و غریب قسم کے ہار، مالائیں اور زیورات پہنے ہوئے تھی۔ ٹکر لگنے سے اُس کے گلے میں پڑی ہوئی ایک مالا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی اور اُس میں لٹکی ہوئی نیولے کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی۔ بوڑھی ساحرہ کی حالت ایک دم متغیر ہوگئی۔ وہ افریقی زبان میں مقدس جاراکاکا کے نام سے جابر کو بددُعائیں دینے لگی اور زیرِلب کچھ بڑبڑاتی ہوئی اچانک سمندر میں کود گئی۔ اس حادثے نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ اُسی شام جہاز ایک زبردست سمندری طوفان میں گھر گیا۔ تباہی کی آندھیاں چلنے لگیں۔ جہاز میں افراتفری پھیل گئی۔ انسانوں کی چیخ پکار نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وسیع و عریض جہاز ایک حقیر تنکے کی طرح سمندر میں ڈول رہا تھا۔ اور جب بہت دیر بعد یہ ہَول ناک طوفان تھما تو جہاز غرق ہوگیا تھا اور بیشتر مسافر سمندری اژدہوں کی خوراک بن چکے تھے۔ جابر اور فلورا کے علاوہ صرف نو افراد زندہ بچے تھے جو ایک حفاظتی کشتی میں سوار کسی نامعلوم منزل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ راستے میں سیاہ فام حبشی مسافر تومغا نے بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنے ساتھی یہودی مسافر کو قتل کر ڈالا اور اُس کے کچے گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔ سرنگاداس اور اس کی خوب صورت کنواری بیٹی سریتا کے سوا دوسرے تمام بھوکے مسافروں نے بھی تومغا کی تقلید کی اور آدم خور درندوں کی طرح یہودی کی لاش پر ٹوٹ پڑے۔ تومغا نے بڑی سفاکی سے یہودی کی بے نور آنکھیں نکال لیں اور کچھ جادوئی کلمات ادا کرتے ہوئے انھیں سمندر میں اُچھال دیا اور کہنے لگا۔ ”میں نے کشتی کو آنکھیں دے دی ہیں۔ اب ہم جلد ہی کسی جزیرے میں پہنچ جائیں گے۔“ دوسرے روز نوجوان انگریز طالبِ علم تومغا کے عتاب کا شکار ہوگیا۔ ان میں ایک ڈاکٹر بھی تھا جو تومغا کی دہشت انگیزی دیکھ کر دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اُسی روز ملاح جعفر بھی چل بسا اور پھر جب خدا خدا کر کے کشتی خشکی کے قریب آئی تو تومغا پر وحشت طاری ہوگئی اور وہ بھی پُراسرار طور پر کہیں غائب ہوگیا۔ یہ حرماں نصیب قافلہ پے در پے کلفتیں برداشت کرتا ہوا خشکی پر پہنچ گیا۔ مگر وہاں ایک اور مصیبت کھڑی تھی۔ ساحل پر رنگ ڈھنگ اور بدہیئت حبشیوں نے انھیں گھیر لیا اور نیزے برسانے لگے۔ اس اُفتاد سے مصری تاجر کمال موقع پر جاں بحق ہوگیا۔ جنگلیوں نے زندہ بچنے والے بدنصیبوں کو ایک جھونپڑی میں لے جا کر قید کر دیا۔ جابر افریقی زبان میں کچھ شُدبُد رکھتا تھا۔ اس نے جنگلیوں سے سُنا کہ اب ان قیدیوں کی قسمتوں کا فیصلہ مقدس آقا بلاکرے گی اور اس سے پہلے انھیں جنگلیوں کے سردار شوالا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ زنداں کی پہلی رات فلورا بہت دہشت زدہ تھی۔ جابر تسلی دیتا ہوا اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر سو گیا۔ رات گئے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور یہ دیکھ کر سخت سراسیمہ ہوا کہ فلورا وہاں موجود نہیں تھی۔

**فلورا** کی گم شدگی نے جابر کے ہوش و حواس معطل کر دیے۔ سرنگاداس کے سوا تمام لوگ غافل سو رہے تھے۔ سرنگا کی جیب میں ہمیشہ ایک مورتی رکھی رہتی تھی۔ اُس نے مورتی نکال کر نہایت اطمینان اور احترام سے اُسے چوما اور جابر کو تشفی اور دلاسے دینے لگا مگر جابر کا اضطراب و اضطرار کم نہ ہوا۔ وہ بڑی بے چینی سے اُٹھ کر جھونپڑی کے دروازے تک گیا۔ وہاں حبشی پہرے داروں کی سرگوشیوں سے جابر پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ فلورا کو قبیلے کی طاقت ور سردار شوالا نے اپنے لیے منتخب کر کے اغوا کروایا ہے۔ جابر غصّے اور بے بسی کے عالم میں سر کے بال نوچنے لگا۔ اسی طرح نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ پھر فلورا غیر متوقع طور پر دوبارہ جھونپڑی میں پہنچا دی گئی۔ فلورا کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ چہرے کے سوا اُس کے سارے بدن پر بچھوؤں جیسے بے شمار چھوٹے چھوٹے زرد کیڑے رینگ رہے تھے۔ توشا اور نیری نامی دو سیاہ فام برہنہ دوشیزائیں اُس کی نگرانی پر مامور تھیں۔ اپنی محبوبہ کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر جابر کا خون کھول اُٹھا مگر اس کا بوڑھا ساتھی سرنگاداس اشتعال انگیز حد تک ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ سخت سے سخت مصیبت بھی اُسے برہم، برافروختہ اور خوف زدہ نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک صاحبِ اسرار آدمی تھا۔ اُس کی ہر بات میں کوئی راز تھا، کوئی بھید تھا جس کی تہ تک جابر جیسے ذہین شخص کی عقابی نگاہیں بھی پہنچنے سے قاصر تھیں۔ سرنگا نے جابر کو جذبات پر قابو پانے اور پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور مشورہ دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سیاہ فام دوشیزاؤں کو مٹھی میں لے کر اس خطرناک جزیرے اور اس ننگِ انسانیت قبیلے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر لے تاکہ ان معلومات کی روشنی میں کوئی مناسب قدم اُٹھایا جا سکے۔ اگرچہ یہ ایک دقیق اور پُرپیچ مہم تھی لیکن جابر آکسفورڈ اور بیروت کا سند یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محنتی نوجوان بھی تھا۔ اُس نے غیر معمولی تگ و دو کے بعد آخر یہ مہم سر کر لی۔ تیکھے نقوش والی سانولی دوشیزہ توشا سے جابر کو معلوم ہوا کہ مقدس آقا بلا جاراکاکا کی نمائندہ ہے اور یہاں کی مطلق العنان حکمراں ہے۔ دُور کسی غار میں اس کا عظیم الشان قصر ہے۔ اُس نے قبیلے پر دو سردار شوالا اور کالاری نامزد کر دیے ہیں۔ شوالا تمام حشرات الارض کا مختار ہے اور درندے وغیرہ کالاری کے تصرّف میں ہیں۔ شوالا نے فلورا کو اپنے لیے منتخب کر لیا ہے اور اس کی تطہیر کے لیے یہ زرد رنگ کے کیڑے اس کے بدن پر متعین کر دیے ہیں۔ یہ پُراسرار کیڑے عورت کے شباب کی عمر بڑھاتے ہیں، حُسن نکھارتے ہیں اور بدن کو لذت انگیز اور معطر بنا دیتے ہیں۔ جابر نے نہایت تعجب کے ساتھ یہ بھی سُنا کہ جس شخص کے پاس جاراکاکا کی مقدس کھوپڑی ہوتی ہے وہ افضلیت اور اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے اور نحوستیں اُس سے دُور رہتی ہیں۔ ان معلومات کے معاوضے میں جابر نے نوعمر توشا کو پہلی بار ایک نئی لذت سے روشناس کرایا۔ وہ سرشار ہوگئی۔

**دوسرا دن** زبردست آلام و مصائب لے کر آیا۔ سفر کی صعوبتوں اور ناقابلِ یقین سانحوں کے تسلسل سے جابر کے مہربان ساتھی ڈاکٹر جواد کا ذہنی توازن اور مخدوش ہوگیا تھا۔ حبشیوں نے نہایت تعجب خیز اور انسانیت سوز طریقے سے ڈاکٹر کا علاج کیا۔ اسے ایک درخت کے ساتھ کس کے باندھ دیا گیا۔ اور حبشی طبیب نے ہتھوڑی اور چھینی کی مدد سے اس کے سر پر کاری ضربیں لگائیں۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر جابر اور اُس کے دُوسرے ساتھی اپنی فلک شگاف چیخیں نہ روک سکے۔ اس دہشت گردی کے بعد تمام قیدیوں کی پیٹھوں پر لکڑیوں کے بڑے بڑے وزنی گٹھڑ لاد دیے گئے اور انہیں خاردار جنگلوں میں میلوں بھوکا پیاسا چلوایا گیا۔ اسی اثنا میں ایک مسافر شیخ طاہر اچانک ہذیان بکتا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ فاصلے کے بعد غش کھا کر گر پڑا اور نہایت پُراسرار طریقے سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ اُس کے مُردہ سینے پر جاراکاکا کی کھوپڑی خود بخود منقش ہوگئی تھی۔ پہرے دار حبشیوں نے کھوپڑی کا نقش دیکھا تو یک آواز چیخے اور دردناک آہ و بکا کرتے ہوئے گھنی جھاڑیوں میں بھاگ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ سیاہ بخت مسافر پھر گھیر لیے گئے اور انہیں دوبارہ جھونپڑی میں قید کر دیا گیا۔ جابر ہر قیمت پر وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی منصوبے بنائے۔ سرنگا سے مشورے کیے۔ آخر رات کے وقت توشا اور نیری سے خوش فعلیوں کے بعد وہ باہر نکلا۔ اُس نے نہایت احتیاط، ہوشیاری اور بے جگری سے دو پہرے داروں کو ہلاک کر دیا۔ پھر راستے کے عجیب و غریب حادثات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا اُس اندھیرے غار میں پہنچا جہاں وہ طبیب رہتا تھا جس نے ڈاکٹر جواد کا وحشیانہ علاج کیا تھا۔ طبیب کے گلے میں ہر وقت جاراکاکا کی کھوپڑی پڑی رہتی تھی۔ جابر نے نہایت مستعدی اور چابک دستی سے طبیب کو ہلاک کر کے کھوپڑی قبضے میں لے لی۔ اب وہ کسی قدر محفوظ تھا۔ وہ رات بھر جنگلوں اور میدانوں میں بھٹکتا رہا۔ صبح صادق کے وقت یکایک لاتعداد حبشیوں کی چیخ پکار کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ایک سیارے کی طرح تیزی سے اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا۔ زبردست دوڑ دھوپ کے بعد اُسے ایک غار ملا۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر وہ دیوانہ وار اُس میں گھس



گیا مگر بیا ایک تاریک سرنگ بھی جابر نے ایسے سنبھالا تھا کہ اس ویران اور تاریک سرنگ میں ایک نسوانی قہقہے نے اس کا استقبال کیا۔ جابر وحشت زدہ ہو گیا۔ باہر سے حبشیوں کا خوفناک شور و غوغا موت کے پیغام کی طرح مشتاق سے رابطہ اور اندر یہ پُراسرار نسوانی قہقہہ۔

اس وقت سے بلائے ناگہانی سے جابر عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ تاریک غار کے اندر ایک پُراسرار طلسمی فضا اور باہر شور مچاتے ہوئے موت کے عفریت۔ اُس نے سُرنگ کی گہری تاریکی میں ہر جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس وحشت میں اس کے علاوہ ذہن نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ وہ جھکا، گرتا پڑتا غار کے اندر بڑھنے لگا۔ وہ کوئی سُرنگ تھی۔ کافی اندر جا کر اس کے دو راستے ہو گئے۔ اُس نے یونہی بائیں راستے پر قدم رکھ دیا۔ اسی لمحے ایک لطیف نسوانی آواز نے اسے ٹھہرنے کا حکم دیا اور جب جابر نے آواز کی سمت نشانہ باندھ کر تیر پھینکا تو وہ دیوار سے ٹکرا گیا اور پھر دلکش نسوانی قہقہوں سے سُرنگ گونجنے لگی اور یک بیک تمام سُرنگ روشن ہو گئی۔ ساتھ ہی کسی نے نہایت مترنم لہجے اور فصیح و بلیغ عربی میں اُسے مخاطب کیا۔ آقا بلالا کی عظمت کے گن گانے والے اور جابر کو سیدھے ہاتھ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے حکم کی تعمیل کی اور اندر جا کر اُسے پتھروں کا بنا ہوا ایک عالیشان دروازہ نظر آیا۔ جابر نے غیر ارادی طور پر وہاں لگی ہوئی ایک فولادی زنجیر کھینچی اور دروازہ آہستہ آہستہ کھل گیا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کسی قدیم یونانی طرز کے آراستہ و پیراستہ محل میں تھا۔ محل میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ صرف وہی نسوانی آواز۔ اس پر فردِ جرم عائد کر رہی تھی۔ جابر نے اس آواز کی عدالت میں معافی پیش کی اور بہت رد و قدح کے بعد وہ آواز مجسم شکل میں ظاہر ہوئی۔ اُس نے اس سے پہلے اتنی حسین لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے حسن میں گم ہو گیا اور سب کچھ بھول بیٹھا کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ وہ آقا بلالا کی ادنیٰ کنیز ژولین تھی۔ جابر نے کچھ ایسی وارفتگی اور جوش کا مظاہرہ کیا کہ ژولین بہکنے لگی اور جابر آکا کالا کی کھوپڑی جابر سے الگ رکھوا کر وہ اس کے سینے میں سما گئی لیکن جلد ہی ایک جھٹکے سے جابر کو علیحدہ کر کے کسی نامعلوم زبان میں گڑگڑانے لگی۔ اُس کی فریاد رائیگاں گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سُرخ و سپید بدن راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ جابر اس طلسمی تماشے سے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور غش کھا کر گر پڑا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں تھا۔ سرتیا، سرنگا، توشا اور تیری اُس کے پاس جابر آکا کالا کی کھوپڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ سرنگا کے اصرار پر اُس نے اپنی روداد سنائی۔ پھر جب خوفناک شولا عجیب ہیئت کذائی سے جھونپڑی میں آیا تو جابر کے گلے میں جابر آکا کالا کی کھوپڑی دیکھ کر سخت مشتعل ہو گیا۔ اس نے جابر کو کھوپڑی اتارنے کا حکم دیا جسے جابر نے سرنگا کے اشارے پر مسترد کر دیا۔ شولا نے غالباً اپنی برتری اور قوت ثابت کرنے کیلئے جھونپڑی سے باہر موت کا ایک خونیں ڈرامہ کھیلا۔ حسین توشا کو جابر سے تعلق پیدا کرنے پر آدم خور حبشیوں کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے لمحوں میں اُس کا جسم چاٹ لیا۔ سرتیا یہ منظر دیکھ کر بےہوش ہو گئی اور شولا نے جابر کو دو دن کی مہلت دی کہ وہ اس عرصے میں جابر آکا کالا کی کھوپڑی اس کے حوالے کر دے۔ رات کو تیری سے کچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے جابر نے اُسے اپنی جانب ملتفت کرنا چاہا۔ وہ اُس کی آغوش میں آ گئی لیکن اس نے جابر کے جذبات بیدار کر کے کہا کہ جابر آکا کالا کی کھوپڑی کی موجودگی میں یہ ہوس کاری جائز نہیں ہے۔ بدمست جابر نے کھوپڑی اتار دی مگر سرنگا آڑے آ گیا۔ اُس نے تیری کو خود سے علیحدہ کر دیا۔ رات کو اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تیری کھوپڑی اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جابر غصے سے بے قابو ہو گیا مگر اسی اثنا میں دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ایک پُراسرار گولے نے تیری کو لپیٹ میں لے لیا اور اُسے جلا کر بھسم کر دیا۔ اس لرزہ خیز واقعے کو دیر نہیں ہوئی تھی کہ سرتیا ہذیانی انداز میں جابر کے روکنے کے باوجود جھونپڑی سے باہر بھاگ گئی۔ جب جابر نے سرنگا کو جگا کر یہ وحشت انگیز داستان سنائی تو وہ بھی بدحواس ہو گیا۔ اس نے جیب سے مورتی نکال کر کوئی منتر پڑھا۔ وہاں ایک عورت نمودار ہوئی۔ سرنگا نے اُس کے پاؤں چھو کر کچھ کہا۔ عورت نے اُس کا جواب دیا۔ یہ زبان جابر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر وہ عورت حیرت انگیز طور پر غائب ہو گئی اور سرنگا حیران و پریشان جابر سے شدید اصرار کرنے لگا کہ وہ اُسے اُس سُرنگ تک لے چلے جہاں وہ کل رات گیا تھا۔

"سرنگا، میں کہتا ہوں اب تمہارا وہاں جانا بے سود ہوگا۔" میں نے اس وحشت زدہ شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اُس گلبدن ژولین کو اپنی نظروں کے سامنے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔"

"میری ہدایت پر عمل کرو عزیزم جابر۔ ایک ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لو اور دوسرا ہاتھ جابر آکا کالا کی کھوپڑی پر جما لو۔ ہمارا اس غار تک پہنچنا ضروری ہے جہاں تم ژولین سے ملے تھے۔" سرنگا نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"لیکن سرنگا، تم ——" میری آواز میں لکنت آ گئی

"دیر مت کرو عزیزم جابر۔ گھبراؤ نہیں۔ میں نے تم سے کہا نہیں کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ہم یہاں کب تک پڑے رہیں گے؟ اب سرتیا بھی غائب ہو گئی۔ طوطا تمہارے سامنے بے ہوش پڑی ہے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ہمارے ساتھیوں کو ختم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر جادو ابھی تک بیمار ہے۔ کیا تم یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہاں بیٹھے رہنا چاہتے ہو؟ کیا ہمیں کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیئے؟ کیا ہم ان وحشیوں کے ظلم و ستم کا اسی طرح نشانہ بنتے رہیں؟"

"سرنگا، سرتیا چلی گئی ہے تو تم اس طرح کی باتیں کرنے لگے ہو جو حرکت کی ابتدا تو میں نے کی تھی۔ تم اس وقت میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے، مجھے پُرسکون رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ طوطا اور سرتیا میں اتنا فرق ہے کہ سرتیا کی گمشدگی سے تمہارے سر دھڑ میں ابال آ گیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہماری کوئی کوشش کامیاب ہو گی؟ جادو، پُراسرار واقعات، چاروں طرف سمندر، یہ اجنبی چہرے یہ طلسمی ماحول اور ہماری ناتوانی۔ خاموشی اور سکون سے موت کے منتظر رہو۔ اب مفر کی کوئی صورت نہیں۔" میں نے زہرخند سے کہا۔ "یہاں تم کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیوں الجھن میں پڑے ہو؟ ژولین نے کہا تھا کہ آج تک کوئی اجنبی اس جزیرے سے واپس نہیں گیا۔ بس موت ہی ہمیں ان مصائب

سے نجات دلا سکتی ہے۔"

"جابر، کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب کیفیت وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ تم نے ایک غار کا پتہ چلا لیا ہے اور جارا کاکا کی مقدس کھوپڑی حاصل کر لی ہے اور میں نے اپنی دیوی سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ عزیزم یہ وقت تلخ باتیں کر کے گنوانے کا نہیں۔ ہمیں متحد ہو کر کچھ کرنا چاہیے۔ زندگی رہی تو تم مجھے بہت سے طعنے دے لینا۔" سرنگا کے لہجے میں شکستگی اور اضمحلال تھا۔

"فلورا یہاں اسی طرح تنہا پڑی رہے گی؟ اب اس کے پاس نوشاد اور نیری بھی نہیں ہیں۔ کیا ہمارا اسے تنہا چھوڑ کر جانا مناسب رہے گا؟ یہ ظلم ہے سرنگا۔"

میں نے فلورا کی جانب اشارہ کیا جو نیم جاں حالت میں تماشائے عبرت بنی وہاں پڑی ہوئی تھی۔ سامنے نیری کا جلا ہوا ڈھانچا تھا۔

اس بوڑھے پُرسکون شخص سرنگا کو میں نے پہلی بار مشتعل اور حواس باختہ دیکھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مکروہ چہرے والے حبشی سرتیا کے ساتھ بھی فلورا والا واقعہ دہرائیں گے۔ سرنگا بڑے اطمینان سے کہا کرتا تھا کہ وہ سرتیا پر ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے۔ اس کا یہ اعتماد کسی قدر بجا بھی تھا کیونکہ میں نے ابھی ابھی پتھر کی چھوٹی مورتی کو ایک ہندی عورت کی شکل میں نمودار ہو کر سرنگا سے کچھ باتیں کر کے غائب ہوتے دیکھا تھا۔ عورت کے غائب ہو جانے کے بعد سرنگا کے چہرے پر اطمینان سا نظر آیا تھا۔ میرے لیے اس کی شخصیت پہلے ہی پُراسرار تھی اب اور اس نے متاثر کر لیا تھا۔ لیکن میں ان پے در پے انوکھے اور ناقابلِ فہم واقعات سے کچھ ایسا دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اب زندہ رہنے اور آزاد ہو جانے کی موہوم سی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ سرنگا کے اصرار پر میں نیم دلی سے اٹھا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ پہرے دار جاگ رہے تھے۔ میں نے سرنگا کو بتایا کہ اس وقت باہر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے ان کی تعداد پوچھی۔ وہ دو تھے۔ سرنگا نے مجھے دروازے کی آڑ میں کھڑا کر کے ایک دم چیخنا شروع کر دیا۔ باہر حبشیوں کی آواز ابھری۔ وہ منمنا رہے تھے۔ سرنگا کی کربناک چیخیں سن کر ان میں سے ایک سرنگا کے کرب کی وجہ جاننے کے لیے اندر آیا۔ اس کا اندر جھانکنا تھا کہ میں نے جھپٹ کر اس کی گردن پوری قوت سے دبوچ لی اور اُسے سنبھلنے کا کوئی موقع دیے بغیر پشت سے ایک زبردست لات رسید کی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر منہ کے بل ڈھیر ہو گیا۔ ادھر سرنگا نے نوجوانوں کی سی پھرتی سے نیزا چھین کر اسے بلند کیا اور وحشیانہ انداز میں اس کی پشت میں گھونپ دیا۔ اس عرصے میں دوسرا پہریدار اپنے ساتھی کی آواز سن کر اندر آ گیا تھا۔ آتے ہی اس نے سرنگا پر نیزا تان لیا۔ پھر سرنگا کا کام تمام ہونے ہی والا تھا کہ میں سامنے آ گیا۔ میرے گلے میں جارا کاکا کی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر حبشی پہرے دار کے جسم میں رعشہ سا پیدا ہوا۔ بس اسی ایک لمحے کی رعایت میں میں نے اس پر سامنے سے حملہ کر دیا۔ وہ زمین پر آ گرا اور اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ جب سرنگا نے نیزا اٹھا کر مجھے علیحدہ کر کے اس کے جسم میں نیزہ پیوست کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ دوسرے پہرے دار کا سانس خود بخود بند ہو گیا تھا اور گردن ڈھلک گئی تھی۔ اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے ایک الوداعی نظر فلورا پر ڈالی اور ہم دونوں تیزی سے جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ سرنگا کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور ہم جنگل کی سمت بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر کئی جگہ ہمیں ٹھوکر لگی۔ لیکن ہم چوٹوں اور ٹھوکروں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سرنگا کی دیوانگی ہے۔ شاید اسے اس علاقے کی سرّیت کا پوری طرح علم نہیں ہے۔ زندگی کے لیے یہ جدوجہد بے سود ہے۔ موت ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے مگر سرنگا کی چال میں اب بھی عزم تھا۔ زندگی کی ایک موہوم سی امید انسان کے دل سے کبھی نہیں جاتی۔ بس وہ ایک کرن، ایک ہلکی سی کرن ہی تھی کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے اور اس جدوجہد سے کوئی نتیجہ نکلے۔ یہی امید ہمیں آگے لیے جا رہی تھی۔ افریقہ کے اس تاریک علاقے میں جب مہذب دنیا کے لوگ روشنیوں اور رنگینیوں میں زندگی کے گیت گا رہے ہوں گے، ہم سیاہ رات اور اس ہولناک ویرانے میں موت و زندگی کی کشمکش سے دوچار تھے۔ نہ جانے ہمارے اعزا ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟ میرے سخت گیر باپ۔ انھوں نے کہاں کہاں مجھے تلاش نہ کیا ہوگا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کا نوجوان بیٹا بلاؤں میں گھر گیا ہے۔ یہ کیسی دردناک موت ہے جو ہم سے مذاق کر رہی ہے اور ہماری آمادگی اور سپردگی کے بعد بھی ہم سے رُوٹھی ہوئی ہے مگر ہمارے ساتھ چلتی ہے۔ سرنگا کا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے اسے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کہا لیکن وہ نہیں مانا، گرتا پڑتا چلتا ہی رہا۔ حتیٰ کہ ہم جنگل میں پہنچ گئے۔

جنگل کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں کہ وہ کتنا وسیع اور گھنا تھا۔ اس کے راستے کتنے دشوار گزار اور خطرناک تھے۔ جگہ جگہ درندوں اور اژدہوں کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ جنگل کی رات بڑی وحشتناک ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو میری طرح بے بسی کے عالم میں ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں۔ وہاں داخل ہو کر سرنگا کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ رات گزرتے

سے پہلے غار کی تلاش ناممکن ہے آگے بڑھتے تھے تو کسی درخت سے سر ٹکرا جاتا تھا۔ پھونک پھونک کر اور ٹٹول ٹٹول کر قدم بڑھاتے تھے تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ ایک جگہ کسی درخت سے ٹکرانے پر ہماری ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور جسموں کی ایک ذرا سی آہٹ ہوئی تو سارا جنگل جاگ گیا۔ عجیب خوفناک قسم کی آوازیں چہار سمت گونجنے لگیں اور ہمیں معلوم ہوا کہ جنگل میں درندوں کی کس قدر کثرت ہے۔ پھر آگے بڑھنے کے بجائے ہم نے واپس جانے کو

ترجیح دی۔ ابھی جنگل کی ابتدا تھی اور ہم ذرا سی جدوجہد کے بعد واپس ہو سکتے تھے۔ میں نے اپنا رُخ موڑ لیا اور میری پیروی میں سرنگا بھی چار و ناچار پیچھے کی جانب چلنے لگا۔ کنارے پر ہمیں تاریکی کچھ کم معلوم ہوئی اور ہم درختوں کی پہلی قطار میں ایک ایسے درخت پر چڑھ گئے جہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رات گزرنے میں ابھی وقت تھا۔ میں اور سرنگا ایک موٹے سے تنے پر گم سم بیٹھے ایک دوسرے کے ہاتھ ہاتھوں میں دبائے اپنی دلی کیفیات اور اضطراب کا اظہار آپس میں کر رہے تھے۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ کمر درد سے دُہری ہو گئی۔ کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ چیونٹیاں جسم سے چپک گئی تھیں اور ہم دونوں جسم کے مختلف حصوں سے انھیں بار بار علیحدہ کر رہے تھے۔ اس جان لیوا مشغلے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہم پوری طرح بیدار رہے۔ صبح کاذب کے وقت ہم درخت سے اترے۔ اندھیرا دم توڑ رہا تھا۔ رات بھر کی تھکن سے جسم چُور چُور تھا۔ کہیں بھی بے سُدھ گر کر گہری نیند لینے کے لیے اعضا تڑپ رہے تھے لیکن صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ سرنگا کا جوش بھی طلوع ہو رہا تھا۔ وہ اب تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی استقامت پر مجھے رشک آ رہا تھا۔ سورج طلوع ہوا تو جنگل میں طائروں کی چہکار مچ گئی۔ اور ہم بچتے بچاتے جنگل کے اندر اپنا مطلوبہ غار تلاش کرنے لگے۔ ہر طرف ایک جیسے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے اس لیے سمت کا تعین مشکل ہو گیا تھا۔ بار بار مختلف کھوؤں، کنجوں اور جھنڈوں میں ہم گھس کر دیکھتے۔ وہ غار تلاشِ بسیار کے بعد بھی ہمیں نظر نہیں آیا۔ اس سے جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی۔ سورج سر پہ آ چکا تھا اور اس کی روشنی کہیں کہیں درختوں سے بچ بچا کر ہمارے سروں پر پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں یہ ڈر تھا کہ جھونپڑی میں ہماری عدم موجودگی کی اطلاع پا کر حبشی ہماری تلاش میں جنگل کی سمت نہ دوڑ پڑیں۔ میں نے سرنگا کو مشورہ دیا کہ ہم ایک بار ساحل کی طرف چلیں شاید وہاں سے غار کی سمت متعین کرنے میں مجھے کوئی مدد ملے۔ ساحل جنگل ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا تھا اور

یہ فاصلہ خاصا طویل تھا کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر ہم نے سمندر کی طرف کوچ کیا۔ سمندر کو دیکھ کر سرنگا کے چہرے پر عجیب تاثر پیدا ہوا۔ اس نے تمام کام چھوڑ کر اپنا آدھا جسم پانی میں ڈبو دیا اور دیر تک پانی کے اندر دم سادھے بیٹھا رہا۔ میں نے بھی اپنے شکستہ لباس کی پروا کیے بغیر ساحل کے لہراتے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ نہانے سے جسم میں چستی آ گئی اور زندہ رہنے کو دل چاہنے لگا۔ ساحل سے اندازے کے مطابق میں نے ایک طرف رُخ کیا اور ہم دونوں بھاگتے ہوئے پھر گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔

راستے میں ایک بار پھر میں نے سرنگا سے جھونپڑی میں واپس چلنے پر اصرار کیا۔ لیکن سرنگا نے ایک طویل تقریر کر کے مجھے خاموش کر دیا۔ غار اب بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سرنگا نے جھنجلا کر مجھ سے پوچھا: "کچھ یاد آیا؟ آخر تمھاری یادداشت کیسی ہے؟ عزیزی جابر! کہیں تم راستہ تو نہیں بھول گئے؟"

"مجھے بخوبی یاد ہے سرنگا۔ وہ غار جنگل کے اسی حصے میں واقع ہے مگر یہ سارا چکر طلسماتی ہے۔ جنگل کا یہ حصہ یکساں ہے، بے فکر رہو آلِ کار ہم اسے تلاش کر لیں گے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

"جلدی کرو سیدی، ہم جتنی جلدی وہاں پہنچ جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔" سرنگا نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"مگر سرنگا، میرا خیال ہے تم غلطی کر رہے ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس تنگ و تاریک غار کے اندر ایک عجیب اور حیرت انگیز دنیا دیکھی ہے۔ تم تن تنہا ان طاقتوں کا کیسے مقابلہ کرو گے؟"

"جابر! آنے والا وقت بتائے گا کہ سرنگا کیا کر سکتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو وہ سرتیا کو چھوڑ دیں گے؟"

"سرتیا ان کے لیے اتنی سہل نہ ہو گی جتنی فلورا تھی کیونکہ سرتیا سرنگا کی بیٹی ہے۔"

"سوچ لو، ہم جس سرزمین پر ہیں وہاں کا ہر ذرّہ اپنے اندر بے شمار اسرار رکھتا ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے، ہم ابھی ایسے ایسے مناظر دیکھیں گے جو تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ مگر اس تاریک برِ اعظم کا قصد کرتے وقت میں نے ان باتوں پر غور کر لیا تھا عزیزم!" سرنگا نے بزرگی سے کہا۔

"کیا ہم یہاں سے رِہا ہو جائیں گے؟" میں نے بچوں کی طرح پوچھا جیسے سرنگا کو اس کا جواب معلوم ہو۔

سرنگا نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میرے ذہنی بلوغ




# کوالٹی میں سب سے اونچا
# فروخت میں سب سے زیادہ

۴۰ پیسے میں ۱۰ سگریٹ
۸۰ پیسے میں ۲۰ سگریٹ (بشمول سرچارج)




تمباکو کی صنعت میں
واحد بڑا قومی ادارہ

PTI 5/72

United

پر شبہ کر رہا ہوں" میں جھینپ سا گیا۔ سرنگا نے کہا "جابر! کوئی انقلاب ضرور آئے گا۔ ہم اتنے آسان اجنبی ثابت نہیں ہوں گے، جتنے آسان اس جزیرے پر پہلے آ چکے ہیں۔"

"تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے ضد کی۔

"تم یہ باتیں نہیں سمجھو گے۔ بس حوصلہ برقرار رکھو۔ تم اپنے عزم سے طوفانوں کو شکست دے سکتے ہو۔ عقل اور برداشت، جرأت اور جذبے کے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ماورائی قوتوں کے آگے عقل کیا حیثیت رکھتی ہے؟"

"ماورائی قوتوں کے استعمال کے لیے بھی عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم پہلے انھیں حاصل کریں گے۔ جارا کاکا کی کھوپڑی کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال عقل ہے۔"

مغرب کی جانب سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا شور ابھی تک ہمیں سنائی دے رہا تھا۔ میں ابھی غار کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا کہ عجیب و غریب آوازوں کا ایک شور ابھرا اور فوراً معدوم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لاتعداد بدروحیں چیختی چنگھاڑتی جزیرۂ توری پر یلغار کرتی ہوئی گزر گئی ہوں۔ "یہ شور کیسا تھا؟" میں نے سرنگا کو ہکلاتے ہوئے مخاطب کیا۔

"غار تلاش کرو جابر جلدی۔" سرنگا چیخا۔ "کالی طاقتیں ہمارے گرد گھیرا ڈال رہی ہیں۔"

"عقل کیا کہتی ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"عقل تم جیسے کوڑھ مغز پر ماتم کر رہی ہے جو ایک اہم غار کا راستہ بھول گیا۔" سرنگا نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

آوازوں کے شور اور سرنگا کی بوکھلاہٹ نے مجھے گڑبڑا دیا تھا۔ اب بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں وہ غار تلاش کر لیتا جو پہلے بھی میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ سرنگا بار بار مجھے خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ شخص جو تمام راستے صبر اور برداشت کا ثبوت دیتا آیا ہے، وہ اچانک کیوں اس قدر بوکھلانے لگا ہے۔ کیا اس کی مضبوط قوتِ شامہ نے کوئی خطرہ سونگھ لیا ہے۔ کیا ان رفتہ رفتہ قریب آنے والی آوازوں میں کوئی رمز پنہاں ہے، جس کا سرنگا کے بصیرت افروز ذہن کو عرفان ہو گیا ہے۔ میں گھبرایا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور جھاڑ جھنکار کو ایک جگہ سے ہٹا رہا تھا اور سخت خوفزدگی کے عالم میں تھا کہ ایک گرج دار نسوانی آواز ابھری۔ "رک جاؤ سرنگا۔ آگے مت بڑھو۔"

میں دہشت سے اچھل پڑا اور پلٹ کر سرنگا پر نگاہ ڈالی وہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس سحرکار آواز کا پیغام ایک بار پھر سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی سرنگا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میرے لیے مفر کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے سرنگا کو رکتے دیکھا تو تیزی سے لپک کر اس کے قریب گیا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "سرنگا یہ آواز کیسی ہے؟ یہ شور کیسا ہے؟ میرا مشورہ مانو تو بھاگ چلیں، مگر اب تو مفر کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں نہ کہتا تھا کہ یہ خطرہ مول لے کر تم موت کو قریب کر رہے ہو؟ اب بتاؤ ہم کیا کریں؟ خطرہ ہمیں گھیرے میں لے چکا ہے۔"

سرنگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے جسم اور زبان میں ایک معمولی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ مجھے خیال ہوا کہ ممکن ہے خوف کی شدت نے سرنگا پر سکتے کی کیفیت طاری کر دی ہو۔ میں نے اس کا بازو تھام کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی مگر وہ بازو کسی انسان کا نہیں تھا۔ مجھ پر حیرتیں چھا گئیں۔ وہ بازو کسی انسان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو پتھر تھا۔ اپنے شبہے کی تصدیق کی خاطر میں نے سرنگا کے جسم کے دوسرے حصے بھی چھو کر دیکھے۔ وہ چشم زدن میں سراپا پتھر کے ٹھوس مجسمے کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میرے خدا! کس قدر دہشت ناک تھا وہ لمحہ۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ وقت کی رفتار جیسے تھم سی گئی تھی۔ میں حیران نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر مجھ میں کھڑے رہنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ نہ جانے کتنے لمحات دبے قدموں یوں گزر گئے کہ مجھے احساس تک نہ ہوا۔ پھر میں اس وقت چونکا جب قریب ہی کہیں سے حبشیوں کا شور بلند ہوا۔ موت میرا تعاقب کرتی ہوئی جنگل کے اس حصے تک آ گئی تھی۔ موت میرے سامنے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ میں اس طرح چونکا جیسے سوتے میں کسی نے کوئی نوک دار چیز میرے جسم میں چبھو دی ہو۔ پھر موت کو شکست دینے اور زندگی برقرار رکھنے کی خواہش نے میرے منجمد خون کو دوبارہ حدت بخشی۔ میں آنے والی آوازوں کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ خاردار جھاڑیاں شکستہ کپڑوں سے الجھ کر انھیں اور تار تار کیے دے رہی تھیں مگر زندگی ان خراشوں سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں کسی غیبی مدد کی امید میں دوڑتا رہا۔ کبھی کسی جھاڑی میں الجھ کر گرتا، کبھی کسی تناور درخت سے ٹکرا کر کراہتا ہوا اٹھتا۔ حبشیوں کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔ میرا سانس رکنے لگا لیکن میں نے جدوجہد جاری رکھی۔ قدرت کو میری حالت پر شاید رحم آ گیا۔ بھاگتے بھاگتے میں کسی پتھر سے ٹکرایا۔ پھر کسی غار میں اوندھے منہ گر کر نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

"باگوش باگوش۔ چیکو لارابی گوماشومو۔" (تلاش کرو، تلاش کرو، وہ یہیں کہیں روپوش ہوگا) یہ تعاقب کرنے والے حبشیوں کے آخری الفاظ تھے جو میرے ذہن میں محفوظ رہے۔ پھر مجھے کچھ سننے اور یاد رکھنے کا یارا بالکل نہ رہا۔



چہرے پر نمی محسوس ہوئی تو میں پھر کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ غار میں مکمل تاریکی تھی اور ایک نظر اطراف میں گھما لینے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہ غار نہیں ہے جہاں میں پہلے آیا تھا۔ یہ کوئی اور غار تھا۔ دیکھیے اب قسمت کہاں لے آئی ہے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا۔ غار میں کسی سوراخ سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ اندر کوئی جھرنا تھا جس سے زمین بھیگ گئی تھی۔ میں نے اپنے شکستہ و درماندہ اعصاب سمیٹے اور ابھی زمین سے اٹھا ہی تھا کہ مجھے اپنے سامنے اندھیرے میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ جیسے اندھیرے میں کسی خونخوار بلی کی آنکھیں چمکتی ہیں۔ کسی درندے کا خیال کر کے میں لرز گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی اور یکبارگی میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب دوبارہ کھولیں تو وہ دہکتی ہوئی آنکھیں میرے مقابل تھیں۔ وہ کسی درندے کی آنکھیں نہیں تھیں۔ کوئی شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ "مدد مدد۔ مجھے پناہ دو۔ وہ لوگ میرے تعاقب میں ہیں۔" میں نے ٹوٹی پھوٹی افریقی زبان میں کہا۔ حالانکہ اس علاقے کے کسی باشندے سے مدد اور پناہ کی امید رکھنا عبث تھا لیکن بے اختیار یہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ میری چیخ پکار سے ان چمکدار آنکھوں میں جنبش ہوئی۔ وہ میرے قریب آئیں۔ میں دہشت سے پیچھے ہٹ گیا اور غار کی کھردری دیوار سے چپک گیا۔ اچانک مجھے اپنے ہاتھ پر ایک تنومند ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ بھاری بھرکم لہجے والا کوئی انسان تھا جو افریقی زبان میں مجھ سے مخاطب تھا۔ اگر میں اس سے پہلے کسی غار میں آباد ایک نئی دنیا کا کرشمہ نہ دیکھ چکا ہوتا اور حسین ژولین سے میری ملاقات نہ ہو چکی ہوتی تو ممکن تھا کہ یہ آواز سن کر خوف و دہشت سے میری حرکتِ قلب بند ہو جاتی۔ لیکن یہ کوئی عام طرز کا علاقہ نہیں تھا۔ یہ جزیرۂ توری تھا جہاں کسی وقت بھی کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی بخیل زمیندار نے کاشتکار سے ایک کتے کی فرمائش کی۔ کچھ دنوں بعد کاشتکار ایک موٹا تازہ کتا لے کر حاضر ہوا اور بخیل زمیندار کی خدمت میں پیش کر دیا۔

زمیندار نے منہ بنا کر کہا۔ "واہ، یہ تو بہت زیادہ تندرست ہے، میں تو ہلکا پھلکا تیلی کمر والا کتا چاہتا تھا۔"

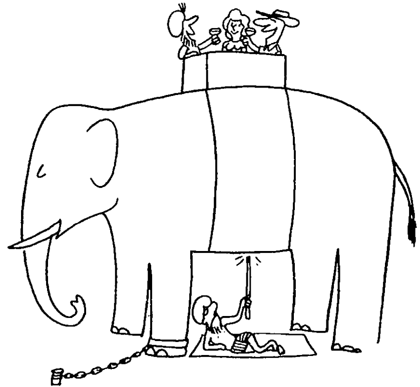
کاشتکار نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضور فکر نہ کریں یہ آپ کے پاس رہے گا تو کچھ دنوں بعد یہ بھی بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا آپ چاہتے ہیں۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے دوبارہ اسی پرُ وقار انداز میں حکم دیا۔

میں اس کے اشارے پر اس کا ہاتھ پکڑے مزید کوئی سوال کیے بغیر غار کے اندر چلنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر غار کشادہ ہو گیا اور وہ بلا کی تاریکی چھٹ گئی جو ابتدا میں تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ میری آنکھیں اتنی دیر میں اندھیرے سے مانوس ہو گئی ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اب بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو آنکھیں اور ایک ہاتھ میرے ساتھ چل رہا ہو۔ وہ کوئی بہت ہی سیاہ بدن شخص تھا جس کا جسم تاریکی سے مشابہ تھا اس لیے صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں جو جسم سے مختلف رنگ کی تھیں اور انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر تاریکی سے روشنی کی طرف چلنے لگا۔ راستہ آگے جا کر اور صاف ہو گیا۔ اب مجھے اس کا جسم صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک طویل قامت اور قوی الجثہ حبشی تھا۔ اس کے گلے میں مختلف قسم کے ہار اور کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں جاراکا کی کھوپڑی بھی موجود ہے۔ پچھلے اذیت ناک تجربوں کے بعد میرے لیے فی الفور کسی حبشی پر اعتبار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ سب میری جان کے دشمن تھے مگر ایسے وقت میں میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا کہ میں بے چون و چرا اس کے ساتھ چلتا رہوں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور میں انھیں رد کرتا ہوا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے بائیں سمت مڑتے ہوئے کہا۔

میں خاموشی سے مڑ گیا۔ اتنا اندازہ اس مختصر سفر میں یقیناً



ہوگیا تھا کہ وہ کوئی عام حبشی نہیں ہے۔ اس کی آواز میں طنطنہ اور چال میں وقار تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے دونوں ہاتھ سینے کی طرف باندھ کر پھر انھیں کھول دیا۔ اس کا یہ عمل کرنا تھا کہ سامنے والا دروازہ خود بخود کھل گیا اور ہم خاموشی سے معمولی قسم کے پتھروں کے بنے ہوئے چھوٹے کمرے میں داخل ہو گئے۔ پہلے کمرے میں جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور مختلف اقسام کی کھوپڑیاں اِدھر اُدھر پتھروں پر سجی ہوئی تھیں۔ سامنے لوہے کا ایک کڑھاؤ رکھا تھا۔ وہاں ہر چیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور پُراسرار تھی۔ اس کمرے سے گزر کر ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوگئے جو نسبتہً زیادہ صاف، کشادہ اور روشن تھا اور وہاں اس وقت کسی قسم کی بو بسی ہوئی تھی جو نہ زیادہ خوشگوار تھی نہ اتنی ناگوار۔ بس ایک بو تھی جو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں بھی عجیب و غریب قسم کی اشیا کا انبار تھا۔ ایک بڑا سا سفید پتھر میز کی شکل میں پتھر کے چار ٹکڑوں پر ٹکا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک روشن مشعل ایستادہ تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کا حکم سُن کر ایک پتھر نما اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس کے دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ خود کچھ کہنے سے پہلے میں اس کی زبانی کچھ سننا چاہتا تھا تاکہ اپنے بارے میں اس کے رویّے کا تعین کرسکوں۔ وہ غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا اور میری حالت یہ تھی کہ میں اس سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی روشنی تھی چہرے پر کرختگی اور تدبّر جھلک رہا تھا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک دوسرے کو تکتے رہے پھر وہ شاہانہ انداز میں بولا "کچھ کھاؤ گے؟"

"نہیں شکریہ۔ میرے حواس درُست نہیں ہیں۔ میں پہلے یہ یقین کرلینا چاہتا ہوں کہ میں تمھاری پناہ میں ہوں یا....." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم میری پناہ میں ہو۔ اس مسکن میں لوگ ہمیشہ کچھ لینے کے لیے آتے ہیں۔ تم نے پناہ مانگی تھی۔ میں نے پناہ دے دی۔" اس کا سارا جسم ساکت تھا مگر لب ہل رہے تھے۔

میں نے اطمینان سے پہلو بدلا۔ وہ شخص اپنے لہجے سے زبان کا پکّا اور عزّت دار معلوم ہوتا تھا لیکن یہ سارا ماحول، یہ کھوپڑیاں، یہ اشیا؟ میرے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ اپنی چرب زبانی سے میں اکثر مصیبت میں پڑ چکا تھا لہٰذا میں نے کم بولنے پر اکتفا کی اور اس طرح اپنی مظلومیت کی شہادت پیش کرنا چاہی۔

"جزیرۂ توری میں صرف ایک جگہ ہے جہاں تم پناہ لے سکتے تھے اور وہ یہ ہے۔ یہاں تم اطمینان سے رہ سکتے ہو۔" اس نے شاید میرا اضطراب بھانپ کر کہا۔

"تم کون ہو؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار نمودار ہوئے جیسے وہ جواب دینے سے گریز کررہا ہو۔ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے وہ ایک لمحے جھجکا، پھر کہنے لگا۔ "تمھارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ تم محفوظ جگہ ہو"

"بہتر ہے۔" میں نے اطمینان سے اس بار زبان کھولی۔ "جب سے ہم بدنصیب مسافروں نے اس جزیرے پر قدم رکھا ہے ہم ایک ساعت بھی سکون سے نہیں سوئے ہیں۔ ہمارے بے گناہ ساتھی مارے گئے، ہماری عورتیں اغوا کرلی گئیں، جب ہم نے آزادی کے لیے کوشش کی تو ہم پر عرصۂ حیات اور تنگ کردیا گیا۔ ابھی ابھی میرے ایک ساتھی کو پتھر کے مجسمے میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اس جزیرے پر تم پہلے آدمی ملے ہو جس نے مجھ سے ہمدردی کی بات کی ہے۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم ایک غرق شدہ جہاز کے بدقسمت مسافر ہیں جنھوں نے اس علاقے میں زندگی برقرار رکھنے کے لیے قدم رکھے تھے لیکن....."

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے درمیان میں دخل دیا۔

"تمھیں معلوم ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمھیں معلوم ہوگا۔ یہاں کوئی بات بعید نہیں ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کیا یہ لوگ انسان نہیں ہیں کہ انھیں اپنے جیسے انسانوں کو مصیبت میں دیکھ کر دُکھ نہیں ہوتا۔"

"اجنبی منحوس ہوتے ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے سوچا کہوں۔ اجنبی عورتیں منحوس نہیں ہوتیں لیکن اس تنومند وحشی سے زیادہ بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے خوف آیا۔ وہ بہت تحمّل سے میری باتیں سُن رہا تھا۔ میں نے اس کے جواب پر کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ چُپ چاپ ٹکٹکی باندھے دیواروں پر نظر کیے رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنی ران پر زور سے دو ہاتھ مارے اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ کمرے میں موجود پتھر کا کوئی دروازہ آواز کرتا ہوا کُھلا اور اس میں سے ایک نوجوان لڑکی برآمد ہوئی جو سراپا عُریاں تھی اور نقش و نگار کے اعتبار سے توشا اور نیری سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ وہ ایک مکمل شاداب اور تازہ لڑکی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ ہونٹ عام افریقیوں کی طرح بھدّے نہیں تھے۔ تراشے ہوئے رس بھرے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں میں اپنی طرف کھینچ لینے کی ساری طاقت موجود تھی۔ اس کے دلکش بدن کے بعض حصّے رنگے ہوئے تھے۔ جس سے یہ گمان ہوتا تھا کہ اس نے مہذب دنیا کے کسی نئے فیشن کا لباس پہن لیا ہو۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں شاید اس کی زندگی میں پہلا شخص تھا جس کی جلد کی رنگت اتنی بدلی ہوئی تھی اور جو لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اندر آکر ٹھٹکی، حیرت زدہ ہوئی۔ حبشی نے مجھے اشارہ کرکے پھر بٹھا دیا اور اُسے حکم دیا کہ وہ میرے لیے کھانا لائے۔ وہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی۔

"یہ میری بیٹی ہے، اس کا نام دیوتاؤں نے ترام رکھا تھا۔"

میں نے مہذّب انداز میں سر جھکایا۔ ترام پتھر کی ایک کشتی میں پھل اور گوشت لے آئی اور اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ رات کی صعوبت اور بیداری کے بعد صبح ہی صبح یہ مقوی ناشتہ جب سامنے آیا تو اشتہا بڑھ گئی۔ میں نے حبشی سے اجازت لے کر اُسے کھایا۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات کیے بغیر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر ایک کٹورے میں میرے سامنے پانی پیش کیا گیا۔ اپنی یہ خاطر تواضع اور نگہداشت



دیکھ کر مجھے خود پر شبہ ہوتا تھا کہ میں سو رہا ہوں یا بیدار ہوں کھانے سے خوب سیر ہونے کے بعد حبشی نے اپنی بیٹی کو اشارہ کیا اور مجھ سے کہا "اس کے ساتھ چلے جاؤ۔"

میں کسی معمول کی طرح اُٹھا اور لڑکی کے پیچھے ہو لیا۔ اب میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ بھوک اور وحشت کے سبب سے میں اپنے ذہن میں اس کے حسن کا کوئی بہت غیر معمولی تاثر قائم نہیں کرسکا تھا لیکن اس کے بدن کی جنبش اور اس کے دل نواز پہلو کی رفاقت سے مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کے حسن کی داد میں کوتاہی کر رہا تھا۔ حبشی اُس کمرے میں رہ گیا۔ لڑکی مجھے لے کر ایک ایسے کمرے میں آئی جو پہلے والے دو کمروں سے مختلف تھا۔ جو کئی نما اُونچے پتھروں پر گھاس بچھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں وہاں سو جاؤں۔ میرا دل اس سے بات کرنے اور کچھ سُراغ لگانے کے لیے مضطرب ہوا لیکن جس انداز سے یہ واقعات پیش آرہے تھے، اس میں مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی ہاں اتنا میں نے ضرور کیا کہ جو کام زبان سے لے سکتا تھا وہ نگاہوں اور رویّے سے لیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری داڑھی کتنی بڑھ گئی ہے۔ کاش میرے پاس ریزر ہوتا۔

یہ حبشی کون ہے؟ جو اس غار میں جانوروں اور انسانوں کی کھوپڑیوں اور اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ رہتا ہے؟ یہ غار انھوں نے کتنی مشقت سے بنائے ہوں گے۔ اس کے اندر قیام کرنے والے اس حبشی کے اطوار کتنے مہذّب ہیں اور وہ کتنے دبدبے اور بزرگی سے

بولتا ہے۔ کیا میں کسی غلط جگہ تو نہیں آگیا؟ پھر اس کی مہربانی کی وجہ کیا ہے؟ کیا؟ کیا؟ مگر نہیں۔ اب مزید سوچنا بیکار ہے مجھے اس نرم اور خشک گھاس پر اس کی منشا کے مطابق سو جانا چاہیے۔ میں نے اپنے بے اعتبار دل کو سمجھایا۔ آدمی چاروں طرف سے مشکلوں میں گھرا ہو اور ایک گوشہ عافیت کا نظر آئے تو اسے وہ بھی مشکوک نظر آتا ہے۔ میں بار بار ذہن جھٹکتا تھا کہ جو ہوگا اُسے کوئی نہیں روک سکتا میں تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ اس کے سوا کہ اس کی خوشنودی حاصل کر کے اپنی بقا کے امکانات وسیع کروں۔ میں نے شرماتی ہوئی ترام کو مسکرا کر دیکھا اور چوکی پر دراز ہو گیا۔ پھر میں ایسا سویا کہ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

بہت دیر بعد جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں صرف میں تھا اور ایک مشعل فروزاں تھی، کیا میں اس کی قید میں ہوں؟ چاروں طرف سے یہ کمرہ بند ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر طرف پتھر کی دیواریں تھیں۔ دیواروں میں راستہ ٹٹولتے ہوئے مجھے ایک دروازہ نظر آگیا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ ذرا سا کھسک گیا اور جھانک کر جو منظر میں نے دیکھا، اس پر میری آنکھوں کو یقین نہیں آیا کمرے کا ماحول اسرار میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں عجیب قسم کی دردناک آوازیں اردگرد سے پھوٹ رہی تھیں، حبشی، اس کی نوجوان بیٹی اور ایک تیرہ چودہ سالہ بچہ ایک بڑے کڑھاؤ کے سامنے جھکے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ کڑھاؤ کے نیچے آگ روشن تھی اور اوپر بھاپ، حبشی کی پشت میری طرف تھی۔ وہ سیدھا ہوتا اور بار بار کوئی چیز کڑھاؤ میں ڈال دیتا۔ کڑھاؤ میں تیل بھڑک اٹھتا اور آوازیں اور تیز ہو جاتیں۔ پھر اس نے ایک مالا اُتار کر جس میں کسی جانور کی کھوپڑی آویزاں تھی، کڑھاؤ میں ڈال دی اور اس کے بعد ایسا شور ہوا جیسے ان گنت انسانی پنجر آپس میں کھڑکھڑا رہے ہوں اور کمرے میں رکھی ساری کھوپڑیوں نے ہنسنا شروع کر دیا ہو، اور ان کے قہقہوں سے کمرے کی سنگی دیواریں اب گرنے والی ہوں۔ حبشی کے اس عمل کے بعد چھوٹے لڑکے نے یہی عمل دُہرایا پھر ترام نے۔ بار بار یہی بے ہنگم، لرزہ خیز شور اُٹھا اور دب گیا۔ پھر وہاں سکون چھا گیا۔ قبرستان کی خاموشی میں چپکے سے اپنی چوکی پر آ کر لیٹ گیا اور خوف کے سبب دروازہ بھی اس کی جگہ نہیں کیا۔ میں

ان کے رحم و کرم پر تھا اور بار بار اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد ترام اور چھوٹا لڑکا اندر داخل ہوئے لڑکے نے مجھے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ شاید ترام نے اسے کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے اُسے پاس بُلایا۔ وہ جھجکتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ان کا التفات حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

غالباً اسے یقین نہیں تھا کہ میں بولتا بھی ہوں۔ اس نے حیرت سے نظریں اُٹھائیں۔ میں نے اس سے اُسی شفقت آمیز لہجے میں دوبارہ اس کا نام پوچھا۔ ترام بھی دلچسپی کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ترام بولی "اس کا نام جمرال ہے، یہ میرا بھائی ہے۔"

"تمہارا بھائی؟ کتنا پیارا بچہ ہے۔ بہت ذہین معلوم ہوتا ہے۔"

"تم کون ہو؟" میری خوش آوازی سے متاثر ہو کر جمرال نے لب کھولے۔

"میں ایک بدنصیب اجنبی ہوں۔ میرا نام جابر ہے۔"

"جابر" اس نے دُہرایا۔

"ہاں جابر" ایک مظلوم اور بدقسمت شخص" اپنا نام بتاتے ہوئے میرے سینے سے ایک آہ نکلی اور میں نے خواہ مخواہ مختصراً اسے اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات سُنا کر اس کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی، اس طرح میں ترام سے بھی مخاطب تھا۔ میرے پُراثر لہجے اور مظلومیت کی داستان سن کر ان دونوں کے چہرے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ میں نے جمرال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چمٹا لیا۔ "اس علاقے میں صرف تم تین آدمی ایسے ملے ہو جنھوں نے مجھ سے انسانیت کا برتاؤ کیا ہے" باہر کی دُنیا کے واقعات تو شاہ اور نیری کے لیے بھی دلچسپی کا باعث تھے انھیں سن کر ترام کی دلچسپی بھی بڑھ گئی۔ اس نے مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں سوال کرنے شروع کر دیے۔ اس کا سوال مختصر ہوتا اور میرا جواب اتنا تجسس انگیز، طویل اور دلچسپ کہ ان کا اشتیاق بڑھا دیتا تھا۔ ان دونوں کو قریب لانے کا یہ موقع میں نے نہیں کھویا۔ کچھ ایسے دلکش پیرائے اور تجسس کے ساتھ اپنے ہاں کے لوگوں، ان کی عادات و اطوار، تہذیب اور ترقی کے بارے میں باتیں کیں کہ وہ ایک ہی نشست میں مجھ سے گھل مل گئے۔ ترام بھی میرے دائیں جانب بیٹھ گئی۔ میرا ارادہ تھا اس کے مرمریں کاندھے پر جانے اور جمرال کی طرح اسے

قریب کرنے کے لیے بے تاب سا ہوا لیکن میں دانستہ اس عمل سے باز رہا۔ اس طرح میں اپنے اور اس کے درمیان ایک طرح کی دوری پیدا کر کے ایک طرح کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں ان سے باتیں کر رہا تھا کہ پُراسرار حبشی اندر داخل ہوا اور اس نے اپنے بچوں کو مجھ سے قریب پا کر کسی بھی جذبے کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا یہ انداز بہت غنیمت تھا۔ وہ ہم پر ایک نظر ڈالتا ہوا کسی دوسرے دروازے سے رخصت ہو گیا

یہ جگہ بہت دلکش تھی۔ غار کے اندر کچھ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ سورج کی روشنی اندر آسکے۔ وہاں تازگی تھی۔ تازگی کا احساس مجھے یوں بھی ہوا کہ ان کے ہمدردانہ چہرے دیکھ کر اپنے قلب میں، طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ دونوں مجھے گھسیٹ کر اپنا غار دکھاتے رہے۔ وہ میری توقع کے خلاف ایک بہت کشادہ غار تھا جس میں جھرنے کا پانی مختلف جگہوں پر بہتا اور روشنی کے لیے ہمیشہ جلنے والی مشعلیں روشن رہتیں۔ میں نے زیادہ تر باتیں جمرال سے کیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے اس اجتناب کی بنا پر ترام نے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ رات تک مختلف ملاقاتوں کے دوران میں میں نے ان سے بہت سی باتیں پوچھ لی تھیں۔

وہ ایک کاہن تھا جو قسمتیں تقسیم کرتا تھا اور پیشگوئیاں کرتا تھا اسے آقابلا کا کاہنِ اعظم ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ سارا جزیرہ اس سے کانپتا تھا۔ اس کا نام سمورال تھا۔ کاہنوں اور قدیم تاریخ میں ان کی اہمیت کے متعلق میں نے یونانی دیومالا اور مصری تاریخ کی کتابوں میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ جب ترام نے مجھے اشارتاً اپنے باپ کی عظیم حیثیت کے متعلق بتایا تو میں سب کچھ سمجھ گیا کہ وہ ایک جادوگر ہوگا جس کے فیصلے اور احکام کی سرتابی کی ہمت آقابلا میں بھی نہ ہوگی، وہ اس غار میں پُراسرار طاقتوں کو زیرِ اثر رکھنے اور کالی قوتوں سے ہمیشہ رابطہ قائم رکھنے کے لیے گوشہ نشین ہو کر اپنے دو بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ باہر کے لہو لعب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

یہ احساس میرے لیے مژدۂ راحت تھا کہ میں تاریک برِاعظم میں آقابلا کے بعد سب سے مضبوط شخص کی پناہ میں ہوں۔ وہ میرے ساتھ کوئی غداری نہیں کر سکتا۔ اس کے عظیم مرتبے کے لحاظ سے یہ بات اس کے شایانِ شان بھی نہیں تھی۔ مگر وہ آخر مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہے؟ یہ سوال

بار بار ذہن کو پریشان کرتا تھا اور میں مختلف انداز میں اس کی توجیہیں کرتا رہتا تھا۔ شاید جارا کاکا کی کھوپڑی کی وجہ سے ایسا ہو کہ وہ مجھے لائقِ ہمدردی سمجھ رہا ہو۔

رات کو جمرال اور ترام ایک ساتھ میرے لیے کھانا لے کر آئے اور میں نے انھیں اپنے پاس بٹھا لیا اور انھیں بھی ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ جمرال نے منع کیا کہ وہ آج کل اپنے باپ کے حکم پر ترکِ لذّات کی مشق کر رہا ہے اور صرف گھاس پھوس کھاتا ہے۔ ترام اس منزل سے گزر چکی تھی۔ میرے اصرار پر اس نے ساتھ کھانا منظور کر لیا اور میں نے نہایت محبت سے اس کے منہ کے آگے گوشت کا ٹکڑا رکھ دیا۔ اس نے جھجک کر دانت مار لیا اور پھر میں نے اسی جگہ سے، جہاں اس نے دانت مارا تھا، کھانا شروع کر دیا۔ اس نوجوان لڑکی کے دل میں میری اس حرکت پر کیسا انتشار برپا ہوا ہوگا۔ اس کا مجھے اندازہ تھا۔ میرے کھانا کھانے کے بعد وہ چلے گئے۔ اس لیے کہ جمرال کو رات گئے تک اپنے آبا و اجداد کی روحوں سے ملاقات کرنا تھی۔ رات بخیریت گزر گئی تو علی الصباح میں بیدار ہو گیا۔ سب سے پہلے سموال کمرے میں آیا۔ میں نے اُٹھ کر اسے ادب سے سلام کیا۔ جس کے جواب کی اُمید نہیں تھی اور یہی ہوا۔ میں نے احتیاطاً اس سے پوچھا۔ ”مجھے یہاں کب تک رہنا چاہیے عظیم سموال؟“

میری زبانی اپنا نام سن کر اس کی آنکھیں چمکیں۔ ”تم ابھی باہر نہیں جا سکتے۔“

”معلوم نہیں میرے ساتھی سرنگا کا کیا حشر ہوا؟ اس کی لڑکی سرتیا بھی پرسوں رات اچانک غائب ہو گئی تھی۔ فلورا وہاں بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹر جواد بیمار ہے۔ اے مقدّس کاہنِ اعظم۔ ہم سب لوگوں کا کیا ہوگا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”ابھی وقت نہیں آیا ہے۔“ اس نے صرف اتنا کہا۔

”آپ نے مجھے پناہ دی ہے سموال۔ مجھے کوئی مشورہ دیجیے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

”تم یہیں ٹھیرے رہو۔“ اس نے حکم دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے زیادہ بات کرنی مناسب نہیں سمجھی، پھر اس نے کچھ سوچ کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اپنے کمرۂ خاص میں آ کر اس نے کڑھاؤ کے نیچے لکڑیوں کو آگ لگا دی اور کسی ایسی زبان میں کچھ پڑھنے لگا جس سے میں ناواقف تھا۔ پھر اس نے جارا کاکا کی کھوپڑی احترام سے اپنے ہاتھ میں پکڑی اور مجھے کڑھاؤ کے اندر جھانکنے کا حکم دیا۔ ”اس میں دیکھو۔“

میں نے گومگو کی کیفیت میں جھجکتے ہوئے کڑھاؤ میں جھانک کر دیکھا اور اس میں رکھے ہوئے تیل میں ایک لہر سی محسوس کی۔ یہ سرگزشت پڑھنے والے یقین کریں گے؟ کہ میں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ سرنگا کی شبیہہ تیل پر ابھری۔ وہ جنگل میں مارا مارا اور بدحالی میں اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ ”یہ سرنگا ہے۔“ میں نے اچھل کر کہا۔ ”یہ پھر حرکت میں آگیا ہے کاہنِ اعظم! مجھے بتاؤ کہ اس کی مدد کس طرح کی جا سکتی ہے؟“

”وہ تنہا نہیں ہے۔“

”اس کے ساتھ کوئی نظر نہیں آرہا۔“ پھر مجھے فوراً اس مختصر جملے کے معنی سمجھ میں آگئے۔ ”ہاں تم سچ کہتے ہو۔ وہ تنہا نہیں ہے مگر سرتیا کہاں ہے؟“ میں نے کاہنِ اعظم سے پوچھا۔

اس نے پھر اپنا عمل دُہرایا اور اس طرح تیل میں جنبش پیدا ہوئی اور میں نے دیکھا، سرتیا بے حال ایک جھونپڑی میں پڑی ہے، فلورا کی طرح دو خوبصورت لڑکیاں اس کے بدن پر گلکاری کر رہی ہیں۔ سرتیا جو ہمیشہ خود کو لباس میں چھپائے رکھتی تھی، اب اس کا بدن عریاں ہے۔ اُسے عریاں دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی اس نے اپنا بدن اس طرح سمیٹا ہوا تھا کہ اس کے بدن کے چھپانے والے حصّے نظر نہیں آرہے تھے۔

”یہ کہاں ہے مقدس کاہن؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

”وہ کالاری کے پاس ہے۔“

”کالاری؟“ میں نے دانت بھینچ کر غصّے سے کہا۔ ”کاش میرے پاس کوئی طاقت ہوتی کہ ابھی جا کر اس کا کام تمام کر دیتا۔“

”مقدس کاہن۔ خدا کے لیے یہ دلدوز منظر بند کرو۔ میری آنکھوں میں مزید دیکھنے کی قوّت نہیں ہے۔ میری مدد کرو۔ تم ایک بڑے کاہن ہو، کالی طاقتیں تمھارے پاس ہیں۔ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟ تمھارے لیے یہ کون سا بڑا کام ہے؟ ہم اس جزیرے سے فی الفور بھاگ جائیں گے یقین کرو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آناً فاناً وہ منظر غائب ہو گیا۔

”بتاؤ۔ ہماری نجات کا کیا راستہ ہوگا؟“ اس کی خاموشی دیکھ کر میں نے کہا۔ ”مقدس کاہن ایسا کرو کہ مجھے اپنا غلام بنا لو۔ میں ہمیشہ تمھارا

وفادار ثابت ہوں گا لیکن مجھے اجازت دو کہ میں شوالا اور کالاری کو تہس نہس کر دوں۔"

"وہ تم ایک بہادر جوان ہو۔ اس قبیلے میں وہی سرفراز ہوتا ہے جو خود کو دوسروں سے افضل ثابت کرتا ہے۔" اس نے اپنا سکوت توڑا

"وہ مگر میں ان نادیدہ قوتوں کے سامنے ایک حقیر شخص ہوں میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟"

"وہ تم نے مقدس جاراکاکا کی مقدس کھوپڑی حاصل کی ہے۔ اقایلا کو وہ لوگ پسند ہیں جو شجیع اور حوصلہ مند ہیں۔"

"وہ جاراکاکا کی مقدس کھوپڑی نے میرا ساتھ نہیں دیا، مجھے بتاؤ کہ میں اس سے کس طرح فائدے حاصل کر سکتا ہوں؟"

"وہ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ جاؤ اندر جا کر آرام کرو۔ ترام تمھارے لیے کھانا لے کر آگئی ہے۔"

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اندر واقعی ترام موجود تھی اور ساتھ میں جمرال بھی۔ میں نے کھانا زہر مار کیا۔ سریتا جیسی نازک بدن اور شرمیلی لڑکی بھی کالاری کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یہ سوچ سوچ کر میرے جسم میں آگ لگ رہی تھی۔ یہاں سے جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر ارادہ کیا اور اپنا ذہن تردّد اور تفکّر کی آلودگی سے آزاد کر کے ترام سے باتیں شروع کر دیں۔ ایک دن کی شوخی رنگ لائی تھی۔ ترام مجھ سے بے تکلّف ہو گئی تھی۔ اس لڑکی اور جمرال کو قابو میں کر کے میں کاہنِ اعظم سمول کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا تھا۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل اُکتا گیا تھا۔ اس لیے میں نے گوشت کے پارچے لے کر اپنی معمولی شُد بُد کے مطابق انھیں پکایا۔ روسٹ کیا اور جب انھوں نے اسے کھایا تو وہ چٹخارے لینے لگے۔ خود کاہنِ اعظم بھی مزے لے لے کر کھاتا رہا۔ ایک ہفتہ انھی بے تکے ہنگاموں میں اسی طرح گزر گیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ پر کمرے کے اندر باہر آنے جانے کے لیے کوئی پابندی نہیں رہی۔ میں نے وہاں نفس کُشی اور ترکِ لذّت کے ایسے واقعات دیکھے جو اس سے قبل کبھی سُننے میں بھی نہیں آئے تھے۔ وہ تینوں غیر معمولی صفات کے انسان تھے۔ ان کی ریاضت گھنٹوں جاری رہتی تھی۔ کبھی وہ رات کے سنّاٹے میں رُوحیں طلب کرنے کا عمل شروع کرتے اور اُن سے باتیں کرتے اور کبھی ڈھانچوں کا رقص اور بے جان اشیا کے متحرک ہونے کا مظاہرہ ہوتا۔ میں نے ایک ہفتے میں اپنے حسنِ سلوک اور محتاط رویّے سے کم از کم ترام

---

**مُغلوں** کے زمانۂ عروج میں خواص کا عوام میں گھُلنا مِلنا ریاستی آداب اور شان و شوکت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ تمام درباری امراء، وُزرا اور اُن کے لواحق اسی اصُول پر کاربند تھے لیکن یمین الدّولہ خانِ خاناں آصف خاں کا بیٹا اعتقاد خاں مرزا بہمن یار ایک آزاد مشرب اور لااُبالی نوجوان تھا۔ وہ مروّجہ رسوم و قیود کی حدود سے اکثر تجاوز کر جایا کرتا تھا ایک روز وہ اپنی اسی عادت کی بنا پر آزادانہ طریقے سے گلیوں میں پھرنے والے کسی مجذوب کو دیکھنے چلا گیا۔ یہ بات چونکہ شانِ امارت کے منافی تھی۔ اس لیے بادشاہ نے اُس سے باز پُرس کی اور دریافت کیا کہ "کیا وہاں کوئی بندۂ شاہی (شاہی ملازم) بھی تھا؟"

اُس نے عرض کیا۔ "عالم پناہ! وہاں میں ہی ایک رُوسیاہ بندۂ شاہی تھا، باقی سب لوگ خُدا کے بندے تھے۔"

---

اور جمرال کے دلوں میں ضرور گھر کر لیا تھا۔ میں نے انھیں ایسے قصّے کہانیاں سُنائیں جو انھوں نے آج تک نہیں سُنی تھیں۔ کاہنِ اعظم کو اپنے جادوئی افعال و اشغال سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ انھیں عام بچوں کی طرح تربیت دیتا۔ اس کا مقصدِ زندگی غالباً صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح اپنے بچے جمرال کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرے اور اسے اس کا اہل ثابت کرے۔ اس سلسلے میں اس نے کم سن جمرال کو نفس مارنے اور کڑی ریاضت کرنے کی بہت خوب تربیت دی تھی، بہر حال اس غار میں ایک عجیب دنیا اور عجیب لوگ آباد تھے ـــــ اب شعبدے اور بے اختیاری کا کیا سوال تھا؟ میں اپنی آنکھوں سے ماورائی مظاہر کا کئی بار مشاہدہ کر چکا تھا۔ اپنی اہمیت جتانے کے لیے میں نے سمول کی متبرک اشیا کی دیکھ بھال اور صفائی شروع کر دی تھی۔ ان کی غذا میں تبدیلی کی تھی انھیں زیادہ اشیا کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی تھیں اور سلیقے اور خوش اخلاقی سے روشناس کرایا تھا۔ وہ لطیف باتیں جن سے وہ نا آشنا تھے میں نے بڑے خوب صورت انداز میں ان کے گوش گزار کی تھیں غرضیکہ میں نے بہت غیر شعوری انداز میں انھیں خواہشوں کی ترغیب دلائی اور اس گھر کے وسائل میں رہ کر کچھ ایسی دلکشی پیدا کر دی کہ وہ سب مجھ پر مائل نظر آنے لگے۔

اس غار کا احوال رقم کرتے وقت میں نے غالباً ایک کوتاہی کی ہے: میں نے ترام کے سلسلے میں کچھ بخل سے کام لیا ہے۔ شاید میں پوری

طرح اس کا اظہار نہیں کر سکا کہ وہ کتنی نفیس اور حسین لڑکی تھی۔ اس بیان میں ابھی تک میں نے اس کے حسن کے شایانِ شان کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ ایک پُرشباب لڑکی تھی جسے ابھی تک کسی مَرد نے ہوس کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ ایسی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا جس سے طوفان آجاتے ہیں۔ میرا دل اس پر فریفتہ ہوا جاتا تھا اور میں اُسے اپنی آغوش میں سمیٹنے کے لیے ہر وقت مضطرب رہتا تھا۔ جابر بن یوسف الباتر کے لیے یہ کیسی آزمائش کا مقام تھا؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ پُرشباب دوشیزہ میرے برابر کے کمرے میں تنہا سو رہی ہے۔ اس کے سینے میں بھی اک آگ لگی ہوئی ہے۔ لیکن کیا کاہنِ اعظم کی پناہ میں آیا ہوا کوئی شخص اس سے حظ حاصل کرسکتا تھا؟ جب کہ اس نے کاہن کے عظیم الشان کارنامے بچشمِ خود دیکھے ہوں۔ ہاں میں نے ایک ماہ کے اندر اپنی لطیف گفتگو اور شوخیوں سے اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل ضرور مچادی تھی۔ میں نے ترام کے نادان بدن کو جذبات کا شعور بخشا، میں نے اُسے اُس حدت سے ہم کنار کیا جو جوان دلوں کے خون کی گردش تیز رکھتی ہے۔ یہ سب کام بہت آہستہ آہستہ ہوا، نہ کسی رات وہ پہلو میں دراز ہوئی، نہ کسی دن میں نے اس کے رخساروں کو کوئی التفات سے آشنا کیا لیکن میں نے اس کے مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اسے گداز کے معنی سمجھائے۔ میں نے اپنی نگاہوں میں مستی پیدا کر کے اسے ہوس کی نشاط خیزیوں سے آگاہ کیا۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جس کا اظہار مشرق کے رومان پرور شاعر اپنے اشعار میں محبت کے آغاز میں کیا کرتے ہیں، کاش مجھے اس کی زبان کی فصاحت پر عبور ہوتا مگر جذبوں کی زبان تو اور ہی ہوتی ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہماری گفتگو کے دوران اچانک کاہنِ اعظم سمورال کمرے میں داخل ہوگیا۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آیا۔ میں اس کے احترام میں کھڑا ہوگیا اور وہ وہاں سے رخصت ہوگیا۔

مجھے اس کے پاس رہتے ہوئے چالیس دن ہوگئے۔ یہ مدت کسی غار میں موجود تین چار آدمیوں میں محبت کے فروغ کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس عرصے میں مسلسل تگ و دو اور کوششوں کے بعد مجھے کئی جادوئی عمل آگئے اور جارا کاکا کی مقدس کھوپڑی سے کام لینے کے بہت سے طریقے بھی معلوم ہوئے۔ مجھے اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ جارا کاکا کی کھوپڑی حاصل کر کے میں نے اس جزیرے میں اپنے تحفظ کے لیے کیسا زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس عرصے میں کئی بار میں نے سمورال سے باہر جانے کی خواہش ظاہر کی مگر اس نے مجھے جھڑک دیا۔ تین نفوس کی آبادی پر مشتمل اس غار میں آخر میرا دل اُکتا گیا۔ شروع شروع میں کئی کام تھے۔ دن کٹ گئے۔ ترام کو اپنی طرف راغب کرنے کا مسئلہ تھا، وہ بھی حل ہوگیا۔ ان کے اسرار دیکھنے کا شوق تھا، وہ بھی پورا ہوا۔ جارا کاکا کی کھوپڑی کے تقدس کا عرفان حاصل کرنا تھا، اس کی بھی تکمیل ہوئی۔ جو کھانے پکانے تھے، وہ پکا لیے۔ ترام قریب آئی مگر اس کی قربت نے تو اور پریشان کر دیا کیونکہ کاہنِ اعظم جو غار سے باہر کی دُنیا کے مناظر اپنے تاریک کمرے میں دیکھنے کی طاقت پر قادر تھا، اُس سے خود اپنے گھر کا حال کیسے روپوش رہتا؟ ان تمام باتوں نے مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا اور میں اپنے محسن کی قربت سے فرار ہونے کی کوشش میں مصروف رہا اس لیے کہ اُس نے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب اس سے رخصت کے لیے پوچھتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ وہ اب مجھے اپنی عبادت میں بھی شریک کرنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ میں کالے علم کے خوفناک کرشمے دیکھنے کا عادی ہوگیا۔ ۴۲ ویں دن میں نے اس سے سریتا، سرنگا اور فلورا کا حال جاننے کے لیے اصرار کیا جسے وہ ٹال گیا۔ اس بات سے میں اور مضطرب ہوگیا اور میں نے طے کر لیا کہ اب مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے فرار ہونا ہی ہے۔ ساری زندگی بیروت کی اعلا سوسائٹی میں رہنے والا مہذب نوجوان جابر یہاں وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ زندگی صرف گزار لینا تو کوئی بات نہ ہوئی۔

کاہنِ اعظم گاہے گاہے ہی غار سے باہر نکلتا تھا اور فرار کی کوشش صرف اس کی عدم موجودگی ہی میں کی جاسکتی تھی۔ ۴۴ ویں دن وہ اقابلا کی طلبی پر مختلف قسم کی کھوپڑیوں کے ہار گلے میں ڈالے اور ترام کے جسم پر نیا رنگ کرا کے اور ہاتھوں پیروں میں لمبے لمبے کڑے پہن کر غار سے نکلا۔ چلتے وقت اس نے ترام اور جمرال کو اور مجھے غور سے دیکھا۔ میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے ارادے تاڑ چکا ہے، مجھے جھرجھری آگئی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے ترام کو بتایا کہ میں دو دن کے لیے اس جگہ سے جانا چاہتا ہوں۔ ترام اور جمرال دونوں اس امر پر راضی نہیں ہوئے۔ ترام تو آبدیدہ ہوگئی — لیکن اگر میں یہ موقع کھو دیتا تو پھر نہ جانے کب کاہنِ اعظم غار سے باہر نکلتا۔ باہر میرے لیے کوئی مخملیں فرش بچھائے استقبال کے لیے نہیں کھڑا تھا۔ قدم قدم پر خطرے تھے۔ اس ہوش ربا طلسمی جزیرے میں صرف ایک عافیت کی جگہ تھی اور میں وہ جگہ چھوڑ رہا تھا۔ اس موقع پر لوگ کہیں گے کہ کیا میں پاگل ہوگیا تھا؟ میرا جواب

یہ ہے کہ میں اس طرح اپنی تمام زندگی گزارنے پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ جمرال اور ترام میرے پیچھے سائے کی طرح لگے رہے لیکن مجھے ان کی مصروفیت کے اوقات کا علم تھا۔ وہ شام کو طلسمی عصا لے کر ہولناک قسم کی مشقیں کیا کرتے تھے۔ اور جب شام کو وہ معمول کے مطابق اس عمل میں مصروف ہو گئے تو میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور پہلے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں بڑا دروازہ تھا جو غار کے ویران حصّے میں کھلتا تھا اور جہاں سے دہانے کی طرف کا راستہ جاتا تھا۔ بڑا دروازہ بند تھا۔ بظاہر اس میں کوئی کُنڈی یا قفل نہیں تھا مگر زور لگا کر دیکھا تو وہ ٹس سے مَس نہ ہُوا ۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ میں جارا کا کا کی کھوپڑی سے مدد کیوں نہ لوں؟ میں نے اسے گلے سے اتار کر بازو میں باندھ لیا اور سمورال کے مخصوص انداز میں سینے پر پہلے دونوں ہاتھ باندھے اور پھر انھیں پھیلا دیا۔ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ دروازہ کُھل گیا ہے۔ غار میں اندھیرا تھا پھر بھی راستہ ٹٹولتا ہوا میں دہانے تک پہنچ گیا۔ باہر تازہ اور فرحت بخش ہَوا نے میرا استقبال کیا۔ اتنے دنوں بعد اس کھلی فضا میں آنے سے دل پر ایک عجیب خوش گواری طاری ہوئی، غار کی نشان دہی کے لیے مَیں نے اِدھر اُدھر سے چند پتھر اکٹھا کر کے انھیں ایسی ترتیب سے رکھ دیا کہ مجھے دوبارہ آنا پڑے تو کوئی زحمت نہ ہو۔ پھر میں کچھ خوف کچھ امید لیے جنگل میں جگہ جگہ سرنگا کو تلاش کرتا ہوا ساحلِ سمندر کی طرف نکل آیا۔ سُورج غروب ہونے والا تھا اور سرنگا کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں ہر جگہ رُک رُک کر آوازیں دیتا رہا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ رات کو جنگل میں ٹھیرنے کا کوئی محل نہ تھا۔ چار و ناچار میں نے سرنگا کی تلاش ختم کی اور دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ سرنگا بھی ان لوگوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ وہ بوڑھا بھی شاید رخصت ہو گیا۔ اگر کہیں ہوتا تو مجھے مِل جاتا ــــ مجبور ہو کر میں نے اس کوٹھری کی راہ لی جس میں ہم چار اشخاص قید تھے۔ راستے میں اکّا دکّا حبشیوں کے ملنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ مجھے جارا کا کا کی کھوپڑی کے رموز کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جارا کا کا کی کھوپڑی جس کے پاس ہوتی تھی وہ انھیں ایک مخصوص اصطلاح سے مخاطب کر کے اپنی عظمت کا پہلے سے اعلان کر دیتا تھا اور جب وہ قریب آ کر اُسے دیکھ لیتے تھے تو مخاطب کے احکام کی بجا آوری ان پر فرض ہو جاتی تھی ــــ جنگل سے جھونپڑی تک کا راستہ بخیریت گزر گیا۔ وہ جگہ سنسان پڑی ہوئی تھی، جہاں ہمارا زنداں تھا۔ میں دوڑ کر اس میں داخل ہوا تو وہاں ہمارے کسی ساتھی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ البتہ ایک

حبشی خاندان رہ رہا تھا۔ میں نے سرد پُروقار لہجے میں کہا۔ "تیر ما جارا۔" میری زبان سے یہ لفظ نکلنا تھا کہ سارا حبشی خاندان دوزانو ہوگیا۔

"وہ اجنبی کہاں ہیں جو اس جگہ قید تھے؟" میں نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"مقدس شوالا کو معلوم ہے۔ مقدس کالاری کو معلوم ہے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"ان کی عورتیں کہاں ہیں؟"

"شوالا اور کالاری کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کہاں رہتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ اور مجھے بتاؤ۔" حبشی میرے حکم پر اُٹھا اور سر جھکا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور پہلی بار میں اس جزیرے کی اصل آبادی میں داخل ہوا۔ یہاں جھونپڑیوں کی تعداد بے شمار تھی۔ تاحدِ نظر جھونپڑیاں نظر آتی تھیں، جو رات کی سیاہی میں عجیب ویران اور اُداس منظر پیش کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی مشعل روشن تھی ورنہ ہر جگہ سکوت چھایا ہوا تھا۔ راستے میں ہمیں چند حبشی بھی ملے۔ سب سے پہلے کالاری کی وسیع جھونپڑیاں پڑتی تھیں۔

"یہ ہے وہ جگہ جہاں مقدس کالاری رہتا ہے۔ اس سے آگے دوسری بستی مقدس شوالا کی ہے۔" میرے حبشی رہبر نے کہا۔

"کالاری۔" میں نے زیرِ لب دُہرایا۔ پھر نفرت اور غصے میں اس کی جھونپڑیوں کے سلسلے کی طرف بڑھنے لگا۔ حبشی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے مختلف جھونپڑیوں کے بارے میں اطلاعات حاصل کیں اور حبشی کو باہر چھوڑ کر ایک بڑی جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔ میرے سامنے گھاس پھوس کے بستر پر سریتا بے حال و عریاں پڑی تھی۔ قریب ہی دو لڑکیاں دراز تھیں۔ قریب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ سریتا کا بدن رنگ دیا گیا ہے۔ اس نازک شرمیلی لڑکی کو اس حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے لڑکیوں کو ہٹایا اور سریتا کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس پر بہت رحم اور پیار آیا۔ میں نے اس کی لٹیں درست کیں اور سر پہ ہاتھ پھیرا۔ دونوں لڑکیاں میرے حکم پر ایک کونے میں سمٹ کر کھڑی ہوگئیں۔

"آنکھیں کھولو سریتا۔ میں آگیا ہوں۔" میں نے سرگوشی کی۔

"کون؟" اس کی سہمی ہوئی آواز اُبھری۔

"میں۔ میں جابر۔ میں تمھارے پاس ہوں۔ تمھیں لینے آیا ہوں۔ اُٹھو، میرے ساتھ چلو۔"

"جابر — جابر۔ تم؟ تم زندہ ہو؟" اس کے منہ سے خوشی کی بنا پر لفظ نہیں نکل رہے تھے۔

"ہاں۔ میں تمھارے سامنے موجود ہوں۔ اب تمھیں کوئی نہیں ستا سکتا۔ میں آگیا ہوں۔" میں نے عزم کے ساتھ کہا۔

"باوا کہاں ہے؟ کیا ......؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"نہیں۔" میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ جنگل میں کہیں روپوش ہے۔ بس تم اپنے حواس درست کرلو۔ تمھارے ساتھ ان ظالموں نے کیسا سلوک کیا ہے۔"

سریتا بے اختیار میرے سینے سے چمٹی اور زار و قطار رونے لگی۔ میرا سینہ تر ہوگیا۔ میں اسے سمجھانے اور تسلیاں دینے لگا۔ "سریتا جلدی اُٹھ جاؤ۔ کسی ہنگامے سے پہلے۔ بہتر ہے ہم یہاں سے فرار ہوجائیں۔"

"جابر — میں — اس حالت میں۔" سریتا نے شرم سے نظریں جُھکاتے ہوئے دبی زبان میں کچھ کہنا چاہا، میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔

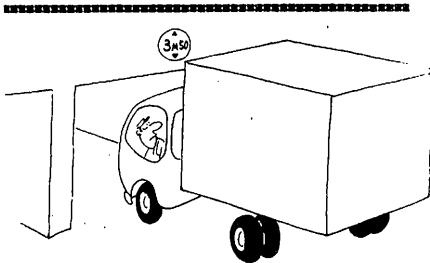
"یہ وحشیوں کی بستی ہے سریتا۔ کیا تم کبھی سوچ سکتی تھیں کہ تمھارے سامنے مرد برہنہ ہوکر آئیں گے؟ ہم بدقسمتی سے جن حالات کا شکار ہوگئے ہیں، ان میں سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔"

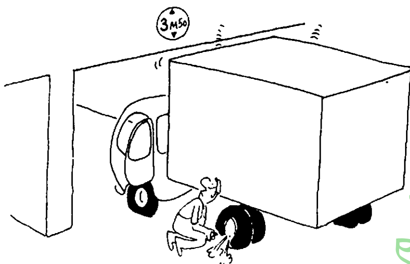
سریتا نے اپنا بدن سمیٹ لیا تھا لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں ثابت ہو رہی تھی۔ وہ سرو قد، لالہ رخسار دوشیزہ اپنے اندر بھی اتنی دل کش تھی جتنی لباس کی نقاب میں نظر آتی تھی۔ میں نے اسے اُٹھایا، وہ ایک کراہ کے ساتھ اٹھی۔ میں نے اس کی کمر کے گرد دایاں بازو حمائل کر کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ دونوں لڑکیاں گم سم کھڑی تھیں لیکن ابھی میں دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ایک کریہہ صورت، گرانڈیل حبشی اندر داخل ہوا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ وہ شوالا کی طرح اپنا جسم آراستہ کیے ہوئے تھا۔ ہاتھوں میں کڑے، کانوں میں بالے، گلے میں ہار، زنگ برنگا جسم اور بائیں کاندھے پہ ایک سیاہ خوں خوار بندر بیٹھا ہوا۔ اندر آ کر وہ پھنکارا اور اس نے ایک جھٹکے سے سریتا کو مجھ سے علیحدہ کر دیا۔ سریتا کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے دہشت عیاں تھی۔ کالاری نے اس کی کلائی تھام کر جھٹکا دیا تو وہ کراہ کر رہ گئی۔ سریتا کی چیخ پکار پہ کالاری نے اسے ایک جھٹکے سے فرش پہ ڈھیر کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ پلک جھپکتے میں اس نے جھپٹ کر سریتا کا نازک

بدن اپنے بدہیئت بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ سریتا نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز جیسے حلق میں گھُٹ کر رہ گئی تھی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کالاری پر کس طرف سے حملہ کروں۔ چنانچہ میں نے اس کی پشت پر جا کر اس کے گلے میں پڑے ہوئے کڑے کھینچنے شروع کر دیے۔ کالاری کو اُمید نہیں تھی کہ میں یہ جسارت کروں گا۔ اس کے جوابی ردِ عمل سے اس کا خون خوار بندر مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلو بچا گیا اور بندر ان دونوں لڑکیوں پر جا گرا۔

میں نے اپنا عمل جاری رکھا اور دفعتہً کالاری کو سریتا کے بدن سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی وہ پیچھے ہٹا اس نے اچانک پینترا بدلا اور اپنے دونوں ہاتھ جھونپڑے کی چھت کی طرف اُٹھائے، یکایک باہر کی طرف سے درندوں کی خوفناک آوازیں جھونپڑی میں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ کالاری نے اپنے تابع درندوں کو آواز دی ہے۔ میں نے جارا کاکا کی کھوپڑی ہاتھ میں تھام کر دل ہی دل میں اپنے تحفظ کی خواہش کی۔ یہی عمل پھر کالاری نے اپنے گلے میں لٹکی ہوئی کھوپڑی کے ذریعے کیا۔ ادھر خون خوار بندر دوبارہ میری ٹانگوں سے چمٹ گیا تھا۔ کالاری نے اُسے مجھ سے اُلجھا ہوا دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا۔ وہ بندر طاقت میں شیر کا ہم پلّا تھا۔ اس نے میری ٹانگ میں جگہ جگہ کاٹنے کی کوشش کی لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، بعد کو میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس وقفے میں جب میں بندر سے اُلجھا ہوا تھا کالاری پھر سریتا پر جھپٹ پڑا۔ شاید وہ مجھ سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سریتا نے اس کی دست درازی پر ایک فلک شگاف چیخ ماری۔ میں پھر کالاری پر حملہ کرنے والا تھا کہ جھونپڑی میں اچانک وہی عورت نمودار ہوئی جو ایک بار سرنگا کے پاس آئی تھی۔ یہ وہ دیوی تھی جس کی مورتی سرنگا اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ دیوی کے تیور آج خطرناک نظر آتے تھے، اس نے نمودار ہوتے ہی کالاری کو افریقی زبان میں حکم دیا۔ "دُور ہو جا، اس لڑکی کو چھوڑ دے۔" دیوی نے قہر بھری آواز میں کالاری کو للکارا تو کالاری یوں اُچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ اب تک سریتا کے بجائے بجلی کے ننگے تاروں سے اُلجھا ہوا تھا۔ دیوی کی آمد پر میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور خون خوار بندر دوبارہ اپنے مالک کے کاندھے پر جا بیٹھا۔ کالاری غیظ و غضب کے عالم میں اس وقت کسی آدم خور درندے سے مشابہ تھا۔ وہ دیوی کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو پھر آ گئی؟" وہ دہاڑا "لیکن میں آج اسے نہیں چھوڑوں گا اور تجھے بھی۔"




"تو اُسے چھوڑ دے۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں۔" دیوی نے تمکنت سے کہا۔ "تیری بربادی قریب ہے۔"

کالاری غضب ناک انداز میں اُٹھا اور دیوی کی طرف بڑھا۔ "یہ علاقہ ہمارا ہے۔ تو ہمارے معاملات میں دخل نہ دے، ورنہ عظیم اقابلا تجھ سے اپنے سردار کالاری کی توہین کا بدلہ لے گی۔"

"میں تیرے معاملات اور تیری ملکہ کے درمیان نہیں پڑنا چاہتی۔ تو اس لڑکی کو آزاد کر دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گی۔" دیوی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

"جارا کاکا کی عظمت کی قسم۔ اس علاقے پر صرف اقابلا کی حکمرانی ہے۔ تو یہاں سے اب نہیں جا سکتی۔"

اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی کالاری نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے زور زور سے ہلانے شروع کر دیے۔ دوسرے ہی لمحے جھونپڑی کے باہر لاتعداد شکاری کتوں کی خوں خوار غراہٹ سُنائی دی۔ دیوی کے ہونٹوں پر اُبھرنے والا تبسم بڑا ہی معنی خیز تھا۔ اس نے کالاری پر حقارت کی ایک نظر ڈالی۔ پھر تیزی کے ساتھ لپک کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

کالاری اس کے تعاقب میں جھپٹا۔ میں بھی تیزی سے جھونپڑی کے

دروازے پر آگیا۔ باہر جو سماں مجھے نظر آیا وہ انتہائی خوفناک اور حیرت انگیز تھا۔ خوبصورت دیوی کو کالاری کے درجنوں کتوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور اُسے بھنبھوڑ ڈالنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ دیوی ان کے درمیان کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے اپنی نظریں ان بھونکتے ہوئے کتوں پر ڈالیں تو وہ سارے کے سارے پل بھر میں کریہہ آوازیں نکالتے ہوئے زمین پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ کالاری نے اضطرابی کیفیت میں دیوی کی طرف دیکھا۔

"سریتا کو لے جاؤ۔" دیوی نے مجھے حکم دیا۔

اچانک کالاری نے خود کو زمین پر گھٹنے کے بل گرا دیا۔ پھر زمین پر سر ٹیک کر دوبارہ اُٹھا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ اس نے اپنے سینے پر دو ہاتھ ملے، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ پُراسرار دیوی مطمئن نظر آ رہی تھی، میری نظر اچانک آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ میں سرتاپا لرز اٹھا۔ جہاز کی تباہی اور حفاظتی کشتی کا تباہ کن سفر میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ دل کی دھڑکنیں غیر متوازن ہونے لگیں، ایک سیاہ ٹکڑا فضا میں تیرتا ہوا نیچے کی سمت آ رہا تھا۔ میں پہلے بھی سیاہ ذرات کی اس آندھی کا حیرت انگیز کرشمہ دیکھ چکا تھا۔ مجھے تومنغا یاد آیا جو ان پُراسرار سیاہ ذرات کا شکار ہوا تھا۔

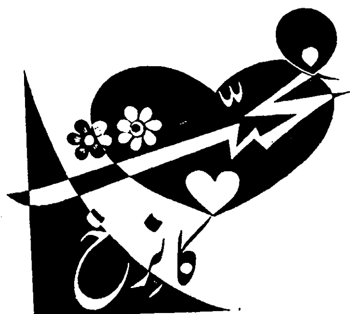
کالاری بار بار سینے پر بے تحاشا ہاتھ مار رہا تھا۔ پُراسرار دیوی کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ میں دم بخود کھڑا آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سرنگا کی پُراسرار دیوی اب تک کالاری کے مقابلے میں بڑی پُرسکون تھی اور اس پر حاوی رہی تھی۔ لیکن کیا وہ سیاہ ذرات کی اس زبردست آندھی سے خود کو محفوظ رکھنے کی تاب لا سکتی ہے؟ میرے ذہن میں یہ سوال بڑی تیزی سے چکرا رہا تھا۔ سیاہ ذرات خوفناک انداز میں چکر لگاتے ہوئے دیوی کے سر پر پہنچ کر رُکے تو دیوی نے اپنی ایک اُنگلی اوپر اٹھا کر اسے جنبش دی۔ سیاہ خطرہ اس کے سر پر معلق تھا۔ غالباً اس کی اُنگلی کے اشارے نے اسے ایک فاصلے پر روک دیا تھا۔ یہ تمام تماشا میرے لیے بے حد حیرت انگیز تھا۔ میں نے سریتا کا ہاتھ پکڑا اور اس ہنگامے میں موقع غنیمت جانتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن کالاری چیختا چنگھاڑتا ہوا پھر آڑے آ گیا۔ دیوی کے سر پر سیاہ ذرات منڈلا رہے تھے۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر کالاری کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور تاک کر جارا کاکا کی کھوپڑی پوری قوت سے کھینچ لی۔ میرے اس اچانک اقدام سے کالاری حواس باختہ ہو گیا اور میں نے نکال پھرتی سے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے حبشی کے ہاتھ سے نیزا کھینچ کر کالاری کے سینے میں گھونپ دیا۔ کالاری ایک خوفناک چیخ مار کر زمین پر گر گیا لیکن گر کر تڑپنے کی اسے مہلت نہیں ملی۔ اس کا کام تمام ہو گیا تھا۔ حبشی چیختا چلاتا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دیوی کے سر پر سیاہ ذرات کی یلغار بھی معدوم ہو گئی اور خود دیوی بھی ـــــ میں نے جارا کاکا کی دوسری کھوپڑی سریتا کے ہاتھ میں دے دی۔ اور اسے ساتھ لے کر طوفان کی طرح جنگل کی سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ کالاری کے خوفناک بندر نے میرا تعاقب کیا۔ میں نے رفتار اور تیز کر دی لیکن بندر اچک کر میرے کاندھے پر بیٹھ گیا اور میرا کان سہلانے لگا۔ میں نے اسے دھتکارنا چاہا لیکن وہ میرے کاندھے سے چمٹا رہا۔ میں حواس باختگی کے عالم میں سریتا کو لے کر آگے کی طرف بھاگتا رہا۔ مشکل یہ تھی کہ سریتا میری رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ ناہموار راستوں پر کئی جگہ وہ ٹھوکر کھا کر گری پھر ایک مقام پر نڈھال ہو کر اس نے مجھ سے کچھ دیر ٹھہرنے اور سانس درست کرنے کی التجا کی۔

یکایک پیچھے سے شور بلند ہوا۔ انھوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ اس وقت مجھے اُن کے شور اور تعاقب سے پہلے جیسا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم حفاظت اور دفاع کی خاطر میں نے سریتا کو اپنی پشت پر بٹھایا اور اپنے جسم کی ساری توانائی بھاگنے میں صرف کر دی۔ میرا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ بندر میرے کاندھے سے اُتر کر اب میرے ساتھ بھاگ رہا تھا اور غرّا رہا تھا۔

سریتا اب بھی ہانپ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں سے میرا جسم مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ میں اسے اپنی کمر پہ اٹھائے ہوئے آخر اس تاریک رات اور تاریک جنگل میں داخل ہو گیا۔



اقابلا کے اس تحیّر خیز پُراسرار اور غیر معمولی واقعات پر مشتمل سلسلے کا بقیہ حصہ آپ آئندہ شمارے میں پڑھیے۔



# محبت کا نرخ

**جہاں تک** ظاہری وجاہت اور شخصیت کی دلکشی کا تعلق ہے وہ ایک وجیہہ اور متاثر کرنے والا شخص تھا، مگر عجیب بات یہ تھی کہ اپنی شخصیت کے تمام تر اعتماد کے باوجود وہ شرم جھجک اور نفسیات کی اصطلاح کے مطابق 'امتناع' نہیں ختم کر سکا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جب عورتیں اس کے سامنے آتیں تو وہ گھبرانے لگتا۔ اُن کے سامنے بولتے ہوئے اندر سے کوئی اسے روکتا۔ حالانکہ وہ اپنی عمر کی اس منزل میں تھا جہاں عورت کی رفاقت کو جی چاہے۔ وہ ان کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے پہلو میں رہے۔ اس شرم اور جھجک نے اُسے اداس کر دیا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ اپنی زبان میں طاقت، اپنے چہرے پر تاثر پیدا کرے اور اپنے قدموں کو مضبوط بنائے۔ وہ آگے بڑھے، کچھ دلچسپ باتیں کرے، کچھ دلچسپ باتیں سنے۔ جب نوجوانی کا ایک حصہ اداسی اور تنہائی میں گزر گیا تو اُس نے ایک دن خود کو تبدیل کرنے کے لیے زبردست تہیہ کر لیا۔ اُس نے انقلاب لانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس برس وہ تعطیلات گزارنے ایران کے شمالی علاقوں کے ایک خوبصورت مقام پر جا پہنچا۔ گھر سے دور ہونے کی وجہ سے اُسے ہر کام خود کرنا پڑتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنی شرمیلی طبیعت میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے منصوبے کو آخری شکل دینے لگا۔

محمد اسلم شاہد

جنہیں محبت کا دعویٰ ہے اور جو محبت کیلئے تڑپتے ہیں، اُن کے لیے ایک کہانی

اصل میں اس وقت فریدوں تبریزی کے سامنے کسی اچھی لڑکی کے انتخاب کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ صرف اور صرف اپنی بے جا شرم کے علاج کا خواہاں تھا۔ سرائے کی مالکہ ادھیڑ عمر کی ایک پرکشش عورت تھی۔ اس نے جسمانی صحت اور تناسب کا خاص خیال رکھا تھا۔ چہرے پر آرائش کر کے اور چست لباس پہن کر وہ مزید کم عمر اور دلکش دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ اُس کی بات چیت میں مٹھاس تھی۔ انداز دلربایانہ تھے۔ اگر حسنِ اتفاق سے اس وقت سرائے میں ایک اور خاندان قیام پزیر نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ نوجوان فریدوں تبریزی سرائے کی مالکہ سے سلسلہ جنبانی شروع کر دیتا اور اس کی اداؤں کے جواب ہی سے اس مہم کا آغاز کرتا۔ اس کے کمرے کے عین سامنے تہران کا ایک خاندان بھی ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا، اس کی بیوی اور ایک نوخیز، شوخ اور خوبصورت لڑکی شرمینہ۔

فریدوں تبریزی کی مہم کوئی آسان مہم نہ تھی۔ وہ طبعاً عام قسم کے لڑکوں سے مختلف نوجوان تھا اور اپنے منصوبے کی تکمیل کا عزم مصمم کرتا اور روز جھجک جاتا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ عموماً ادھ کھلا چھوڑ دیتا اور اخبار یا رسالہ پڑھنے کے بہانے ایک ایسی جگہ نیم دراز ہو جاتا جہاں سے سامنے کا کمرہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ جب سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلتا تو وہ آہٹ کی بو سونگھتا اور کبھی شرمینہ باہر نکلتی تو وہ کن انکھیوں سے اس سیماب صفت حسینہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ اس نے سوچا یہ موقع غنیمت ہے۔ یہیں سے اُسے اپنی مہم کی ابتدا کرنی چاہیئے۔ لڑکی سے تعارف پیدا کرنے کی کوشش شروع کرنی چاہیے۔ مگر وہ دو تین روز تک خود بڑھ کر اس سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکا اور اندر ہی اندر کھولتا رہا۔

❦❦

ایک روز دوپہر کے وقت فریدوں تبریزی اپنے کمرے میں داخل ہونے والا تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور شرمینہ نے تیزی سے باہر نکل کر اُسے دیکھتے ہی بے دھڑک پوچھا۔ ”آپ کے پاس ماچس ہوگی؟“

”جی.... تن.... نہیں۔ مگر۔ مگر ٹھیریے میں آپ کو اندر سے لا کر دیتا ہوں۔“ فریدوں کو اپنی زبان لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی ”ارے....رے.... ارے آپ باہر کیوں رک گئیں۔ آئیے نا۔ میں ابھی ماچس دیتا ہوں آپ کو۔ بس ایک منٹ میں۔ بس ایک لمحے میں....“

شرمینہ کے چہرے پر نوجوان کی گھبراہٹ سے کچھ کھنچاؤ سا پیدا ہوا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگی اور زیر لب مسکرائی۔ فریدوں الماری کی طرف لپکا۔ ماچس کی ڈبیا سامنے رکھی ہوئی تھی۔ مگر وہ اُسے نہ دیکھ سکا۔ اس کی عجلت اور گھبراہٹ دیکھ کر شرمینہ ہنس پڑی اور کھنکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”چھوڑیئے بھی۔ اگر نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں نیچے جا کر کاؤنٹر سے لے آتی ہوں“ فریدوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سراپا ناز اس کے عین عقب میں کھڑی ہوئی تھی ”بہت بہت شکریہ۔ میں نے آپ کو خواہ مخواہ زحمت دی“ یہ کہہ کر وہ ایک ادا سے جانے لگی۔

فریدوں کے دل میں ہوک اٹھی کہ بڑھ کر اس کا راستہ روک لے اور اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ مگر ایک عرصے کی شرمیلی عادت چند لمحوں میں کیسے ختم ہو جاتی۔ وہ چلی گئی تو اس کی بے تابی بڑھتی گئی، بہت دیر تک وہ ان لمحوں کی یاد تازہ کرتا رہا جب شرمینہ اس کے کمرے میں موجود تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اس کے کمرے میں موجود ہے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ یہیں کہیں اِدھر اُدھر چھپ گئی ہے۔ اس لڑکی کے نوجوان جسم کی خوشبو ابھی تک کمرے میں مہک رہی تھی۔ وہ چلی گئی مگر فریدوں کے سینے میں ایک ایسی آگ لگا گئی جس کی لذت اور اذیت سے فریدوں ابھی تک ناآشنا تھا۔ اس رات وہ عجیب غریب نوعیت کے خواب دیکھتا رہا۔ صبح اس کا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت مضمحل تھی اور جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ شرمینہ کا خیال آتے ہی اس نے تیزی سے غسل خانے کا رُخ کیا تاکہ جلد از جلد تیار ہو کر صحن میں جا بیٹھے اور شرمینہ کی دید سے اپنی منتظر اور تشنہ نگاہوں کو سیراب کرے۔ مگر نہاتے وقت اس نے اپنا ارادہ بدل دیا بلکہ ایک اور ترکیب پر سوچنا شروع کیا۔ غسل سے فراغت کے بعد اس نے بال سنوارے اور پائجامے پر گاؤن پہن کر اپنے منتشر حواس کے ساتھ شرمینہ کے دروازے پر جا کر دستک دینے لگا۔ توقع کے مطابق شرمینہ ہی نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور شب خوابی کے لباس میں ایک نوجوان اور حسین لڑکی جتنی دکھائی دے سکتی ہے وہ نظر آ رہی تھی۔ فریدوں تمام آداب و قواعد بھول کر اس کے زہد شکن حسن کے نظارے میں کھو گیا۔ شرمینہ نے حیران حیران نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا ”جی فرمائیے۔ کیسے زحمت کی؟“

”وہ۔ وہ معاف کیجئے ماچس ہوگی آپ کے پاس؟“ فریدوں نے جھینپ کر کہا۔

شرمینہ پلٹی اور اندر سے ماچس اٹھالائی۔ کمرے میں خاموشی تھی، فریدوں نے کنکھیوں سے جھانکا تو کوئی ادھیڑ عمر شخص ناشتے میں مصروف تھا۔ یہ یقیناً شرمینہ کا باپ تھا۔ اس کی ماں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ "ابھی۔ ابھی لوٹائے دیتا ہوں۔" ماچس لے کر اس نے بدقت تمام شرمینہ کا شکریہ ادا کیا۔

شرمینہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ فریدوں نے محسوس کیا کہ شرمینہ کی نظر اس کے چہرے سے اتر کر سینے تک آئی اور پھر دوبارہ چہرے پر لوٹ گئی۔ اس نے اپنے کمرے میں واپس آکر خواہ مخواہ دو تین تیلیاں پھونکیں اور پھر ڈبیا لوٹانے کے لیے جانے لگا تو نظر قدِ آدم آئینے میں خود اپنے ہی عکس پر پڑ گئی۔ اس کا گاؤن آگے سے کھلا ہوا تھا اور سینے کے بال بہت نمایاں اور بڑے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے بدن میں سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھرتی سے واپس آکر اس نے ڈبیا شرمینہ کو واپس کی جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ ڈبیا دیتے وقت غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں شرمینہ کے نازک ہاتھ سے مس ہو گئیں اور ایک بار پھر اس کا جسم جھنجھنا اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ شرمینہ غالباً اس دلچسپ حرکت سے محظوظ ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی اور بل کھاتی ہوئی بڑے ناز سے پلٹ کر اندر چلی گئی۔

یہ اس کے اضطراب کی انتہا تھی۔ اس روز شام تک وہ اپنے ادھ کھلے دروازے سے شرمینہ کا بند دروازہ دیکھتا رہا۔ دروازہ کئی بار کھلا۔ مگر شرمینہ اُسے کہیں نظر نہیں آئی۔ تنگ آکر اُس نے باہر جانے کا ارادہ کیا اور اس نے کپڑے تبدیل ہی کیے تھے کہ باہر دروازہ کھلنے کا کھٹکا ہُوا اُس نے جھانک کر دیکھا۔ شرمینہ اپنی ماں کے ساتھ کہیں جا رہی تھی۔ شرمینہ نے اس کے کمرے کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور آنکھوں آنکھوں میں بہت سی باتیں ہو گئیں۔ فریدوں کو ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ اس نے جلدی جلدی اپنا دروازہ بند کیا اور ان کے پیچھے ہو لیا۔ سرائے سے نکل کر وہ دونوں باہر فٹ پاتھ پر ایک جگہ کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے گھڑی دیکھی اور ماں نے بیٹی سے کچھ کہا۔ فریدوں پچاس قدم پیچھے ہٹ کر خیابانِ گلفروش کی طرف چل دیا تاکہ جلد از جلد کسی ٹیکسی کو پکڑ کر انھیں لفٹ دینے کی پیش کش کرے وہ دونوں شاید کوئی فلم دیکھنے جا رہی تھیں۔ شام کا شو شروع ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ شرمینہ کی ماں بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ فریدوں نے تھوڑی دُور جا کر ایک ٹیکسی روک لی اور اس میں آگے کی نشست پر بیٹھ کر واپس سرائے کی طرف آیا۔ ٹیکسی ابھی ان دونوں کے قریب ہی پہنچی تھی کہ ایک تیز رفتار اسپورٹس کار آکر ٹیکسی کے آگے رُکی اور ایک نوجوان نے سر کے اشارے سے شرمینہ اور اس کی ماں کو سلام کیا۔ شرمینہ نے کار کا دروازہ کھولا اور کار دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

⁂

جب وہ اُداس اُداس کاؤنٹر کے قریب سے گزر رہا تھا تو سرائے کی مالکہ نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"تسلیمات آقائے فریدوں کہیے خیریت تو ہے۔ نصیبِ دشمناں طبیعت تو خراب نہیں۔ کیا یہاں کے لوگ اور یہاں کا موسم راس نہیں آ رہا؟"

"جی نہیں خانم۔ یوں ہی بس ذرا سر میں درد ہے۔"

"تو پھر آپ ٹہل کیوں رہے ہیں جناب؟ اپنے کمرے میں چلیے۔ میں ابھی آپ کے لیے گولیاں اور گرم کافی بھجواتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ فریدوں نے دروازہ کھولا تو کسی اور کی بجائے مالکہ مسکراتی ہوئی وہاں کھڑی تھی۔ آتے ہی وہ بولی "اس وقت کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔" اندر آتے ہوئے اس نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے ٹرے میز پر رکھ کر پوچھا۔ "کل سے موسم ہی بدل گیا ہے۔" اس نے گولیاں فریدوں کی طرف بڑھائیں اور پلنگ کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی فریدوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے سرائے کی اس ادھیڑ عمر مگر دلکش عورت کی بے تکلفی پر حیرت ہوئی۔ وہ اپنا تعارف خوبصورت طریقے سے کرانے لگی "میرا نام خانم فیروزہ ہے مگر سب لوگ فیری کہتے ہیں۔" اس نے بڑھ کر کافی کا مگ اُٹھایا اور فریدوں کی طرف بڑھا دیا۔ فریدوں نے مگ پکڑا تو اسے محسوس ہُوا کہ خانم فیری مگ چھوڑنے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں سے پلانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس احساس سے اُسے پسینہ آگیا۔ "آپ لیٹے رہیے آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے آقائے فریدوں۔"

فریدوں نے بوکھلاہٹ سے کہا۔ "آپ زحمت نہ کیجیے۔ شرمندگی ہوتی ہے۔" اس نے خانم کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

”جیسے آپ چاہیں۔“ خانم فیری کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ ”ہمیں تو بہرحال اپنے مہمانوں کی خوشنودی اور آرام کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

فریدوں نے بمشکل تمام کافی پی اور مگ خانم فیری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب مجھے آرام کرنا چاہیے۔“ اس نے یہ جملہ اس لیے کہا تھا کہ کسی طرح خانم یہاں سے چلی جائے اور وہ تنہائی میں شرمینہ کے متعلق سوچ سکے۔ مگر خانم جیسے کچھ اور ہی سوچ کر آئی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ عجیب اُلجھے اُلجھے جملے بول رہا تھا

اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ فریدوں سے ہمدردی اور خلوص کا بے تکلفانہ اظہار کر چکی تھی۔ لیکن آج اُس کے حُسنِ سلوک کی بات ہی اور تھی۔ اس کی وارفتگی کو فریدوں کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو سمجھتا۔ فیری شباب کی عُمر گزرنے کے بعد بھی ایک ایسی عورت تھی جو لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔

فریدوں عورت سے قربت کی شدید خواہش کے باوجود اس سے ویسے جذبات نہیں رکھتا تھا جس طرح شرمینہ کے لیے اس کے دل میں تھے، وہ خانم فیری کے سامنے اس طرح جھجکتا، گھبراتا اور شرماتا بھی نہیں تھا جس طرح شرمینہ کے سامنے آتے ہی پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔

خانم فیری نے بڑی اپنائیت کے لہجے میں سکوت توڑا۔ ”بے شک آپ لیٹ جائیے۔ لائیے میں آپ کا سر دبا دوں“ اور اس سے پہلے کہ فریدوں انکار کرتا وہ کرسی سے پلنگ کی پٹی پر آ کر ٹک گئی اور اپنے سلگتے ہوئے نرم ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔ فریدوں نے چاہا کہ وہ خانم سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اس کے کمرے سے چلی جائے۔ اُسے زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی عورت سے اس قدر قریب ہونے کا موقع ملا تھا وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا اور خانم ہولے ہولے نرم نرم انداز سے اُس کا سر دباتی رہی اور وہ سعادت مندی سے خاموش لیٹا رہا۔ فیری اس کے اور قریب آگئی تھی۔ اب اُسے کچھ آرام سا ملنے لگا تھا اور چند لمحوں میں وہ اپنے منتشر خیالات جھٹک کر فیری کے بدن کا گداز محسوس کرنے لگا اور اس کے نشیب و فراز کے بارے میں لطیف باتیں سوچنے لگا۔ اچانک نیچے کاؤنٹر پر فون کی گھنٹی بڑے زور سے بجی۔ فیری بادلِ نخواستہ اٹھ کر چلی گئی اور اتنا ہوا کہ فریدوں کے اندر کچھ ہمت پیدا کر گئی۔

اُس رات شرمینہ نصف شب کے قریب کہیں سے لوٹی۔ فریدوں اس کی آہٹ کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ اپنے دروازے کی آڑ میں شرمینہ اور اُس کی ماں کے ہیولے اندھیرے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب اس کا کمرہ بند ہو گیا تو اس نے بے دلی سے آنکھیں موند لیں، نہ جانے کب اُسے نیند آئی۔ جب تک وہ جاگتا رہا خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ صُبح ہوئی تو اس نے کچھ کر گزرنے کی ٹھان لی۔

اور یونہی دروازے کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے۔ مختلف چیزوں کا مطالبہ کر کے اور بار بار اس کے سامنے آ کے تین چار روز میں اُس نے شرمینہ سے خاصا ربط ضبط پیدا کر لیا۔ ایک دن شرمینہ اسے پائیں باغ میں گلاب کی کیاریوں کے پاس ملی۔ وہ اس سے پُروقار انداز میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر نہ جانے اس میں کیسے اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ اُس نے شرمینہ سے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ وہ پہلے تو ہچکچائی مگر پھر اس کی التجا آمیز نگاہوں سے متاثر ہو کر شانے اچکاتی ہوئی اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اور کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر شرمینہ نے ہی پہل کی۔ ”کہیے آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں“ شرمینہ کی پہل پر فریدوں کی ہمت بڑھی اور اس نے کہا ”آج صبح سے آپ کہاں غائب تھیں؟ میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ فریدوں کو خود اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”انتظار۔ خوب۔“ وہ مسکرائی۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ جنابِ والا سے انتظار کرنے کے لیے کس نے کہا تھا؟“ شرمینہ نے لگاوٹ اور استہزا کے ملے جلے لہجے میں دریافت کیا۔

فریدوں کا حوصلہ بلند ہو گیا اور اس کی زبان سے نکل گیا۔ ”آپ کی یاد دل نے“ یہ جملہ کہہ کر خود اس نے اپنے اندر ایک عجیب قسم کی توانائی محسوس کی۔ جب شرمینہ حیرت اور شرم سے اس کا جواب سن رہی تھی تو اس نے اپنے کسی اندرونی طاقتور جذبے سے مغلوب ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شرمینہ نے چونک کر تیز نظروں سے اُسے گھورا اور پھر ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، فریدوں نے جلدی سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”شرمینہ خدا کے لیے کوئی غلط مطلب نہ نکالیے۔ یقین کیجیے۔ یقین کیجیے میں۔ میں آپ سے ....“

”یہی۔ صرف یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ کہ مجھ سے شدید محبّت کرتے ہیں بلکہ عشق کرنے لگے ہیں۔“ اس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں فریدوں کے لہجے کی نقل اتاری۔ فریدوں سر سے پاؤں تک مرتعش سا ہو گیا۔ شرمینہ کرسی کے ہتھے سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ پھر اس انداز میں آہستہ

آہستہ بولنے لگی جیسے اکیلے میں خود سے مخاطب ہو۔ "اور عجیب بات ہے میں یہ لفظ سنتے سنتے تنگ آگئی ہوں۔ میں اپنی کسی سہیلی سے کبھی سنتی ہوں کہ اسے کسی لڑکے نے محبّت کا یقین دلایا ہے تو مجھے اپنی اس غریب سہیلی پر بڑا رحم آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ نوجوان مرد و عورت بھی سچی محبّت کے دعویدار ہوسکتے ہیں؟ میں اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں، پگلی اس دُنیا میں محبّت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی مرصرف ہوس کے بندے ہوتے ہیں۔ آہ بے چاری لڑکیاں۔ جو فریب کھاتی ہیں اور محبّت کرتی ہیں۔ محبت کرتی ہیں اور فریب کھاتی ہیں۔ ان میں سے کئی اپنی زندگیاں چمکتے وعدوں پر قربان کر دیتی ہیں۔" شرمینہ نے یہ طویل پُراثر بیان دے کر پرس میں سے ایک چھوٹا سا رُومال نکالا اور اپنی جھلملاتی پلکوں کے کنارے پونچھنے لگی۔ شرمینہ کے اس اثر انگیز بیان پر فریدوں بھی آبدیدہ ہوگیا۔

"آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، وہ صحیح ہے۔ لیکن سب لوگ ایسے نہیں ہوتے۔" فریدوں نے گردن جُھکا کر ایش ٹرے سے کھیلتے ہوئے کہا "اگر آپ میری بات سننا گوارا کریں تو میں کہوں کہ میں فنِ تعمیر کی ایک درس گاہ میں زیرِ تعلیم ہُوں۔ میں بڑے خاندان کا کوئی آدمی نہیں۔ متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور ان دنوں یہاں تعطیلات گزارنے آیا ہوں۔ جس دن سے اس سرائے میں قدم رکھا ہے اور آپ پر میری نظر پڑی ہے، اپنے دل میں کچھ عجیب طوفان سا محسوس کیا ہے۔ عشق کے واقعات سنے تھے اور عشق کرنے کی تمنّا تھی۔ اب وہ تمنّا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی ماں کے سوا آج تک کسی عورت سے محبت نہیں کی۔ آپ یقین کر لیجیے۔ یقین کر لیجیے کہ آپ کو دیکھ کر کیسے کیسے حسین خیالات دل میں در آتے ہیں۔" شرمینہ خاموشی سے اس کا منہ تکتی رہی۔ فریدوں نے دوبارہ ہمّت کی اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے پھر شرمینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس بار اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

"آپ۔ آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ آپ بہت سیدھے، بہت اچھے ہیں۔" شرمینہ نے متاثر ہو کر کہا۔

اتنا سننا تھا کہ فریدوں کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ اس نے شرمینہ کا ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں پر رکھ لیا۔

"ارے رے۔ چھوڑیے میرا ہاتھ۔" شرمینہ نے شرما کر کہا مگر اسے شکست قبول کرتے دیکھ کر فریدوں کے جذبۂ شوق کی آگ کچھ اور بھڑک اٹھی۔ اس نے بڑھ کر شرمینہ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور بے پایاں محبّت کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے اُسے خوب پیار کیا۔ شرمینہ اس بے باکی پر بہت جز بز اور حیران ہوئی۔ مگر شاید اس معصوم شخص کی خوشنودی کی خاطر خاموش رہی، جس کی تشنہ آغوش میں پہلی بار کوئی عورت سمائی تھی۔ وہ کسی دیوی کی طرح چپ چاپ اپنے پجاری کی معصوم محبّت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اچانک شرمینہ کا ہاتھ قریب پڑی ہوئی میز سے ٹکرایا اور اس نے گھبراہٹ سے اپنی اس نازک سی گھڑی کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی اور کہنے لگی "اوہ آ گئے فریدوں۔ وقت بہت گزر چکا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے۔ میری امّی اور ابّا انتظار کر رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے خود کو فریدوں کی گرفت سے آزاد کر لیا۔

"کل کب ملاقات ہوگی؟" فریدوں نے بے اختیار ہو کر پوچھا

"کل شاید ملاقات..." مگر شرمینہ کے انکار سے پہلے ہی فریدوں نے جُرأت کر کے اس کے ہونٹ بولنے سے محروم کر دیے۔ وہ اُن سے کھیلنے لگا اور کسی بچے کی طرح ضد کر کے اس کا عذر رضامندی میں تبدیل کروا لیا۔

"ٹھیک ہے۔ تو کل شام گلستانِ پہلوی میں ملاقات ہوگی۔"

دوسرے دن شام کو خوب سج بن کر فریدوں نیچے اترا تو خانم فیری نے اسے دیکھ کر تعریفی کلمات کی بارش کر دی کہ وہ کس قدر جامہ زیب لگ رہا ہے۔ اس نے اسے اپنی طرف سے ایک مشروب پینے کی دعوت دی۔ فریدوں کے دل میں شرمینہ دھڑک رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی اپنا خوبصورت اور انمول وقت اس ادھیڑ عمر کی خاتون کے ساتھ ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کسی ضروری کام کا عذر تراشا۔ فیری آہیں بھرتی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں عزم پنہاں ہو۔ وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔

چھ بج رہے تھے، فریدوں نے دُور ہی سے شرمینہ کو چنبیلی کے کنج کے پاس ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ دونوں بڑے تپاک سے ملے مگر تھوڑی ہی دیر میں فریدوں نے محسوس کر لیا کہ شرمینہ کچھ بجھی بجھی سی ہے۔ اس نے شرمینہ سے افسردگی کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن شرمینہ ٹال

گئی۔ اس روز وہ دونوں یونہی ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے شرماتے جھجکتے چھپتے ماضی حال مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔

"جی چاہتا ہے تمہیں اپنے متعلق سب کچھ بتادوں شرمینہ۔ میں نے اپنی زندگی بنانے کے لیے بڑی مشکل سے اپنی تعلیم جاری رکھی ہے میری غریب ماں ایک فرم میں ملازم ہیں۔ میرے باپ کا چھ برس پہلے انتقال ہو گیا تھا۔" فریدوں کہہ رہا تھا۔ "میں خود بھی جز وقتی ملازمت کرتا ہوں۔ میری طبیعت مسلسل کام اور پڑھائی کی وجہ سے بوجھل رہنے لگی ہے اور میں ایک طرح کی تنہائی کا شکار ہو گیا ہوں۔ اس لیے میری شفیق ماں نے مجھے زبردستی تعطیلات منانے کے لیے یہاں بھیج دیا اور یہاں خوش قسمتی سے آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

"ہم لوگ بھی کوئی ایسے دولت مند نہیں ہیں البتہ میرے والد کی زمینوں کا جھگڑا چل رہا ہے اس لیے ہم گزشتہ چھ مہینوں سے یہیں مقیم ہیں۔ ہمارا آبائی گھر مشہد میں ہے۔"

"میں فنِ تعمیر سیکھ رہا ہوں۔ جب میری تعلیم مکمل ہو جائے گی، تو میں اپنے لیے ایک چھوٹا سا خوش نما گھر بناؤں گا۔ میں ایک جنت بناؤں گا۔ اس کا نقشہ بار بار میرے ذہن میں اجاگر ہوتا ہے۔ جب میں اس تعمیر کیے ہوئے گھر کو دیکھتا تھا تو اس میں ایک ہی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ پتہ ہے کس چیز کی؟"

"کس چیز کی؟" شرمینہ نے آنکھیں پھرا کر پوچھا۔

"آپ کی۔ کیا آپ میری جنت میں آئیں گی؟"

شرمینہ نے اثبات میں سر ہلا کر فریدوں کے سینے پر ٹکا دیا اور فریدوں کا سینہ چوڑا ہو گیا۔

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کسی تعطل کے بغیر کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ اس دوران وہ کئی بار اس کے کمرے میں بھی آئی اور فریدوں کی آتشِ شوق بھڑکا گئی۔ اس پیروی اور مسلسل اظہار سے فریدوں کو جلد ہی یقین ہو گیا کہ اب وہ شرمینہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس نے اسے اپنے خانۂ دل میں سجانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ دل جو ابھی تک سادہ اور پیاسا تھا۔

اور اسی دوران خانم فیری بھی فریدوں سے اظہارِ محبت میں پیش پیش رہی۔ وہ ایک تجربہ کار اور سمجھ بوجھ کی عورت تھی۔ اور فریدوں کو اپنی طرف ملتفت کرنے میں ہر حربہ آزما رہی تھی۔ وہ ڈورے ڈالتی رہی اور فریدوں اس سے کھنچا کھنچا اور محتاط محتاط ہی رہا۔ اسے خدشہ تھا کہ فیری کو اس کے اور شرمینہ کے تعلقات کا علم نہ ہو جائے۔ وہ سرائے چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی امکان کے پیش نظر ایک روز وہ ہفتے بھر کا پیشگی کرایہ ادا کرنے خانم فیری کے کمرے میں گیا۔ خانم آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے پُرکشش چہرے نے ایک لمحے کے لیے فریدوں کی توجہ جذب کر لی۔ اس وقت اسے خانم بہت بھائی۔ کچھ دیر تک خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ پھر اچانک شرمینہ کا خیال آیا اور اس نے اونچی آواز میں کھنکھار کر فیری کو خیالات کی دنیا سے واپس بلایا۔ "او ہو آ آئے فریدوں کیا بات ہے۔ تمہاری عمر بڑی ہے۔ میں تمہارے بارے ہی میں سوچ رہی تھی۔"

"وہ — میں کرایہ لایا ہوں۔"

"کرایہ؟ - ابھی سے۔" خانم نے حیرت سے پوچھا۔ "ابھی تو میں نے تقاضا بھی نہیں کیا۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی؟"

"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔ خرچ ہو جاتے تو بعد کو دقت ہوتی۔"

"تو کون سی قیامت آ جاتی۔ روپے پیسے کی انسان سے زیادہ اہمیت تو نہیں ہوتی۔" خانم نے غیر کاروباری انداز میں کہا۔ "اور پھر تم کون سے میرے پیسے لے کر بھاگ جاتے۔ تعجب ہے کہ اتنے دنوں کے بعد بھی تم نے کچھ محسوس نہیں کیا۔ اب بھی اجنبیت کی باتیں کرتے ہو مجھے صدمہ ہوا ہے۔"

"نہیں نہیں خانم۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں محتاط آدمی ہوں بہرحال بڑی نوازش ہے آپ کی۔" فریدوں نے حتی الامکان چہرے پر مسکراہٹ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ "کرایہ حاضر ہے اس وقت آپ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ رسید بعد میں دے دیجیے گا۔"

"آج تم بہت اداس اور دلگیر نظر آ رہی ہو وہ چہرے کی شگفتگی کہاں گئی جو پھولوں کو شرماتی تھی؟" فریدوں نے شرمینہ کی زلفیں سلجھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں گلستانِ ارم کے ایک پُرفضا اور سنسان گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بس.... یونہی..... اچھا چھوڑو۔ تم اپنی سناؤ۔"

"نہیں شرمینہ۔ تم ہمیشہ ٹال جاتی ہو۔ کیا تم ابھی تک مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں۔ مجھے دیکھو کیا میں فریبی نظر آتا ہوں؟ کیا میں نے اپنے

دل کی بات تمھیں نہیں بتاتی۔ بتاؤ، میری عزیز شمی۔ میری جان مجھے بتاؤ۔ آخر تمھیں کیا پریشانی ہے۔ کیا تم اپنے فریدوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتیں؟" فریدوں نے جذبات زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں فریدوں، میرے دل، جان۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" شرمینہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے "تمھی تو میری کائنات ہو۔ میں نے سب کچھ تمھی کو تو سمجھا ہے۔ مگر فریدوں ایک بات ایسی ہے، جو تمھیں بتاؤں۔ تب نقصان ہے نہ بتاؤں تب نقصان ہے۔ میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں۔ میں تمھیں دھوکا بھی نہیں دے سکتی اور تم سے کچھ چھپا بھی نہیں سکتی۔ اگر میں بتا ہی دوں تو تم میرے وجود سے نفرت کرنے لگو گے اور شاید پھر کبھی میری منحوس صورت دیکھنا گوارا نہ کرو۔ سوچتی ہوں کہ تم میری زندگی ہو۔ میں تم سے کوئی راز کیسے چھپا سکتی ہوں؟" شرمینہ نے غمگین لہجے میں کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو شمی۔ میرا امتحان نہ لو۔ تمھیں معلوم ہے کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔"

شرمینہ کچھ بولتے بولتے رک گئی تو فریدوں کا اصرار بڑھتا گیا۔ آخر وہ کہنے لگی "عزیز فریدوں۔ اگر تمھارے کانوں میں طاقت ہے تو سنو۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھو اور نظریں جھکا لو۔ سنو کہ جن لوگوں کے ساتھ میں رہ رہی ہوں۔ وہ میرے اصل والدین نہیں ہیں بلکہ وہ اس مقدس رشتے کے نام پر ایک بدنما داغ ہیں۔ وہ مجھ سے ..... وہ مجھ سے ..... فریدوں۔ انہوں نے مجھے دولت کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ میں ایک جنس تجارت ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی "یہ زمین پھٹ کیوں نہیں جاتی کہ میں اس میں سما جاؤں۔"

فریدوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے تکتا رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شرمینہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ بھلا اتنی معصوم اور پاکیزہ چہرے کی لڑکی داغدار ہو سکتی ہے؟ وہ اپنی محبوبہ کے ایک ایک نقش پر غور کر رہا تھا اور اس کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ سب کچھ جوں کا توں قبول کر لیا جائے مگر عشق میں سیدھے راستے نہیں ہوتے۔ ایسے تلخ حقائق سے منہ موڑنے کی کوشش کی تو زندگی میں ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔ پھر بزدلی کی قبر میں ابد تک دفن ہونا پڑے گا وہ سوچتا رہا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور اس بے بس لڑکی کی مدد کرے گا۔ اس کی زندگی میں انقلاب لائے گا چاہے اس کے لیے اسے بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے "شمی کیا ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے؟"

"میں پولیس یا عدالت کے روبرو جا سکتی ہوں، مگر اس طرح میری پیشانی پر برسرِعام وہ مہر ثبت ہو جائے گی جو اب تک شرافت کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ میں اپنی زندگی سے عاجز آ چکی ہوں فریدوں تم نے بارہا میری اداسی کا سبب پوچھا ہے، اب میں تمھیں کیا بتاتی اب میرا واحد علاج موت ہے۔ میں نے کل رات بھر سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ صرف موت ہی میری دوست اور ہمدرد ہو سکتی ہے۔"

شرمینہ نے اپنا پرس سینے سے لگایا اور پھر ہونٹوں سے چوم لیا۔

فریدوں کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا "لاؤ ذرا یہ پرس مجھے دو۔"

"نہیں، اسی میں تو میری زندگی کا، میرے دکھوں کا مداوا ہے"

فریدوں نے بمشکل تمام اس کے ہاتھ سے پرس چھینا۔ پرس میں مختلف معمولی چیزوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی شیشی بھی رکھی ہوئی تھی اس نے شیشی کھول کر اس میں بھرا ہوا سیال مادہ قریبی پودے کی جڑ میں ڈال دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پودا زمیں بوس ہو گیا۔ فریدوں کے خون کی گردش تیز ہو گئی اور اس کے دل میں شرمینہ کی محبت کا جذبہ اور پختہ ہو گیا۔ "تمھیں میری قسم شمی، میری جان اب کبھی اپنے دل میں ایسا خیال نہ لانا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے تم جیسی کچھ ہو۔ اب تم میری امانت ہو، اب تم میری اور صرف میری ہو۔ فریدوں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے اس کی زلفیں منتشر کرنے لگا۔ آؤ ہم لوگ یہاں سے بہت

دُور چلیں۔ میں تمھیں اپنی ماں سے ملاؤں گا۔ وہ یقیناً تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی شمّی وعدہ کرو کہ تم میرا ساتھ دو گی؟"

"میں تمھارے ساتھ چلنے کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں مگر فریدوں! میرے ساتھ ایک مشکل آ پڑی ہے اور مجبوری یہ ہے کہ اس کا حل کرنا میری اور تمھاری دسترس سے باہر ہے۔ ہم جیسے لوگ اُسے حل کر ہی نہیں سکتے.... میں تمھیں کیا بتاؤں...."

"مجھے بتاؤ شمّی کہ تمھیں کیا مشکل درپیش ہے" میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی تمھارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"تمھاری یہ سادہ لوحی کی باتیں سُن کر مجھے دُکھ ہوتا ہے فریدوں، ہماری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم غریب ہیں۔ لیسا اوقات ضرورت پڑنے پر معمولی سی رقم بھی فراہم نہیں کر سکتے۔ خواہ کتنی ہی شدید ضرورت ہو۔"

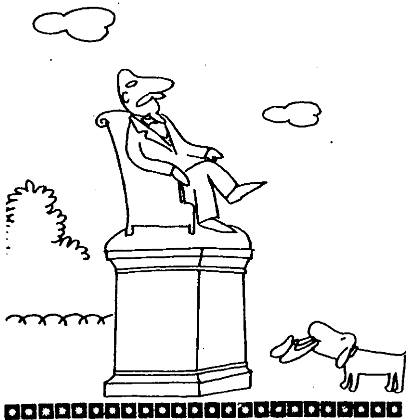
"معلوم ہوتا ہے تمھیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے کتنے پیسے چاہییں ہیں؟ مجھے بتاؤ تو سہی؟" فریدوں نے اصرار کیا۔

"میرے فرضی والدین نے میری پرورش پر آج تک جو کچھ بھی خرچ کیا ہے۔ بقول ان کے اس کا اندراج ایک رجسٹر میں کر رکھا ہے وہ مجھے بار بار طعنے دیتے ہیں کہ ان کا لگایا ہُوا سرمایہ اب تک منافع بخش ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ اگر میں ان لوگوں کا حساب بے باق کیے بغیر کہیں چلی گئی تو وہ مجھے سخت بدنام کر دیں گے.... بہت ممکن ہے کہ کسی غنڈے کی مدد سے مجھے اغوا کروا لیں یا قتل کروا دیں۔ تم ان کی ذلیل طبیعت سے واقف نہیں ہو فریدوں! کیونکہ تم بہت نیک آدمی ہو۔"

"تم مجھے رقم تو بتاؤ.... کتنی رقم درکار ہے؟" فریدوں کو اپنی استطاعت کا علم تھا مگر وہ محض مالی مجبوری کی بنا پر اپنی محبت سے دستبردار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

"چار ہزار تومان" بڑی مشکل سے شرمینہ نے جواب دیا۔

چار ہزار کا ہندسہ فریدوں کے دماغ پر ہتھوڑا بن کر لگا۔ مگر اس نے اپنے چہرے سے یہ کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی "وہ صرف چار ہزار تومان؟" فریدوں نے آہنی عزم سے کہا "ارے شمّی۔ اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری محبت سچّی ہے اور سچّی محبت تو خدا کو بھی پسند ہے۔ یقیناً وہ کسی نہ کسی طرح ہماری مدد کرے گا.... تم فکر نہ کرو، کل تک کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا.... اچھّا اب ذرا مسکراؤ تو۔"



شرمینہ بُری طرح رو رہی تھی۔ مگر فریدوں کا دل رکھنے کے لیے وہ آنسوؤں کے ساتھ مسکرا دی۔

فریدوں رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی ماں نے کتنی مشکلوں سے اُسے یہاں بھیجنے کا انتظام کیا ہے۔ خود اُس نے جو کچھ پس انداز کیا تھا، وہ تعطیلات اور تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ اس کے پاس اس وقت صرف پانچ سو تومان تھے۔ اس نے اپنی قیمتی گھڑی پر نظر ڈالی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ گھڑی اس کے مرحوم باپ کی نشانی تھی جو انہوں نے آسودہ حالی کے زمانے میں خریدی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے اس گھڑی کے عوض دو ہزار تومان مل سکتے ہیں! اس طرح نصف رقم کا انتظام ہو سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بقیہ نصف رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ ابھی وہ اسی خیال میں گم تھا کہ اسے ایسا لگا، جیسے کسی نے دستک دی ہو۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے والے تھے۔ اس نے اُسے محض وہم تصوّر کیا۔ دستک دوبارہ ہُوئی

"کون ہے؟"

"میں ہوں فیری.... جلدی سے دروازہ کھولو۔"

فریدوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فیری اتنی رات گئے کیوں آئی ہے۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ فیری نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے اسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور اسے تقریباً دھکیلتی ہُوئی اندر داخل ہو گئی اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"خیریت تو ہے؟" فریدوں دل ہی دل میں کُڑھنے لگا۔

"آہستہ بولو، کوئی سن لے گا.... اگر خیریت ہوتی تو تمھیں کیوں تکلیف دیتی.... یہاں آؤ میرے قریب بیٹھ جاؤ!" وہ فریدوں کے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ فریدوں بھی بادلِ نخواستہ اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ فیری نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ فریدوں نے اپنا سر جُھکالیا۔

"مجھے تم سے کچھ اہم مشورے لینے ہیں..... اصل میں دن کے وقت نہ تمھیں اتنی فرصت ہوتی ہے اور نہ مجھے" اس نے فریدوں کا ہاتھ پکڑلیا۔

"یقین کرو میں اس وقت تم سے جو کچھ کہنے والی ہوں اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں ہے...... دراصل مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے!"

فریدوں، فیری کی ناروا اور بے جا تکلفی کے باوجود اس کی پریشانی دیکھ کر پسیج گیا "میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"پھر وہی آپ! مجھے تم کہو فریدوں! میں آج وہ بات کہنے والی ہُوں جسے تم اتنے دنوں میں نہیں سمجھ سکے اور جسے میں تمھیں سمجھا نہیں سکی۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں اس دُنیا میں بالکل تنہا ہُوں اور اس سرائے کا سارا انتظام میرے نازک شانوں پر ہے تمھی بتاؤ کہ کسی ناتجربہ کار عورت کے لیے تنہا اتنا بڑا کام سنبھالنا کس طرح ممکن ہے؟ فریدوں مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے فریدوں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جھک کر اس کے بہت قریب آگئی۔ وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے لباس میں سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ فریدوں کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑا ہو مگر پھر اچانک اس کے تصوّر میں چار ہزار کا ہندسہ گھوم گیا اور اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ رقم، یا کم سے کم نصف رقم ضرور اس عورت سے حاصل کرے گا۔ اس نے جلتی پر تیل ڈالنے کے مصداق اپنا دوسرا ہاتھ فیری کے گرد حمائل کردیا۔ "بھلا میں تمھاری کیا مدد کرسکتا ہُوں خانم فیری؟ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ میں ایک ناتواں آدمی ہوں۔ بہت ہی غریب"

"اُفوہ تم نے یہی بات نہیں سمجھی۔ میرے ہوتے ہوئے تمھیں کون غریب کہہ سکتا ہے؟" خانم فیری نے فریدوں کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"تمھیں شاید معلوم نہیں کہ میں اپنے منیجر کو کتنی تنخواہ دیتی ہوں۔ اب نہ وہ منیجر رہے گا اور نہ فیری رہے گی۔ ان دونوں کی تنخواہ اب تم خود ہی وصول کروگے اور خود ہی ادا کروگے... میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تمھارا ہوگا۔ بلکہ تمھارا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فریدوں کی آغوش میں اپنا سر چھپالیا۔

فریدوں نے تھوڑی سی دلچسپ اور خوش گوار تگ و دو کے بعد فیری کو پوری طرح شیشے میں اُتار لیا اور موقع تاک کر کہا "معاف کرنا... اس موقع پر یہ بڑی نامناسب بات ہے۔ مگر کیا کروں۔ تمھارے ہوتے ہوئے کسی اور سے کہنا بھی تو غلط ہے۔ میں آج کل سخت معاشی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ مجھے دو ہزار تومان کی شدید ضرورت ہے۔ میں تمھارے ہاں کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن کیا مجھے کچھ پیشگی رقم مل سکتی ہے، خانم فیری؟"

"کیوں نہیں... علی الصّباح لے لینا، اور کل سے نیچے کا دفتر سنبھال لینا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" فیری نے جھوم کر فیاضی کا مظاہرہ کیا "اور میرے فیصلے غلط نہیں ہوتے۔"

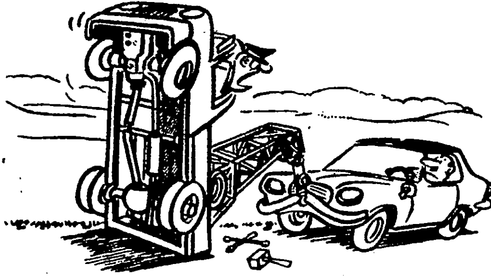
"میں کس زبان سے تمھارا شکریہ ادا کروں؟" فریدوں فرطِ مسرت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

"محبّت کی زبان سے...!" خانم فیری نے شوخی سے جواب دیا۔

اسی وقت شرمینہ کے کمرے میں کوئی کھٹکا ہوا اور کمرہ روشن ہوگیا۔ "تم اس وقت چلی جاؤ۔" فریدوں نے موقع کی نزاکت بھانپ کر فیری سے کہا "دو کل سے میں باقاعدہ کام سنبھال لوں گا۔ اس کے بعد کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اور پھر میرا کمرہ بھی تو نیچے ہوگا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" فیری وعدۂ فردا پر بہل گئی اور تیزی سے نکل کر نیچے چلی گئی۔

صبح ہی صبح فریدوں نے گھڑی کا سودا کیا اور خانم فیری سے دو ہزار تومان وصول کیے۔ فیری بہت خوش تھی۔ اس نے کہا "میں کل تک ملازمت کا شرائط نامہ تیار کرالوں گی۔"

"مجھے تمھاری ہر شرط منظور ہوگی!" فریدوں نے فراخ دلی سے کہا اور پھر دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہوا کمرے میں لوٹا۔ اس نے دروازہ کھلا رکھا تھا جیسے ہی شرمینہ نظر آئی۔ فریدوں نے اشارے سے اندر بلالیا "تمھاری رقم کا انتظام ہوگیا ہے شمّی۔" فریدوں خوشی سے پھولا نہیں سمارہا تھا "یہ لو پورے چار ہزار تومان ہیں۔ اس سے پہلے کہ تم رسماً کچھ کہو اور تمھارے کمرے کا دروازہ کُھلے، تم خود چلی جاؤ اور جلدی سے جاکر یہ پیسے ان کی



ناک پر مارو۔ میں نے کل صبح چھ بجے کے دو ٹکٹ محفوظ کروالیے ہیں بس آج کی رات تم ان کے ساتھ گزار لو۔ کل ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔" شمی نے رقم تھامی اور پھر دوڑ کر اس کے سینے سے لگ گئی "تم کتنے اچھے ہو فریدوں۔"

فریدوں دن بھر اپنا سامان آہستہ آہستہ سوٹ کیس میں بند کرتا رہا۔ پھر شام کو نیچے جاکر فیری کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ ایک گاہک سے باتوں میں مصروف تھا کہ شرمینہ نیچے آتی دکھائی دی۔ شرمینہ نے دور ہی سے مسکرا کر فریدوں کو سلام کا اشارہ کیا اور اٹھلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسے خوش دیکھ کر فریدوں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے سرپرستوں سے معاملہ طے کر چکی ہے اور اس وقت شاید کسی ضروری خریداری کی غرض سے باہر جارہی ہے۔

رات کو جب وہ کام سے فارغ ہو کر کمرے میں جانے لگا تو خانم فیری نے اسے روکنا چاہا۔ مگر اس نے سخت تھکن کا بہانا بنایا اور سیدھا کمرے میں جاکر سو گیا تاکہ صبح سویرے تازہ دم ہو کر نئی زندگی کی شاہراہ پر پہلا قدم رکھ سکے۔ وہ واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے ان ہنگاموں کا بالکل پتہ نہ چل سکا جو اس کے سونے کے بعد شرمینہ کے کمرے میں برپا ہوا وہ بالکل بے خبر سو رہا تھا کہ کسی نے اسے پکارا۔ اس نے سوتے وقت احتیاطاً دروازے میں تالا لگا دیا تھا تاکہ خانم فیری اسے تنگ نہ کرسکے اور اس کا بندھا ہوا سامان نہ دیکھ سکے۔

"فریدوں.... اٹھو نا.... میں ہوں" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا مگر کسی کی گرم گرم سانس اس کے رخساروں سے اٹھکیلیاں کررہی تھی۔ اور اپنے سینے پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یقین آگیا کہ کوئی اس کے بستر میں گھسا ہوا ہے اس نے آنکھیں کھولیں تو خانم فیری نے مسکرا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ فریدوں نے گھبرا کر وقت پوچھا تو خانم فیری نے بتایا کہ تین بج رہے ہیں۔ فریدوں نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر فیری نے اسے اٹھنے نہیں دیا

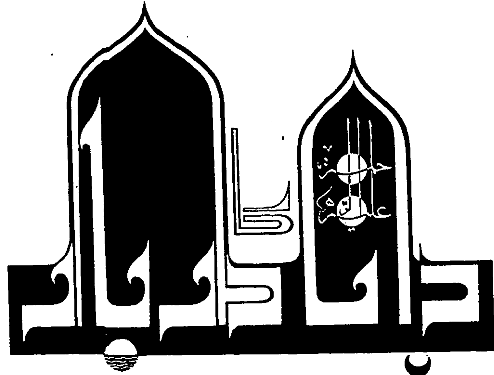
فریدوں نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ لیمپ روشن کیا۔ مدھم روشنی میں سب سے پہلے اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی کمرے کی فالتو چابی اور پلنگ کے قریب پڑے ہوئے زنانہ کپڑوں کے بے ترتیب ڈھیر پر پڑی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور لیمپ دوبارہ گل کردیا۔

"فریدوں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس سرائے کی تاریخ میں ایک اور سنہرے باب کا اضافہ ہوا ہے .... ایک اور محبت کرنے والی کو اس کی منزل مل گئی ہے۔ ایک اور بوڑھا جوڑا اپنی جوان اولاد سے محروم ہو گیا ہے۔ سامنے کے کمرے میں جو لڑکی رہتی تھی وہ کل شام سے غائب ہے۔ اس نے رات کسی نامعلوم مقام سے ٹیلیفون پر اپنے والدین کو اطلاع دی کہ وہ انھیں چھوڑ کر اپنے محبوب کے ساتھ کہیں بہت دور جارہی ہے۔ ٹیلیفون میں پس منظر کی آوازوں سے اس کے والد نے اندازہ لگایا کہ وہ ہوائی اڈے سے بول رہی تھی... چلو اچھا ہوا دو محبت کرنے والے دل ایک ہوگئے۔ اور سچی محبت تو خدا کو بھی پسند ہے۔"

اندھیرے کی وجہ سے خانم فیری فریدوں کا چہرہ نہ دیکھ سکی... فریدوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر فیری نے اسے اپنے ہونٹوں سے خاموش کردیا۔

صبح فریدوں تیار ہو کر نیچے پہنچا تو خانم فیری نے ایک کاغذ اس کے آگے رکھ دیا۔ "جانِ عزیز ذرا اس پر دستخط کردو۔"

کاغذ پر ملازمت کی شرائط کے ساتھ ساتھ دو ہزار تومان پیشگی کی رسید بھی درج تھی۔



پاسبانِ عزّتِ اُمّ الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاکِ پنجاب از دمِ اُو زندہ گشت
صبح ما از مہرِ او تابندہ گشت

علاّمہ اقبال

ضیا تسنیم بلگرامی

شام کا وہ کوہستانی سلسلہ جو ایشیائے کوچک اور شام کے درمیان حدِ فاصل بن گیا ہے اور پھر جنوب میں لبنان سے گزرتا ہُوا جزیرہ نمائے سینا کی چوٹیوں میں جاکر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے لبنانی حصّے میں کوہِ لُکام بڑی مشہور جگہ ہے یہیں گیارھویں صدی عیسوی میں محمد ابوالفضل محمد بن حسین ختلی نامی بزرگ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ عزلت نشینی میں گزار دیا۔ ہم عصر صوفیوں کی ظاہرداری اور مروّجہ رسوم سے بیزار اپنے چند ہونہار مریدوں پر اپنی توجہ صرف کرتے رہتے۔ انھی مریدوں میں غزنی کے قریہ ہجویر کے ایک نوجوان سیّد علی بن عثمان بھی تھے۔ طبیعت میں جستجو اور دل میں اجتہاد کا یہ عالم تھا کہ فکر کہیں ٹھیرتی ہی نہ تھی۔ مُرشد کے جسم پر جو کپڑے تھے۔ ان میں اتنے پیوند لگ چکے تھے کہ اصل کپڑے کا پتہ تک نہ چلتا تھا۔ جب کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے مُرشد نے دونوں ہاتھ نوجوان سیّد علی کی طرف بڑھائے اور مُرید نے پانی کی دھار ہاتھوں پر ماری تو یکایک نوجوان مرید کے دل میں خیال آیا کہ ”جب اس کائنات میں ہر جگہ تقدیر ہی کارفرما ہے تو کیا ضروری ہے کہ آزاد لوگ خود کو مرشدوں کا غلام بنالیں۔“

خرقہ پوش مُرشد نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لیے اور متردد مُرید کو مخاطب کیا۔ ”علی! تم کیا سوچ رہے ہو؟ بے شک پُوری کائنات میں تقدیرِ الٰہی کارفرما ہے لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ خدا کا ہر حکم کسی سبب کا پابند ہے، جب وہ کسی پر نوازش کرتا ہے تو اس کے ویسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ تمہیں خدا نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں تمہیں خدا کی منشا اور حکم سے وہ دُوں گا جس کے تم طلبگار ہو!“

نوجوان مُرید شرمندہ ہوگیا اور دل کی اُلجھن دور ہوگئی۔

تحصیلِ علوم اور ریاضتوں کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ مُرشد ابوالفضلؒ ختلی کوہِ لکام سے نکل کر دمشق پہنچے۔ نوجوان مُرید ساتھ تھا بارش زور شور سے ہو رہی تھی کچّے راستے کیچڑ سے بھر گئے۔ نوجوان مُرید نے کیچڑ اور نجاست سے بچنے کے لیے زیریں لباس کو ذرا اوپر کر لیا۔ لیکن مرشد نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کئی بار نوجوان مُرید کے جی میں آئی کہ وہ مرشد سے کیچڑ اور نجاست سے بچنے کی استدعا کرے اُس نے مرشد کے جوتوں اور لباسِ زیریں کی حالت کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ بالکل خشک تھے، پانی یا کیچڑ کی ایک چھینٹ تک موجود نہ تھی۔

نوجوان مُرید اپنے مُرشد کی اس کرامت سے حیران رہ گیا، پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ہے، آپ کے جُوتے اور کپڑے نجاست اور کیچڑ سے کس طرح محفوظ ہیں؟“

مُرشد نے جواب دیا۔ ”جب سے میں نے توکّل اختیار کیا اور توہمات سے پیچھا چھڑایا، دل کو حرص و طمع کی وحشت سے محفوظ کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت سے میرے قدموں کو ان آلائشوں سے پاک اور بے نیاز کر دیا ہے۔“

یہاں سے سیراب ہو چکنے کے بعد سیّد علی ہجویریؒ نے مزید تحصیلِ علوم اور مشائخِ کرام کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کی غرض سے مختلف شہروں اور مُلکوں کی سیاحت کی طبیعت میں مروّت اور سخاوت اتنی تھی کہ سائل کو نفی میں جواب دینا جانتے ہی نہ تھے، اگر پاس کچھ نہ ہوتا تو کسی سے قرض لے کر سوال پورا کر دیتے۔ اس طرح اتنے مقروض ہو گئے کہ دل پریشان رہنے لگا۔ کسی ہمدرد بزرگ نے انہیں لکھا۔ ”اے فرزند! اپنے دل کو خدا کی طرف سے ہٹا کر ان کی طرف مت مشغول کرو جو ہوائے نفس میں سب رنگ

اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ ہاں اگر ایسا کوئی شخص ملے جس کا دل تم سے برتر ہو تو تم اس کی تشفیِ خاطر کردو۔ ورنہ سب کے لیے اپنے دل کو مت حیران اور پریشان کرو۔"

اس نصیحت کے بعد دل کو قرار آگیا۔ آپ دُنیادار اور حریص ساتھیوں سے بچنے لگے لیکن اُس وقت تک لوگ آپ کو گنج بخش کہنے لگے تھے۔

سید علی ہجویریؒ کو اندر سے یہ فکر بھی کھائے جارہی تھی کہ وہ جملہ ائمہ میں کس کی اقتدا کریں۔ یہ فکر لاحق تھی کہ آپ ملکِ شام پہنچے۔ وہاں حضرت بلالؓ مؤذن رسولِ مقبولؐ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھ کر مزار کے سرھانے ہی سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ وہ مکّہ معظمہ میں حاضر ہیں، سامنے باب بنی شیبہ ہے، ان کی نظریں بابِ شیبہ پر لگی تھیں کہ اس میں سے رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم اندر داخل ہوئے۔ آپؐ گود میں ایک معمّر شخص کو لیے ہوئے تھے۔ سیّد علی ہجویریؒ ادب سے آگے بڑھے اور رسول اللہؐ کے پائے اقدس کو بوسہ دیا۔ دل میں سوچنے لگے، رسول اللہؐ نے یہ کس شخص کو گود میں اُٹھا رکھا ہے؟ حضورؐ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "یہ تیری قوم کا امام ہے یعنی ابو حنیفہؒ۔"

اِس کے بعد آنکھ کھُل گئی اور دل کا تردّد دُور ہوگیا۔ پھر زندگی بھر امامِ اعظم ابُو حنیفہؒ کے معتقد اور پیروکار رہے اور انہیں امامِ اماماں کہتے رہے۔

بہت کچھ جاننے کا نشہ دل و دماغ پر اب بھی طاری تھا۔ دُنیا حقیر اور اہلِ دُنیا کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آتے تھے۔ تصوّف کے لباس میں ملبُوس اور اپنی انا کی بڑائی میں گُم جوان نے سوچا کہ جو وہ جانتا ہے، دوسرے نہیں جانتے پھر کیا ضروری ہے کہ وہ جاہل اور بے علم انسانوں کو منہ لگائے، اس احساس اور اس اندازِ فکر نے اُسے بڑائی کا فخر تو دے دیا لیکن اندر کا سکون چھین لیا۔ دل کسی اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ طمانیت قلب جاتی رہی۔ اِس اُلجھن کے علاج اور طمانیتِ قلب کی بازیابی کے لیے اُسے کسی روحانی مُعالج کی تلاش ہوئی۔ اس تلاش میں شہروں اور ملکوں کے دورے کو نکل کھڑے ہوئے۔

شام قریب تھی، سامنے خراسان کی پتھریلی عمارتیں نظر آرہی تھیں موٹے اور کھُردرے ٹاٹ کا لباس بدن پر تھا۔ ایک عصا اور ایک لوٹا ہاتھ میں تھا۔ راہ گیر اس عجیب و غریب اور اپنے افکار میں گم جوان کو دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ جب آبادی بالکل قریب آگئی تو جوان نے ایک خچر سوار کو ہاتھ سے روک کر دریافت کیا "مہربان دوست! خدا تجھ پر رحمتیں نازل فرمائے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ یہاں سے سرائے کتنی دُور ہے؟"

خچر سوار نے جوان کو سر سے پیر تک دیکھا اور پیچھے مڑ کر، دُور ایک مٹیالی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اور تجھ پر بھی خدا اپنی رحمتیں نازل کرے، وہ رہی سرائے!" پھر پوچھا "کیا تم صوفی ہو؟"

جوان نے جواب دیا۔ "صوفی تو بڑی چیز ہوتا ہے۔ ابھی تو میں صوفیت کی راہ کا ایک مسافر ہُوں!"

خچر سوار ہنسنے لگا۔ "میں سرائے ہی سے آرہا ہُوں، جب تم سرائے پہنچو گے تو وہاں تمھیں اور بہت سے صُوفی ملیں گے لیکن وہ شاید تم سے بڑے صوفی ہیں۔ اچھے اچھے لباسوں میں ملبُوس اور اچھی اچھی غذائیں اور پھل کھانے والے۔"

خچر سوار یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور یہ جوان کچھ دیر بعد جب سرائے میں داخل ہوا تو اس کی پہلی نظر بالاخانے پر پڑی۔ وہاں لمبی لمبی داڑھیوں والے کئی چہرے اس جوان کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایک نے گردن ذرا آگے بڑھا کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

جوان نے جواب دیا۔ "ایک مسافر، شب بسری کے لیے اس سرائے میں ٹھیرنا چاہتا ہُوں۔"

اوپر سے قہقہوں کی آواز سُنائی دی۔ کسی نے کہا۔ "معلوم تو یہ بھی صوفی ہی ہوتا ہے لیکن ہم میں سے ہرگز نہیں ہے!"

جوان نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "تم نے بالکل صحیح کہا۔ بے شک میں تم میں سے نہیں ہوں۔"

چند صوفی نیچے آگئے اور جوان کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ٹھیرا دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ اوپری منزل سے لذیذ کھانوں کی خوشبوئیں ناک سے داخل ہو کر معدے میں حرص و طلب سے قراقر پیدا کر رہی تھیں۔ اتنے میں ایک صوفی نے سوکھی روٹیوں کے چند ٹکڑے لاکر سامنے رکھ دیے اور پانی کا برتن رکھتا ہوا بولا۔ "لو! اسے کھالو اور اللہ کا شکر ادا کر کے آرام کرو۔"

اوپری منزل سے ہنسی مذاق کی آوازیں آرہی تھیں۔ صوفی مرغن غذائیں مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور یہ مسافر جوان سوکھی روٹیوں کو پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام صُوفی نیچے آگئے، ان کے پاس خربوزوں کے ڈھیر تھے، وہ ہنس ہنس کر جوان کا مذاق اڑانے لگے

خربوزے کھاتے جاتے اور اس کے چھلکے جوان کی طرف اچھال دیتے۔ کئی
چھلکے سر پر گرے اور کرتے اور رخساروں کو چپچپا کر دیا۔ جوان حرفِ شکایت سے
بے نیاز ضبط و تحمل سے کام لیتا رہا۔ اسے تسلیم و رضا کی منزل پر پہنچنا تھا
اور وہاں تک پہنچنے کے لیے راہ کی ان ملامتوں اور صعوبتوں کو بڑے صبر و
تحمل سے برداشت کرنا بہت ضروری تھا۔ اس امتحان کا یہی نصاب تھا اور
قلب و دماغ میں سمائی ہوئی انا اور بہت کچھ جاننے کے جذبۂ فخر جیسے مہلک
نفسانی مرض کا یہی کامیاب علاج تھا، اس کو یہ ملامت کرنے والے طنز و
استہزا کے پیکر صوفی اس معالج کی شکل میں نظر آنے لگے جس کی تلاش
میں اس نوجوان نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ اس کے دل میں کوئی بیٹھا کہہ
رہا تھا۔

"اے علی ہجویر کے رہنے والے! تیری وہ مشکل جس کے لیے تو نے
سخت مجاہدے کیے اور دور دراز شہروں کے سفر کیے، اللہ تعالیٰ کی عنایت
سے وہ دور ہو چکی ہے۔ اللہ کے بڑے بڑے اور نیک بندوں کے لیے
ان نادان اور جاہلوں کی صحبت بہت ضروری ہے تاکہ ہوائے نفس کا
مرض سرایت نہ کر سکے۔"

سیر و سیاحت کے بعد آپ پھر اپنے مرشد کے پاس واپس گئے
وہاں سے انھیں لاہور جانے کا حکم ملا۔ آپ کو معلوم تھا کہ لاہور میں ان
کے پیر بھائی شیخ حسین زنجانی پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ نے اپنے
مرشد سے کہا "لاہور میں تو شیخ حسین موجود ہی ہیں، کہیں اور جانے کا
حکم صادر فرمائیں۔ ایک نیام میں دو تلواریں؟"

مرشد نے جواب دیا "تمھیں لاہور ہی جانا ہے، حکم کی تعمیل میں
چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے!"

آپ فوراً لاہور کے لیے روانہ ہو گئے اور یہ سفر اتنی عجلت میں کیا
کہ اپنی کتابیں تک ساتھ نہ لے جا سکے۔ ان کے ساتھ لاہور آنے والوں
میں ایک صاحب ابوسعید ہجویری بھی تھے۔ جب حضرت سید علی ہجویری
لاہور میں داخل ہو رہے تھے، سامنے سے ایک جنازہ آتے دیکھا۔ آپ نے
کسی سے دریافت کیا "یہ کس کی میت ہے؟"

کسی نے جواب دیا "شیخ حسین زنجانی کی۔"

آپ دنگ رہ گئے اور مرشد کے حکم کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

ایک بڑھیا آپ کے سامنے سے گزری۔ دودھ کا برتن اس کے
سر پر تھا۔ آپ نے اسے اشارے سے روکا اور کہا "ہمیں دودھ درکار
ہے۔ تم ہم سے اس کی قیمت لے کر دے دو۔"

بڑھیا نے دہائی کھینچی۔ کہنے لگی "میں جس شخص کے پاس یہ
دودھ لیے جا رہی ہوں، اگر اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ تم نے مجھ سے
لے لیا ہے تو وہ اپنے سفلی علم کے زور سے ہمارے دودھ دینے والے
جانوروں کو بے کار کر دے گا۔ جس سے وہ دودھ کی جگہ خون دینے لگیں گے۔"

آپ نے مسکرا کر فرمایا "تم اس کی فکر نہ کرو، دودھ ہمیں دے دو،
خدا بڑی برکت دے گا۔"

بڑھیا نے متاثر ہو کر دودھ دے دیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ
پیا، بقیہ دریا میں پھنکوا دیا۔ بڑھیا نے رات کو جب جانوروں کو دوہا تو
انھوں نے اتنا زیادہ دودھ دیا کہ گھر کے سارے ہی برتن بھر گئے۔ جب
سفلی عمل کے ماہر کو اس بات کی خبر ہوئی تو کئی سخت ترین آزمائشوں
اور مقابلوں کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا اور حضرت سید علیؒ
نے اسے شیخ ہندی کا نام دیا۔

آپ نے لاہور میں پوری توجہ اور تن دہی سے تبلیغ اور اشاعتِ
اسلام کے لیے کام کیا اور بہت سوں کو مسلمان کر لیا۔

یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ جب مسجد بن کر تیار ہو گئی
تو چند ثقہ حضرات نے قبلے کی سمت پر اعتراض کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے
جنوب میں اس کی سمت میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ بعضوں نے کہا اس
کی محراب میں دوسری مسجدوں کے مقابلے میں جنوب میں کچھ کجی آ گئی
ہے۔ آپ نے چند دنوں تک خاموشی اختیار کی۔ پھر ایک دن آپ نے ان
سب کو جمع کیا اور خود نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ نے
معترضین سے پوچھا "ہاں اب بتاؤ کہ کعبہ کدھر ہے؟"

معترضین کی نظریں محراب کی طرف اٹھ گئیں، ان کی نظروں
سے حجابات دور ہو گئے، محراب کے اس پار بالکل سامنے بیت اللہ صاف
نظر آ رہا تھا۔ معترضین نے شرمندہ ہو کر گردنیں جھکا لیں۔

آپ کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ یہاں
تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جب برصغیر میں تشریف لائے
تو پہلی حاضری حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزارِ اقدس پر دی اور یہیں
چلہ کشی کی۔ اسی موقع پر حضرت خواجہ صاحبؒ نے حضرت سید
علی ہجویری کی شان میں یہ کہا تھا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا　　ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

"خزانے بخشنے والے، دُنیا کو فیض پہنچانے والے، خدا کے نور کے مظہر ہیں۔ وہ ناقصوں کے لیے پیرِ کامل اور کاملوں کے رہنما ہیں۔"

گنج بخشؒ آپ اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"اے علی، خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال تو اپنے دل میں نہ لا کہ لوگ تجھے گنج بخش کہتے ہیں یہ محض دعوا اور غرور ہوگا۔ گنج بخش تو وہ ذاتِ پاک ہے اس کے ساتھ شرک نہ کرنا ورنہ تیری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

آپ نے ہزاروں کو مسلمان کیا۔ آپ نے تلقین اور تبلیغ کا کام قلم سے بھی لیا اور دس کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن ان میں "کشف المحجوب" کے سوا کوئی کتاب نہیں ملتی۔ "کشف المحجوب" کا سببِ تصنیف یہ ہے کہ ابو سعید ہجویری نے ایک موقع پر حضرت داتا گنج بخشؒ سے دریافت کیا "مجھے طریقِ تصوّف کی حقیقت اور مقاماتِ صوفیہ کی کیفیت، ان کے عقائد و مقالات کی تشریح وغیرہ سے باخبر فرمائیں۔"

اُن کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ "کشف المحجوب" ہے۔

آپ نے اہلِ تصوّف کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مستصوف۔

۱۔ **صُوفی** : صُوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو اور مادیّت سے گزر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو۔

۲۔ **مُتصوف** وہ ہے جو مجاہدات سے یہ راہ طے کر رہا ہو اور منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو۔

۳۔ **مُستصوف** وہ ہے جو محض جاہ و مال کے لیے دُنیا طلبی کی خاطر، خود کو صوفیہ اور متصوفیہ کے مشابہ بنائے اور حقیقتہً ان دونوں میں سے نہ ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں تو مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے لیکن دوسروں کے حق میں بھیڑیے کی مانند جس کی غذا ہی گوشت اور خون ہے۔

آپ نے فرمایا "علم بغیر عمل کے مکمل نہیں ہو سکتا۔"

جو لوگ دن رات عبادتوں میں لگے رہتے ہیں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتے اُن کی بابت فرمایا "عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ اس سے ہمارے اندر نیکی پیدا ہو۔ جس عبادت سے نیکی نہ پیدا ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

مزید فرمایا "تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ اوّل غافل علما سے۔ دوم خوشامدی درویش سے۔ سوم جاہل صوفی سے۔"

آپ سوفسطائیوں (ہر بات میں شک کرنے والوں) سے بہت نفرت کرتے تھے۔ سوفسطائی کہتے ہیں کہ انسان کو کسی شے کا صحیح طور پر علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کا بھی صحیح علم میسر نہیں آ سکتا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ سوفسطائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تمھاری یہ بات کہ انسان کو کسی شے کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، صحیح ہے یا غلط؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ صحیح ہے تو بس علم کو تم نے خود ہی ثابت کر دیا ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ غلط ہے تو کسی غلط بات کو حق کے خلاف کس طرح پیش کر سکتے ہو؟"

آپ کو حضرت عمرؓ کا یہ قول بہت پسند تھا کہ "بُری صحبت کے مقابلے میں گوشہ نشینی (تنہائی) راحت کا باعث ہے۔"

آپ نے واقعات اور حکایات کی صورت میں انسانی اور دینی رموز اور اشارے بیان فرمائے ہیں۔ جود و سخا کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک شخص حضرت حسنؓ بن علیؓ کے درِ دولت پر آ کر کہنے لگا "اے رسول اللہؐ کے بیٹے! مجھ پر چار سو درہم قرض ہیں۔" حضرت حسنؓ نے اسے چار سو درہم عطا فرمائے اور پھر چشم پُرنم گھر کے اندر چلے گئے۔ کسی نے پوچھا "اے رسول اللہؐ کے بیٹے! آپ اشک بار کیوں ہیں؟" آپ نے جواب دیا "مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس شخص کا حال معلوم کرنے کی غفلت کا مرتکب کیوں ہوا، جس کی وجہ سے اسے سوال کی رُسوائی برداشت کرنی پڑی۔"

اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "حضرت ابو سہل صدقہ کبھی کسی درویش کے ہاتھ میں نہیں دیتے تھے بلکہ زمین پر رکھ کر ہٹ جاتے تھے تاکہ مستحق حضرات خود اُٹھا لیں۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت سہلؒ نے فرمایا کہ دینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں براہِ راست چیز دے دی جائے جس سے دینے والے ہاتھ کو برتری اور لینے والے ہاتھ کو رُسوائی اور پستی کا سامنا کرنا پڑے۔"

آپ علم کی بابت فرمایا کرتے تھے کہ "طبعِ انسانی کے لیے آگ پر چلنا، راہِ علم پر چلنے سے آسان تر ہے۔"

اس سلسلے میں مزید فرمایا "وہ ایک جاہل کے لیے پُل صراط پر سے ہزار بار گزرنا اس بات سے کہیں آسان ہے کہ علم کا کوئی ایک مسئلہ حل کیا جائے۔"

یہ آپ ہی کا قول ہے:

"دس چیزیں دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں نیکی بدی کو۔ تکبّر علم کو۔ توبہ گناہ کو۔ جھوٹ رزق کو، عدل ظلم کو، غم عمر کو۔ صدقہ بلا کو۔ پشیمانی سخاوت کو اور غیبت نیک اعمال کو۔"

شادی کے سلسلے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ دو شادیاں کی تھیں لیکن کچھ کہتے ہیں کہ شادی سرے سے کی ہی نہیں تھی۔

تاریخ ولادت کا بھی نہیں پتہ چلتا۔ بڑے آدمیوں کی بابت عموماً یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اُن کی پیدائش کے وقت لوگ چونکہ اُن کے شاندار مستقبل اور شخصی بلندی سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے اُن کی پیدائش پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور اس طرح ولادت کی تاریخ کا صحیح علم نہیں ہو پاتا۔ آپ کی وفات ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء کے لگ بھگ ہوئی۔ ولادت کا شرف ہجویر (غزنی) کو حاصل تھا تو وفات اور جسدِ خاکی کی مستقل اقامت کا شرف لاہور کو حاصل ہوا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" پر دو محققین نے بڑی محنت کی۔ ڈاکٹر نکلسن اور پروفیسر ژوکوسکی۔ اسے ڈاکٹر نکلسن نے انگریزی میں اور پروفیسر ژوکوسکی نے روسی زبان میں ترتیب دیا۔ پروفیسر ژوکوسکی جون ۱۹۱۸ء میں انتقال فرما گئے ان کے بعد حکومتِ روس نے اسے ۱۹۲۶ء میں لینن گراڈ سے شائع کیا اور اس کی اشاعت فارسی اور روسی دونوں ہی زبانوں میں عمل میں لائی گئی۔

حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف "کشف المحجوب" کی عظمت کا اعتراف حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

"وہ جس کا کوئی مُرشد نہ ہو اس کو "کشف المحجوب" کے مُطالعے کی برکت سے مِل جائے گا۔"

جب آپ لاہور کے بھاٹی دروازے سے باہر غربی جانب کی مسجد کی طرف چلیں گے تو اس مسجد کے قریب ہی آپ کو اس عظیم الشان انسان کے مقبرے کی عمارت ملے گی۔ یہ آخری آرام گاہ آپ کا وہ حجرہ ہے جہاں آپ تبلیغ و تدریس کے بعد استراحت فرمایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہاں چالیس روز متواتر حاضری دی جائے یا چالیس جمعے کی راتوں کو مزار کا طواف کیا جائے تو ہر مشکل آسان اور حاجت پوری ہو جاتی ہے۔

جب آپ مقبرے کے قدیمی صدر دروازے سے اندر داخل ہوں تو آپ کو بائیں طرف مسجد ملے گی۔ پھر آگے چل کر دو مزاروں کے بعد داہنی جانب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا حجرۂ اعتکاف ملے گا۔ اس حجرۂ اعتکاف سے چند قدم کے فاصلے پر دائیں طرف سنگ مرمر کا وہ چبوترا ملے گا جہاں حضرت داتا گنج بخشؒ استراحت فرما رہے ہیں اور پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔

اس آستانے پر بڑے بڑے سلاطین اور فرماں روا غلاموں کی طرح حاضریاں دیتے رہے ہیں۔ غزنوی سلاطین کے علاوہ قطب الدین ایبک التمش غیاث الدین بلبن، جلال الدین اکبر، نور الدین جہانگیر اور دارا شکوہ نے یہاں کی حاضری میں فخر محسوس کیا ہے۔ یہاں تک کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے حاکم لاہور میر مومن نے وفات کے وقت خواہش کی کہ اسے ٹھیک اس جگہ دفن کیا جائے جہاں دربارِ داتا میں حاضری دینے والے زائرین اپنی جوتیاں اُتارتے ہیں۔ اس طرح میر مومن خاں حضرت داتا کے عقیدتمندوں کی کفش برداری کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کی خواہش پوری کی گئی اور جب آپ وہاں پہنچیں گے تو اس حاکم اعلا لاہور میر مومن خاں کی قبر مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ملے گی۔ اس قبر میں کوئی خاص بات نہ ملے گی۔ یہاں تک کہ اس پر قبر کا تعویذ بھی نہیں ہے ---- اس کے باوجود اس حاکم کو اس کی خواہش پوری کر کے جو شرف بخشا گیا ہے، یہ شرف اسے اپنی زندگی میں شاہانِ عصر سے بڑے بڑے مناصب اور عہدے حاصل کرنے کے بعد بھی نہ مل سکتا تھا۔

آج حضرت داتا گنج بخشؒ کو رحلت فرمائے ہوئے نو سو سال سے زائد کا زمانہ گزر چکا ہے لیکن ہر سال سن ہجری کی ۱۹، ۲۰ صفر کو وہ عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے جس کو دیکھ کر ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے فیوضِ رُوحانی جاری و ساری ہیں اور شہر لاہور کی بقا، رونق اور آبادی آپؒ کے سایۂ عاطفت میں ہے۔ جب تک داتا گنج بخشؒ موجود ہیں، لاہور اور اس کی رونقیں موجود ہیں۔

***



## اودھی بھاشا

اور سنسکرت کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ عرفان بھی تھے۔ بہت سے لوگ اُن کے معتقد اور مرید تھے۔ امیٹھی کا راجا اُن پر بہت مہربان تھا۔ ملک محمد جائسی نے اپنے لیے ایک خانقاہ سی بنوا رکھی تھی، لوگ وہیں پہنچ جایا کرتے تھے۔ امیٹھی کا راجا بھی ایک بندوقچی کے ساتھ ملک صاحب کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ ملک جائسی راجا سے زیادہ اس بندوقچی کی خاطر مدارات کیا کرتے تھے۔ خانقاہ کے دوسرے لوگ بھی اس بات کو محسوس کرتے رہتے تھے۔

ایک دن کسی نے دریافت کیا۔ "کیوں جناب یہ کیا بات ہے کہ آپ راجا صاحب سے زیادہ اُن کے بندوقچی کی خاطر مدارات کرتے رہتے ہیں۔"

شاعر جائسی نے جواب دیا۔ "یہ میرا قاتل ہے۔"

اس جواب سے خانقاہ پر عجیب سی خاموشی طاری ہوگئی۔

بندوقچی دو قدم آگے بڑھا اور افسوس کے لہجے میں بولا۔ "قبلہ جائسی صاحب! میں نہیں چاہتا کہ دوزخ میں جاؤں۔ اگر واقعی یہ بات ممکن ہے کہ میں آپ کو قتل کر دوں گا تو میری خواہش ہے کہ اس سے پہلے خود مجھے قتل کرا دیجیے۔"

راجا نے ملک جائسی سے عرض کیا۔ "میری طرف سے آپ کو یہ اجازت حاصل ہے کہ آپ اسے قتل کرا دیں۔"

لیکن ملک صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ راجا صاحب نے احتیاطاً اُس کی بندوق ضبط کرلی۔ اُس کے بعد بھی اس بندوقچی کو راجا کی مصاحبت میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔

ایک دن رات کو اُسے راجا کے محل میں بڑی دیر تک ٹھہرنا پڑا۔ رات بہت اندھیری تھی۔ گھر تک جانے کا راستہ جنگل میں سے ہو کر نکلتا تھا۔ وہ چپکے سے داروغہ کے پاس پہنچا اور رات بھر کے لیے بندوق طلب کی۔

داروغہ کو پہلے تو بندوق دینے میں تامل ہوا لیکن جب بندوقچی نے یہ بتایا کہ جنگل کا راستہ درندوں کی وجہ سے مخدوش ہے تو داروغہ نے اُسے بندوق دے دی۔ وہ بندوق لے کر جنگل کی طرف چل پڑا۔ جب جنگل میں داخل ہوا تو اُسے ایک طرف سے شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ بندوقچی کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ آواز پر فائر کر دیا۔ گولی ملک صاحب کی پیشانی میں اُتر گئی۔ اُس وقت دراصل ملک صاحب ذکرِ اسدی میں مشغول تھے۔ ذکرِ اسدی اُس طریقِ عبادت کو کہتے ہیں جس میں آدمی کے حلق سے شیر کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ گولی کے لگتے ہی ملک جائسی کی آواز بند ہوگئی۔ بندوقچی یہ سمجھا کہ اُس کا نشانہ ٹھیک بیٹھا اور شیر ہلاک ہوگیا، وہ سیدھا اپنے گھر چلا گیا۔

راجا محل میں سویا ہوا تھا۔ انہی لمحات میں راجا نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے "تم سو رہے ہو اور ملک جائسی کو تمہارے بندوقچی نے ہلاک کر دیا۔"

راجا بیدار ہو کر جنگل کی طرف بھاگا۔ جب وہ خانقاہ کے قریب پہنچا تو ملک صاحب رخصت ہو چکے تھے۔ ایک کہرام برپا ہوگیا۔ راجا نے ملک جائسی کا بڑا سوگ منایا۔

رام نگر میں ملک جائسی کا پختہ مزار آج بھی موجود ہے۔ راجا ہندو تھا لیکن اُس نے ملک جائسی کی قبر پر ایک قرآن خواں مقرر کر دیا تھا جو تلاوت کیا کرتا تھا۔ ملک صاحب کی وفات ۱۶۳۹ء (بہ عہد شاہجہان) ہوئی تھی اور قرآن خوانی کا سلسلہ ۱۹۱۳ء تک جاری رہا۔ جب ہندو مسلم مناقشات زیادہ بڑھے اور دلوں میں تعصب نے گھر کرلیا تو ملک جائسی کی قبر سے قرآن خواں بھی ہٹا دیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُدھر سے قرآن خواں ہٹا اور راجہ نے ملک جائسی کے مزار سے لاتعلقی اختیار کی اور دوسری طرف ریاست میں تبدیلی آگئی اور بالآخر انگریزی سرکار کی تحویل میں چلی گئی۔



وُہ جو اپنے طرز کی مُنفرد، دِلچسپ عِبرتناک اور

جرائم کی کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے ساری دُنیا میں مشہور ہیں، اُنہی ۔ ھنری سلاسر ۔ کی

## ایک مُجرِم کہانی

ش۔ م۔ جمیل

**کارل** اپنی دکان کے بالکل سامنے لیمپی کے ریستوراں میں داخل ہوا۔ لیمپی ایک بدمعاش تھا۔ یہ ریستوراں ایک طرح سے اس کا ہیڈکوارٹر تھا۔ یہاں اس کا بیحد محفوظ دفتر تھا جس میں بیٹھ کر وہ مختلف غیرقانونی کاروبار کرتا تھا۔

کارل کی دکان اور لیمپی کے ریستوراں کے درمیان صرف ایک سڑک تھی۔ چونکہ لیمپی کا ریستوراں اس کی دکان سے قریب ترین تھا۔ اس لیے وہ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتا تھا۔ لیکن آج جب وہ ریستوراں میں داخل ہوا تو کھانے کے سوا بھی اس کا ایک مقصد تھا۔ وہ اپنی مخصوص میز پر بیٹھ گیا اور اس کا مخصوص بیرا اسے دیکھتے ہی میز پر کھانا لگانے لگا۔ کارل نے آج کھانے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اخبار پھیلائے ایک خبر غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے جلی حروف میں ایک خبر تھی جس کا عنوان تھا "لیمپی کو پولیس نے گیری کے قتل کے شبہے میں



گرفتار کر لیا۔"

کارل یہ خبر صبح پڑھ چکا تھا لیکن لیمپی کے ریستوران میں بیٹھ کر دوبارہ پڑھنے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ قتل کے متعلق حقائق بہت مختصر، سیدھے سادے اور غیر پیچیدہ تھے۔ یہ قتل دو بدمعاشوں کے گروہوں کے درمیان کاروباری چپقلش کا نتیجہ تھا۔ باخبر حلقے جانتے تھے کہ مقتول گیری ایک اور بدمعاش فرینک کا گرگا تھا۔ اسے اس وقت قتل کیا گیا تھا جب وہ ایک ٹیلیفون بوتھ میں دروازے کی جانب پشت کیے ٹیلیفون کر رہا تھا۔ پولیس کو لیمپی پر قاتل ہونے کا شبہ تھا۔ لیمپی خوش لباس ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ پولیس نے اسے قتل کے شبہے میں گرفتار کر لیا تھا۔

اس ریستوران میں روزانہ کھانا کھانے کی وجہ سے کارل، لیمپی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ خود لیمپی بھی جب اسے اپنے ریستوران میں دیکھتا تو مسکرا کر سر ہلاتا تھا۔ کارل کو لیمپی جیسے بدمعاش کے ساتھ واقفیت پر بہت فخر تھا۔ وہ لیمپی کے ریستوران میں کھانا کھاتا اور ریستوران کے بیروں کے ساتھ گھڑ دوڑ کے متعلق شرطیں لگاتا تھا۔

"مسٹر کارل کاروبار کیسا جا رہا ہے؟" ہنری نے اس کی میز پر جھکتے ہوئے پوچھا۔ یہ بیرا اسے برسوں سے کھانا کھلا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان خاصی بے تکلفی تھی۔ کارل اسی بیرے سے گھوڑوں پر شرطیں لگاتا تھا۔

"بس یوں ہی سا ہے ہنری، تم سناؤ لیمپی کو تو پولیس نے بند کر دیا ہے۔"

"اخبار کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے جناب۔" بیرے نے کہا۔ "باس نے صبح پولیس ہیڈ کوارٹر سے فون کیا تھا کہ وہ کل صبح ریستوران واپس آ جائیں گے۔"

"اچھا۔" کارل نے محتاط لہجے میں کہا۔ "اور گیری کا کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ مقتول کے دوست اس واقعے کو لیمپی کی کارستانی سمجھتے ہیں۔ کیا وہ گیری کا انتقام نہیں لیں گے؟ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میں ویٹر ہوں جناب، میرا کام میز پر کھانا لگانا ہے، سوچنا یا اندازے لگانا نہیں ہے۔"

"سنا ہے فرینک، مقتول کا اچھا دوست تھا؟ کیا وہ مسٹر لیمپی کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا؟ میری دعا ہے کہ جس وقت یہاں گولیاں چلنی شروع ہوں، اس وقت میرے ہاتھ میں نوالا نہ ہو۔"

ویٹر کھڑے کھڑے بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نظریں ایک اور گاہک پر پڑیں اور اس نے جلدی سے کہا۔ "معاف کیجیے گا مسٹر کارل، آپ کو مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"نہیں، آج تو نہیں ہے لیکن تمھارے باس کی واپسی کے بعد شاید...

..." کارل نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، کیونکہ ویٹر ایک دوسری میز پر جھکا ہوا گاہک کا آرڈر نوٹ کر رہا تھا۔

جب کارل ریستوران سے باہر نکلا تو وہ خود کو آسمانوں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کارل جیسے غیر اہم اور عام انسانوں کو ایسا صرف اسی وقت محسوس ہوتا ہے جب ان کی جیب میں غیر متوقع طور پر کوئی لمبی رقم وغیرہ آجاتی ہے لیکن کارل کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ رقم ابھی اس کی جیب میں آئی نہیں تھی، البتہ آنے والی تھی۔ وہ ابھی سے اپنی جیب تھپتھپا کر آنے والی رقم محسوس کر رہا تھا۔ لیمپی کے ریستوران سے باہر نکلتے وقت وہ خود کو بے حد اہم اور وزنی شخصیت محسوس کر رہا تھا، حالانکہ جثے کے اعتبار سے وہ جاکی بننے کا اہل نظر آتا تھا۔ سڑک پار کرکے وہ اپنی چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے واحد ملازم نے سر اٹھا کر متوقع نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا، لیکن گاہک کے بجائے باس کو دیکھ کر اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا اور رجسٹر میں کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ دکان میں داخل ہوتے ہی کارل کے چہرے پر باس ہونے والے جذبات ابھر آئے۔ اس کی گردن میں سختی پیدا ہو گئی اور سینہ کچھ باہر نکل آیا۔ ملازم کو معلوم تھا کہ جب باس اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ کارل کاؤنٹر کے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے گردن ٹیڑھی کرکے منہ دبا کر خالص امریکی بدمعاشوں کے انداز میں ملازم سے کہا۔ "سنو! مجھے آج دوپہر جو مال بھیجنا تھا، وہ اب میری جگہ تم بھیجو گے۔ مجھے کچھ دوسرے کام کرنے ہیں۔"

"بہتر جناب۔"

"اگر کوئی ملاقاتی مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ میں گیا ہوا ہوں۔"

آج تک کوئی بھی کارل کو پوچھتا ہوا نہیں آیا تھا کیونکہ کارل ایک غیر اہم آدمی تھا۔ اس کی ٹائیوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے والدین فوت ہو چکے تھے اور اس کا کوئی دوست بھی نہیں تھا لیکن ملازم نے کہا: "بہتر جناب۔"

"میں ایک آدمی سے ملنے جا رہا ہوں۔" کارل نے آئینے میں ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے جیسے دیواروں سے کہا۔ "چار بجے تک واپس آجاؤں گا۔"

جب کارل دکان سے باہر نکلا تو ملازم کو ایسا محسوس ہوا، جیسے باس کو چلنے میں کچھ تکلیف ہو رہی ہو، یا اس کی ٹانگیں لکڑی کی بنی ہوئی ہوں۔ کارل نے ٹیکسی ڈرائیور کو فرینک کا پتہ بتایا اور سیٹ سے لگ کر بیٹھ

گیا۔ اس کا منصوبہ مکمل تھا۔ وہ جو کام کرنے جارہا تھا اس سے ایک دم بہت سا نفع ملنے کی امید تھی۔ یہ منصوبہ صبح کے اخباروں میں گیری کے قتل اور لیمپی پر قتل کے شبہے کی خبر پڑھ کر اچانک اس کے ذہن میں آیا تھا۔ دو بدمعاشوں کی دشمنی سے اگر وہ کوئی فائدہ حاصل کر سکتا تھا تو اس کا اسے حق پہنچتا تھا۔ اس نے دوپہر ہی کو ٹیلیفون پر فرینک سے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔

فرینک کو دیکھ کر کارل حیران رہ گیا۔ وہ شکل و صورت سے بدمعاش نظر نہیں آتا تھا۔ پستہ قد، گنجا سر اور موٹے موٹے ہونٹ۔ "تشریف رکھیے مسٹر کارل" فرینک نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "فرمایئے آپ کو مجھ سے کیا کام ہے اور آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

کارل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرا پیشہ ٹائیاں فروخت کرنا ہے لیکن میں جس سلسلے میں آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں، اس کا تعلق ٹائیوں سے ہرگز نہیں ہے۔"

"خوب، فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"مدد؟ میری۔" فرینک کی نظروں سے تمسخر عیاں تھا۔ وہ غور سے کارل کا دبلا پتلا جسم دیکھ رہا تھا۔

"جی ہاں مثلاً لیمپی سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ کی مدد۔"

"میں کسی لیمپی کو نہیں جانتا۔"

"میں نے اخباروں میں پڑھا تھا مسٹر فرینک کہ آپ لیمپی کو پسند نہیں کرتے، خاص طور پر گیری کے قتل کے بعد۔"

"تم کونسا کھیل کھیل رہے ہو مسٹر؟" فرینک نے کہا۔

"میں بہت سنجیدہ ہوں مسٹر فرینک۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے دوست گیری کا قاتل لیمپی ہے اور آپ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ نے لیمپی سے بدلہ لینے کے لیے اپنے طور پر کوئی منصوبہ بنا لیا ہو لیکن میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے جسے آپ ضرور سننا پسند کریں گے۔"

فرینک نے آنکھیں بند کرلیں۔ "اچھا تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ میں لیمپی کو جانتا ہوں، اب بتاؤ تمہاری تجویز کیا ہے؟"

کارل کچھ پریشان ہوگیا۔ فرینک نے جو رویہ اختیار کیا تھا، وہ اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ "میری تجویز یہ ہے مسٹر فرینک کہ میں آپ کے لیے لیمپی کو ٹھکانے لگا دوں، اس طرح آپ کا یا آپ کے دوستوں کا نام اس سلسلے میں نہیں آئے گا۔ میرے پاس لیمپی کو ٹھکانے لگانے کا بہت عمدہ منصوبہ ہے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو صرف ہاں کہہ دیجیے۔ آپکا کام ہو جائیگا۔"

"تجویز اچھی ہے مگر اس میں معاوضے کا ذکر نہیں آیا؟"

"دو ہزار ڈالر۔"

"دو ہزار ڈالر؟ اور اس کے عوض مجھے کیا ملے گا مسٹر کارل؟"

"لیمپی آپ کے راستے سے ہٹ جائیگا۔ آپ کا نام اس سلسلے میں نہیں لیا جائے گا اور پولیس آپ کے دوستوں پر بھی کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکے گی۔"

"میں اب بھی کسی لیمپی سے واقف نہیں ہوں لیکن تم اپنی گفتگو جاری رکھو۔" فرینک نے ہنستے ہوئے کہا۔

کارل نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹ تر کیے۔ پھر آگے جھک کر بولا۔ "اگر یہ کام کوئی بالکل نیا آدمی کرے تو؟ ایسا آدمی جس کا آپ سے یا لیمپی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو؟ ایسا آدمی جس کے پاس لیمپی کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ پھر بھی وہ لیمپی کو قتل کر دے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اور وہ نیا آدمی کون ہوگا؟ تم؟"

"ہاں۔" کارل ایک گہرا سانس لے کر سیدھا بیٹھ گیا۔ "میں آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مسٹر فرینک۔"

●

جب کارل اپنی دکان پر واپس آیا تو اس کا موڈ خراب تھا۔ وہ خواہ مخواہ ملازم کو جھاڑتا رہا۔ اس پر برستا رہا۔ اسے کاہل اور کام چور ہونے کے طعنے دیتا رہا اور جب دکان بند ہونے کا وقت قریب آیا تو وہ اسے خدا حافظ کہے بغیر گھر چلا گیا۔ اس تمام عرصے میں ملازم بالکل خاموش رہا۔ ایک خاموشی ہزار بلائیں ٹالتی ہے۔

گھر پہنچ کر بھی کارل کا خون فرینک کے رویے پر کھول رہا تھا۔ اس احمق نے مضحکہ اڑاتے ہوئے اسے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ کارل کی مٹھیاں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ وہ تصور میں فرینک پر دانت پیس رہا تھا۔ اس کا ذہن انتقام کے مختلف منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ اس نے تصوراتی نظروں سے خود کو فرینک پر ریوالور تانے دیکھا۔ فرینک اس کے قدموں پہ گرا ہوا گڑگڑا کر اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ "رحم؟ تم پر؟" کارل نے دانت پیس کر کہا۔ "گندی نالی کے غلیظ کیڑے، تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ تم پر رحم کیا جائے ....."

اچانک اسے باورچی خانے میں دودھ جلنے کی بو آئی۔ وہ دوڑتا ہوا گیا اور اپنے لیے کافی بنانے لگا۔ اس نے رات کے کھانے کے لیے انڈے کے

سینڈوچز بنلئے اور دونوں چیزیں لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا جرائم کی کوئی جنگ و جدل سے بھرپور فلم دکھائی جارہی تھی۔

لیمپی کو قتل کرنے کا خیال اسے اخبار پڑھ کر آیا تھا۔ اس کے ذہن میں لیمپی کو قتل کرنے کا ایک بے حد عمدہ منصوبہ تھا۔ پانچ منٹ کے کام میں اگر دو ہزار ڈالر نفع حاصل ہوجائے تو اس سے اچھا کاروبار اور کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن فرینک کی سرد مہری نے اس کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ فرینک اس کی تجویز سن کر اسے گلے لگالے گا اور جی آؤ بھگت کرے گا کیونکہ وہ اس کے لیے نجات دہندہ بن کر جارہا تھا۔ لیکن وہ احمق... اس کی تجویز بے حد عمدہ تھی۔ پولیس اس پر قیامت تک شبہ نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ اس کا تعلق نہ تو لیمپی سے تھا نہ فرینک سے اس کے پاس بظاہر لیمپی کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر آخر پولیس اس پر قتل کا شبہ کیوں کرتی؟ اس طرح لیمپی بھی ٹھکانے لگ جاتا اور اسے دو ہزار ڈالر بھی مل جاتے اور فرینک اور اس کے ساتھی بھی پولیس کی زد سے بچ جاتے۔

وہ سونے کے لیے بستر میں گھس رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور فوراً ہی فرینک کی آواز پہچان گیا۔

"تم اب بھی اپنی تجویز میں دلچسپی رکھتے ہو؟" فرینک نے پُراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔

"کونسی تجویز؟" کارل نے انجان بنتے ہوئے پوچھا

"وہی جو تم نے آج میرے سامنے رکھی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے چھان بین کروائی تو ثابت ہوا کہ تم صحیح آدمی ہو تم جانتے ہو، ہم لوگوں کو کس قدر محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو تو مجھ سے کل صبح ملو۔ دس بجے۔ ٹھیک ہے؟"

اس رات اسے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی۔ اس لیے وہ صبح دیر سے اٹھا۔ اس نے دکان پر جانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ وہ لباس تبدیل کرکے سیدھا فرینک سے ملنے کے لیے چل دیا۔ اس مرتبہ اسے فرینک سے ملنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ فرینک اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اور موٹا سا آدمی موجود تھا جس کی شکل دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سو رہا ہو۔

"یہ مسٹر کوسٹا ہیں۔" فرینک نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے خزانچی ہیں۔ تم ان کے سامنے بے جھجک ہوکر گفتگو کرسکتے ہو۔"

"خوب، ہم کس موضوع پر بات کریں گے؟" کارل نے کہا

"دیکھا تم نے؟" فرینک نے خوشی سے اپنے خزانچی کو مخاطب کیا۔ "کیا کہا تھا میں نے؟ خیر مسٹر کارل ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کل تمہارے جانے کے بعد میں نے تمہارے متعلق معلومات حاصل کیں تو نتیجہ اطمینان بخش رہا۔ تم نے اپنے بارے میں صحیح کہا تھا کہ تم اس کام میں بالکل نئے ہو۔ کسی تھانے یا جیل میں تمہارا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔"

"درست ہے لیکن میں لیمپی سے خوب واقف ہوں۔ مجھے صرف یہ کرنا ہوگا کہ میں اس کے پرائیویٹ دفتر میں داخل ہوکر ــــــ"

---

## ایک یونانی کہانی

بارش کو لوگ ترس رہے تھے۔ بادل آتے اور گڑگڑاتے گزر جاتے۔ گرمی اور پسینے نے لوگوں کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد بوندا باندی شروع ہوئی۔ لوگ فرطِ خوشی میں کھُلے آسمان تلے کھڑے ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں موسلا دھار بارش نے جل تھل ایک کردیا۔ اور لوگ مزے لے لے کر اس میں نہاتے رہے۔ صرف بادشاہ اور وزیر اس غسل میں شریک نہ ہوئے لیکن بارش کے پانی کا لوگوں پر ایک عجیب غریب اثر ظاہر ہوا۔ جس جس پر یہ پانی پڑا اس کا ذہنی توازن جاتا رہا اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔

جب بادشاہ اور وزیر کے سامنے بارش کے اثر زدہ درباری کھڑے ہوئے تو انہوں نے بادشاہ اور وزیر کو دیکھ دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہنسنا شروع کردیا اور یک زبان ہوکر ایک ہی بات کہنے لگے "خوب آج تو جہاں پناہ اور وزیرِ اعظم نے اُلٹا لباس زیب تن فرما رکھا ہے۔" درباریوں کے تمسخر اور قہقہوں سے بیزار ہوکر وہ دونوں دربار سے اُٹھ گئے۔ بادشاہ حرم سرا میں چلا گیا اور وزیر اپنے محل سدھارا۔ اندر عورتوں اور بچّوں کا بھی درباریوں ہی جیسا حال تھا۔ وہ سب انہیں دیکھ دیکھ کر ہنستے اور ادب سے عرض کرتے۔

"آج تو جہاں پناہ نے اُلٹا لباس زیب تن فرما رکھا ہے۔"

"آج تو وزیرِ اعظم نے اُلٹا لباس پہن رکھا ہے۔"

اندر سے گھبرا کر بادشاہ اور وزیر ایک بار پھر یکجا ہوئے۔ اور لوگوں کی دیوانگی سے بچنے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے۔ وزیر نے نہایت افسوس اور مایوسی سے عرض کیا "جہاں پناہ! ان سب فرزانگی بخشنا بہت دشوار امر ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ ہم دونوں پائیں باغ میں چلیں اور وہاں کے مٹکوں میں بارش کا جو پانی بھرا رکھا ہے۔ دونوں اس سے غسل فرما کر انھی جیسے ہوجائیں۔

"لیکن کس طرح؟" فرینک نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے شاید کل بھی آپ کو بتایا تھا کہ گھوڑوں پر شرط لگانے کے سلسلے میں لیمپی کو خاصی دلچسپی ہے مگر یہ کام عموماً اس کے دیٹر کرتے ہیں۔ لیکن اگر شرط کی رقم لمبی ہو مثلاً پانچ ہزار ڈالر ہوں تو شرط خود لیمپی لگاتا ہے۔ اگر میں اسے پانچ ہزار ڈالر دکھا کر کہوں کہ مجھے فلاں گھوڑے پر شرط لگانی ہے تو وہ مجھے اپنے پرائیوٹ دفتر میں داخل ہونے کی اجازت دے دے گا۔ ایک مرتبہ اندر داخل ہونے کے بعد اسے مارنا بہت آسان ہوگا" کارل نے کہا۔

"خوب۔ تم نے پہلے ہی سے پورا منصوبہ بنا رکھا ہے۔"

"ہاں" کارل فخریہ مسکرایا۔ "میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں دوپہر کو لیمپی سے اس کے ریستوران میں ملوں اور اس سے کہوں کہ میں اس کے ساتھ ایک گھوڑے پر شرط لگانا چاہتا ہوں۔ میں اس سے یہ بھی کہوں گا کہ بہتر ہے کوئی شخص مجھے تمہارے پرائیوٹ دفتر میں جاتا ہوا نہ دیکھے ورنہ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ اس لیے تم اپنے پرائیوٹ دفتر کا پچھلا دروازہ میرے لیے کھلا رہنے دینا۔ اس طرح میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس کے دفتر میں داخل ہو جاؤں گا۔"

"اور تم باہر کس طرح نکلو گے؟ اسی راستے سے؟"

"بے شک، جب لیمپی میرے دیے ہوئے پانچ ہزار ڈالر گن رہا ہوگا تو میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دوں گا۔ اس سلسلے میں آپ میرے لیے بے آواز ریوالور کا بندوبست کر سکتے ہیں مسٹر فرینک؟"

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں ریوالور دے دوں گا۔ لیکن اس سے چھٹکارا پانا تمہارا کام ہوگا۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں مسٹر فرینک۔"

"پیسوں کا کیا ہوگا؟ تمہارا مطالبہ دو ہزار کا ہے؟"

"تین ہزار کا۔" کارل نے جلدی سے کہا۔ "میرا مطالبہ تین ہزار ڈالر کا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ رقم بہت مناسب اور واجبی ہے کیونکہ تمام خطرات میرے سر ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ مجھ سے کوئی غلطی بھی ہوگئی تو بھی آپ کا نام اس معاملے میں نہیں آئے گا مسٹر فرینک۔"

"مجھے اپنے خزانچی سے معلوم کرنا پڑے گا۔ پیسوں کا لین دین اسی کے ہاتھ میں ہے۔" فرینک نے کہا۔

"ٹھیک ہے فرینک، تین ہزار ڈالر نوٹوں کی شکل میں موجود ہیں ..." خزانچی نے بتایا۔

"تو ٹھیک ہے۔" فرینک نے میز کی دراز کھول کر اعشاریہ ۴۵ کا ریوالور نکال کر کارل کی طرف بڑھا دیا۔ کارل کو اس مختصر سے ہتھیار کا وزن محسوس کر کے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ریوالور کوئی ہلکی پھلکی چیز ہوتی ہوگی۔

"تم ریوالور چلانا جانتے ہو؟"

"آپ مجھے اس کے استعمال کا طریقہ بتا دیجیے۔" کارل نے سادگی سے کہا۔

کارل کو لیمپی کے پرائیوٹ دفتر کے عقبی دروازے کا علم تھا۔ وہ اکثر اپنی دکان میں بیٹھا بعض ناپسندیدہ عناصر کو اسی دروازے سے لیمپی کے پرائیوٹ دفتر میں اندر جاتے اور باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بغلی دروازہ ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد کارل کے لیے اس دروازے سے فرار ہونا بہت آسان کام تھا۔ وہ اس دروازے سے نکلتے ہی سڑک پار کر کے اپنی دکان میں چھپ سکتا تھا۔

دوپہر کو حسب معمول کارل کھانا کھانے لیمپی کے ریستوران میں داخل ہوا لیمپی کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک ملازم سے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ کارل اپنی مخصوص میز پر بیٹھ گیا اور لیمپی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر جیسے ہی ان دونوں کی نظریں ملیں، لیمپی نے اسے پہچانتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ کارل نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر لیمپی" کارل نے اس بدمعاش سے کہا۔ "کیا آج رات میں آپ کے ساتھ کچھ کاروبار کر سکتا ہوں؟ آپ کے پرائیوٹ دفتر میں۔"

"کاروبار؟"

"میں ایک گھوڑے پر لمبی شرط لگانا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" لیمپی نے کچھ بوریت سے کہا۔ "کیوں نہیں۔ تم ہنری سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

"نہیں مسٹر لیمپی! میں صرف آپ سے کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک گھوڑے پر پانچ ہزار ڈالر کی شرط لگاؤں گا۔" کارل نے پانچ ہزار پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اوہو۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں مسٹر کارل؟" لیمپی نے اچانک دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں، میں آپ سے مذاق کس طرح کر سکتا ہوں مسٹر لیمپی؟ میں رات کو رقم لے کر آپ کے پرائیوٹ دفتر میں آؤں گا۔" پھر کارل نے کچھ ایسا ظاہر کیا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔ "سنیے مسٹر لیمپی، میں چاہتا

ہوں کہ کوئی شخص مجھے آپ کے دفتر میں جاتا ہوا نہ دیکھے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر لوگوں نے مجھے وہاں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تو کیسی کیسی باتیں بنائیں گے، اس لیے اگر میں رات کو پچھلے دروازے سے آجاؤں؟"

"ضرور، ضرور، میں دروازہ کھلا چھوڑ دوں گا۔ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہیں مسٹر کارل؟ کیا کھانا اچھا نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں۔ کھانا بہت عمدہ ہے، دراصل مجھے بھوک نہیں ہے۔"

کارل رات کو بھی بھوک محسوس نہیں کر رہا تھا۔ دکان بند کر کے اس نے رات کا کھانا لیمپی کے ریستوران میں کھایا، اس نے بہترین کھانوں کا آرڈر دیا۔ لیکن کھانا آیا تو بھوک غائب ہو گئی۔ کوٹ کی جیبوں میں دو وزنی چیزوں کی موجودگی اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ ایک جیب میں اعشاریہ ۴۵ کا ریوالور تھا جو فرینک نے اسے دیا تھا اور دوسری جیب میں پانچ ہزار ڈالر کے نوٹوں کی ایک گڈی۔ نوٹوں کی گڈی حیرت انگیز طور پر اپنے ریوالور کے مقابلے میں زیادہ بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ کھانا کھا کر وہ میز سے اٹھا اور خاص طور پر اپنے دوست ویٹر ہنری کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ پھر ریستوران سے باہر نکل آیا۔

وہ گھوم کر گلی میں پہنچا اور بغلی دروازے پر رک گیا۔ اس نے دو مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا اور جب اسے لیمپی کی آواز سنائی دی تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

لیمپی کا دفتر بہت شاندار تھا، مدھم روشنیاں، دبیز قالین اور قیمتی فرنیچر، ایک بے حد آرام دہ کرسی پر لیمپی تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تشریف رکھیے مسٹر کارل"۔ لیمپی نے کہا۔

کرسی پر بیٹھنے سے کارل کا پلان نامکمل رہ جاتا۔ اس لیے کارل نے اس کی درخواست سنی ان سنی کر دی۔

"میں جمعرات والی ریس میں ایک گھوڑے اپریل چانس پر شرط لگانا چاہتا ہوں۔" کارل نے روانی سے کہا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔

"ضرور، رقم کہاں ہے؟" لیمپی نے پوچھا۔ وہ بھی کھڑا رہا۔

"رقم میری جیب میں ہے، میں وعدے کے مطابق پیسے لیکر آیا ہوں مسٹر لیمپی۔" کارل نے ایک ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکالا۔ اس کی مٹھی میں نوٹوں کی گڈی تھی۔ اچانک اس کی انگلیاں کھل گئیں اور گڈی میز پر گر گئی۔ لیمپی نے بڑھ کر گڈی اٹھالی اور کرسی پر بیٹھ کر نوٹ گننے لگا۔

فرینک نے کارل سے یہی کہا تھا کہ لیمپی رقم لے کر گننے گا ضرور، اور جب وہ نوٹ گننے میں مشغول ہو جائے گا تو تمہیں اپنا کام انجام دینے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہو گی۔ لیمپی کی نظریں نوٹوں پر جمی ہوئی تھیں اور پوری یکسوئی سے وہ انہیں گننے میں مصروف تھا۔ کارل کا سیدھا ہاتھ رینگتا ہوا کوٹ کی جیب میں داخل ہوا۔ اعشاریہ ۴۵ کا ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ وہ ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ اچانک اسے سیفٹی کیچ کا خیال آیا۔ اس نے انگوٹھے سے اسے ہٹا دیا۔ سیفٹی کیچ ہٹنے کی کلک سن کر لیمپی نے چونک کر سر اٹھایا۔

کارل نے ہاتھ سیدھا کر کے فوراً ٹریگر دبا دیا۔ لیمپی ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ پہلے پیچھے کی طرف الٹا پھر میز پر گر گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے سر میز سے ٹکرایا اور نوٹ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

کارل نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد ٹریگر پر دوبارہ انگلی کا دباؤ ڈالا۔ وہ دوسری گولی چلانا چاہتا تھا کہ اچانک پشت پر ایک آواز سن کر بُری طرح اچھلا۔ اس نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ اس کا دوست ویٹر ہنری دوسرے دروازے میں کھڑا حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہنری کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی جو وہ اپنے باس لیمپی کے لیے لایا تھا۔ کارل ویٹر کو دیکھ کر اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ فرینک کی بتائی ہوئی تمام احتیاطی تدابیر ذہن سے نکل گئیں اور ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ کارل نے سر جھکا کر کسی خوفزدہ بھینسے کی طرح بغلی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور دوسرے ہی لمحے وہ سڑک پر دیوانہ وار اپنی دکان کی جانب بھاگ رہا تھا۔ لیمپی کے بغلی دروازے اور اس کی ــــــ دکان کے درمیان چند گزوں سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن جب کارل اپنی دکان میں داخل ہوا تو اس کا سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا اور آنکھیں اوپر کی جانب چڑھ گئی تھیں۔

اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ زبردست مصیبت میں گھر گیا ہے اور اسے صحیح مشورے کی شدید ضرورت ہے۔ ان حالات میں مناسب ترین مشورہ اسے فرینک ہی سے مل سکتا تھا۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے فرینک کا نمبر ملایا۔ اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی اور جب آٹھویں مرتبہ گھنٹی بجی تو اسے احساس ہوا کہ فرینک اپنے دفتر میں موجود نہیں ہے۔ وہ دکان میں کھڑے کھڑے فرینک کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ سڑک کے دوسری جانب ویٹر اس وقت پولیس کو بلانے میں مصروف ہو گا۔ اس کے پاس فرار ہونے کے لیے

زیادہ سے زیادہ چند منٹ ہی تھے۔ اس نے دکان کی روشنیاں بند کر کے احتیاط سے باہر دیکھا۔ سڑک پر ٹریفک کے سوا اور کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ بہرحال اسے ہر صورت میں وہاں سے جلد از جلد فرار ہونا تھا۔ اس نے جی کڑا کر کے ایک جست لگائی اور دکان سے باہر نکل آیا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس نے اپنے گھر کا پتہ ڈرائیور کو بتایا اور ٹیکسی کی سیٹ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو اس نے ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ آخر اس نے عمارت کے چوکیدار سے ایک ڈالر ادھار لے کر ٹیکسی والے کو دیا اور پھر اوپر چلا گیا۔

اپنے فلیٹ میں آنے کے بعد اس نے ایک خفیہ دراز میں سے تین سو ڈالر نکالے جو اس نے ایسے ہی کسی موقع کے لیے اٹھا رکھے تھے۔ پھر وہ جلدی سے ایک سوٹ کیس میں ضروری چیزیں اور کپڑے وغیرہ بھرنے لگا پھر وہ بستر پر بیٹھ گیا اور اس نے ٹیلیفون گود میں رکھ کر فرینک کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب سے فرینک نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

"مسٹر فرینک۔ میں کارل۔ کارل بول رہا ہوں۔"

"اب کیا بات ہے مسٹر کارل؟" فرینک کی سرد آواز سنائی دی۔

"میں نے کام کر دیا مسٹر فرینک۔ سب کچھ پلان کے مطابق ہوا پھر بھی ایک گڑبڑ ہو گئی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو دوست؟"

"میں... میں مسٹر فرینک! میں بھاگنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہنری نے دیکھ لیا ہے' وہ ویٹر ہے اب وہ میری تلاش میں ہوں گے مسٹر فرینک! میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔"

"رقم۔ کیسی رقم؟"

"مسٹر فرینک یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔ پلیز، مجھے اپنے معاہدے کے مطابق تین ہزار ڈالر دے دیجیے۔ یقین کیجیے اس معاہدے کا کسی کو علم نہیں ہو سکے گا میں قسم کھاتا ہوں مسٹر فرینک میرے پانچ ہزار ڈالر بھی لیمپی کی میز پر رہ گئے مسٹر فرینک میں تباہ ہو گیا۔ وہ میری کل پونجی تھی۔" کارل کی آنکھیں بھر آئیں۔

"مسٹر کارل کیا تمھیں یقین ہے کہ لیمپی ہلاک ہو چکا ہے؟"

"کیسے؟"

"ہاں میرے دوست یقین کرو تمھارا نشانہ خطا ہو گیا۔ گولی لیمپی سے دو فٹ کے فاصلے سے نکل گئی۔ میں غلط نشانہ بازی کیلیے پیسے نہیں دیتا۔"

"لیکن ــــ کس طرح؟ آخر میرا نشانہ کس طرح خطا ہو سکتا تھا، مسٹر فرینک؟ اتنے نزدیک سے۔"

"تم احمق ہو کارل۔ اگر تمھیں میری اطلاع پر یقین نہیں ہے تو لیمپی کے ریستوران میں فون کر کے معلوم کر لو۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا میرے دوست تو ایک لمحے کے لیے بھی اس شہر میں نہ رکتا ــــــ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ اس وقت لیمپی دیوانے کتے کی طرح تمھاری بو سونگھتا پھر رہا ہے جب اس پر ایسا موڈ طاری ہوتا ہے تو اس کا مطلب صرف اور صرف اذیت ناک موت ہوتا ہے' خدا حافظ میرے احمق دوست۔"

کارل کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے ٹیلیفون کو گھور رہا تھا۔ لیمپی پاگل کتے کی طرح تمھاری بو سونگھتا پھر رہا ہے۔ یہ جملہ بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ چند لمحے وہ بت کی طرح اپنے بستر پر ساکت بیٹھا رہا۔ پھر سوٹ کیس اٹھا کر وہ تیر کی طرح فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ عمارت کے چوکیدار کو اس کا وہ ڈالر کبھی واپس نہیں مل سکا جو اس نے کارل کو دیا تھا۔

لیمپی اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر اس نے نوٹوں کی گڈی دراز کھول کر اندر ڈالی اور ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو' پیارے مقتول۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" دوسری جانب سے فرینک نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے؟" لیمپی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "اس احمق کے خالی کارتوس نے میرے کوٹ کا ستیاناس کر دیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

"ڈھائی ہزار ڈالر کے بدلے کوٹ پر بارود کا نشان مہنگا سودا نہیں ہے۔ فکر نہ کرو۔ کوٹ کی دھلائی پر زیادہ خرچ نہیں آئے گا۔ ہاں' ہنری کو ۵۰ ڈالر دے دینا۔ اس ڈرامے میں اس کا کردار بہت اہم تھا اور اس نے بڑی عمدگی سے اپنا کام انجام دیا۔ میں کل کسی وقت آکر اپنے حصے کے ڈھائی ہزار ڈالر لے لوں گا۔"

"ضرور۔" لیمپی نے جواب دیا۔ "میں تمھارا انتظار کروں گا لیکن یار میں وسکی میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ تم جانتے ہو میرے پیٹ میں آج کل بڑی گڑبڑ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی استرے سے آنتیں کاٹ رہا ہو..."

"اوہ!" فرینک کی افسوس میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ پھر وہ خاموش ہو کر ہمدردی سے لیمپی کے مرض کی تفصیلات سننے لگا۔



رابرٹ کالبائی

وسیلہ خاتون

**ڈگلس** کو یہ نیا عجیب و غریب مکان خریدے ہوئے تین سال ہو گئے تھے، آج مکان کی تیسری سالگرہ تھی، ڈگلس سات بجے شام گھر پہنچا۔ یہ علاقہ صرف بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں پر مشتمل تھا۔ بیشتر مکانات بقعۂ نور بنے ہوئے تھے اور چند میں روشنی کم تھی مگر تھی ضرور، لیکن ڈگلس کی کوٹھی مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈگلس ایک کنوارا آدمی تھا، تنہا تھا اور اس نے اتنی بڑی کوٹھی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازم بھی نہیں رکھا تھا، اور تین سال کے عرصے میں اس نے کبھی یہاں کوئی تقریب بھی منعقد نہیں کی تھی، وہ اپنے واقف کاروں کو کبھی اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دیتا تھا اور اگر

نئے عہد کے
ایک تاج محل اور نئے عہد
کی ایک ممتاز محل
کی کہانی۔

کبھی کوئی بن بُلایا مہمان آ بھی جاتا تو وہ مہذب انداز میں ہر ممکن طریقے سے اس کے اس اقدام کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ ڈگلس کی عمر اکتالیس سال تھی، اس کی صحت بہت عمدہ تھی، وہ ایک بہت بڑی تعمیراتی کمپنی کا مالک تھا، کامیابی اور دولت اُس کے قدموں میں لوٹتی تھی، اِس لیے اُسے اپنے معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل تھا اور لوگ عموماً اس کے مردم بیزار رویّے اور ہر وقت لیے دیے رہنے پر اسے معاف کر دیتے تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی کوئی دماغی رگ ڈھیلی ہے اسی لیے وہ ایسی عالی شان کوٹھی میں بالکل تنہا رہتا ہے۔

ڈگلس مطمئن انداز میں سیٹی بجاتا ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی کار کوٹھی کے قریب پہنچی، اُس نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور کوٹھی کا دروازہ ریڈیائی مواصلاتی نظام کے باعث خود بخود کھُل گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے وہی بٹن دوبارہ دبایا اور دروازہ بند ہو گیا وہ اپنی گاڑی گھماتا ہوا گیراج کے پاس لے گیا۔ یہاں اُس نے ایک بار پھر وہی بٹن دبایا۔ گیراج کا دروازہ مگرمچھ کے منہ کی طرح اپنے آپ کھُل گیا، اور گاڑی گیراج میں غائب ہو گئی۔ پھر گیراج کا آہنی دروازہ خود ہی بند بھی ہو گیا۔ ڈگلس گیراج کے اندر سے مکان میں داخل ہوا۔ اُس نے ایک بڑے ریفریجریٹر سے شیمپین کی یخ بستہ بوتل نکالی، دو تین کمروں کی روشنیاں جلائیں اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا شیمپین کی بوتل ہاتھ میں دبائے اُوپری منزل کی طرف چل دیا۔ سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد وہ ایک بڑے ہال میں داخل ہوا اور بجلی روشن کی پھر وہ دو کمرے عبور کرتا ہوا ایک دیوار کے پاس رُک گیا۔ دیوار پر پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی جھیل کی ایک خوبصورت تصویر بنی ہوئی تھی۔ ڈگلس نے دیوار کے پاس رُک کر اپنی بجلی سے چلنے والی رسٹ واچ ٹٹولی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شیمپین کی بوتل بغل میں دبانی پڑی۔ گھڑی کے نچلے حصّے میں سونے کا ایک رنگ لگا ہوا تھا۔ اسے اس کام میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ گھڑی کلائی سے اُتارنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، وہ کبھی اپنی کلائی سے گھڑی اُتارتا ہی نہیں تھا۔ نہاتے وقت بھی نہیں کیونکہ اس کی رسٹ واچ واٹر پروف تھی بلکہ ہر چیز پروف تھی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے گھڑی کے نچلے حصّے میں سونے کا رنگ اُٹھایا اور انگلی سے ٹٹول کر ایک باریک سا اُبھرا ہوا نقطہ دبایا۔ جیسے ہی وہ باریک نقطہ دبا سامنے والی دیوار کا ایک حصّہ کوئی آواز کیے بغیر اُوپر کی جانب اُٹھتا چلا گیا۔ ڈگلس اس دروازے سے اندر داخل ہوا وہ ایک راہداری میں کھڑا تھا۔ راہداری خالی تھی اور اس میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے، وہ آگے بڑھا تو اُس کے کانوں میں ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز آئی اور وہ گردن موڑے بغیر سمجھ گیا کہ دیوار میں پیدا ہونے والا خلا دوبارہ بند ہو چکا ہے۔

ڈگلس کی ملکیت میں آنے سے پہلے مکان کا یہ خفیہ حصّہ جوئے اور عیاشی کے اڈّے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ شہر کے ممتاز دولت مندوں کا ایک خفیہ کلب تھا۔ اس خفیہ حصّے میں کئی کمرے تھے لیکن ان میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، کوئی روشندان نہیں تھا۔ تمام کمرے ساؤنڈ پروف تھے، ایک مدت قبل عیاشی کا یہ خفیہ اڈّا نامعلوم وجوہ کی بنا پر بند کر دیا گیا تھا۔ جس انجینیر نے اس مکان میں بجلی کی وائرنگ کی تھی وہ بعد میں ڈگلس کی کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا۔ دروازے کا ریڈیائی کنٹرول سسٹم بنانے میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔

ایک دن ڈگلس اس انجینیر کے ساتھ اتفاقاً اس مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا، مکان پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ انجینیر نے اس پر حیرت کا اظہار کیا اور برسبیلِ تذکرہ ڈگلس کو مکان کی حیرت انگیز خصوصیات بتانے لگا۔ ڈگلس نے سرسری انداز میں اُس سے مکان کے متعلق چند سوالات کیے اور پھر اچانک اُسے اس مکان سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مکان کے خفیہ دروازے اور خفیہ حصّے کا ذکر سن کر اُس کے ذہن میں ایک رنگین اور سنگین خیال پیدا ہوا اور اس خیال کی محرک اس کی حسین و جمیل محبوبہ مارگریٹ تھی۔ ڈگلس ایک عرصے سے مارگریٹ کی محبّت میں بُری طرح گرفتار تھا لیکن وہ اس پر ملتفت نہیں تھی۔

ڈگلس نے چار روز کے اندر اندر مکان خرید لیا۔ مکان کے ساتھ ہی اسے یہ گھڑی بھی مِلی تھی جس کے استعمال سے اس آہنی دیوار میں خلا پیدا ہوتا تھا۔

جنوری کی پہلی تاریخ تھی، راہداری عبور کر کے ڈگلس ایک نشان دار ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ خوبصورت مارگریٹ ایک آرام دہ صوفے پر لیٹی ہوئی رنگین ٹی وی دیکھ رہی تھی، اس کے سر کے نیچے نارنجی رنگ کا ایک ریشمی تکیہ رکھا ہوا تھا۔ ڈگلس نے آگے بڑھ کر شیمپین کی بوتل میز پر رکھی پھر جھک کر مارگریٹ کی پیشانی چوم لی۔ مارگریٹ نے نظریں گھما کر پہلے بوتل کی طرف دیکھا اور پھر ڈگلس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

"نیا سال مبارک ہو ڈارلنگ" ڈگلس نے کہا۔ "نئے سال کی خوشی میں آج ہم ایک چھوٹا سا جشن منائیں گے۔"

"نیا سال شروع ہو چکا ہے، یہ میں بھی جانتی ہوں" مارگریٹ کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے، اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن جشن کس سلسلے میں برپا ہوگا؟"

ڈگلس نے شانے اُچکائے اور آگے بڑھ کر ٹی وی کی آواز کم کر دی "اس طرح منفی انداز میں سوچنا صرف دکھوں میں اضافے کا باعث ہوتا ہے میری ملکہ تعجب ہے اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی تم ذہنی طور پر حالات سے سمجھوتا نہیں کر سکیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارے اس رویّے سے کیا فائدہ ممکن ہے؟" ڈگلس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

مارگریٹ بے چارگی سے اُٹھ بیٹھی، اس نے بے پروائی سے اسکرٹ جھٹک کر اپنی برہنہ ٹانگیں چھپانے کی ناکام کوشش کی، ڈگلس کی نظریں اُس کی بھری بھری پنڈلیوں پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی، مارگریٹ ایک کم عمر لڑکی تھی اس کی بڑی بڑی آنکھیں بیداری میں بھی خواب دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، اس کے بالوں کی رنگت اخروٹ کے چھلکے جیسی تھی، اس کے تیکھے نقوش اور متبسّم سے ہونٹ آدمی کو دیوانہ کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

"باہر موسم کیسا ہے ڈگلس؟" مارگریٹ نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"برف گرنی شروع ہو گئی ہے" ڈگلس نے الماری سے دو گلاس نکال کر شیمپین اُنڈیلی۔

"کیا برف بہت زیادہ گر رہی ہے؟"

"نہیں معمولی سی۔"

مارگریٹ نے گلاس اُٹھا کر منھ سے لگا لیا۔ اور چند چسکیاں لینے کے بعد بولی۔ "مجھے برف باری سے بہت محبت تھی۔ گھنٹوں برف کے سفید سفید موتیوں جیسے گالے گرتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بہت پُرانے زمانے کی بات ہے، اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ برف کا رنگ سفید ہوتا ہے یا گلابی، کیوں ڈگلس برف سفید رنگ کی ہوتی ہے نا؟ روئی کے گالوں کی طرح سفید اور ہلکی ہلکی؟"

"شروع کر دیں نا تم نے وہی باتیں؟" ڈگلس اکتا سا گیا، مجھے تمھاری یہ باتیں سخت ناپسند ہیں، کچھ دن ٹھہر جاؤ، جب برف کی تہیں جم جائیں گی تو میں تمھیں چہل قدمی کے لیے باہر لے چلوں گا، پھر خود دیکھ لینا برف کیسی ہوتی ہے۔"

"آہ وہی دس منٹ کی چہل قدمی، سال میں ایک مرتبہ آدھی رات کے بعد، اوہ ڈگلس میں کس منہ سے تمھارا شکریہ ادا کروں، واقعی تم بڑے فراخدل اور اعلا ظرف ہو"

ڈگلس خاموشی سے شیمپین پیتا رہا۔

"مجھے یقین ہے میرے محبوب کہ تم کبھی میرے سامنے اپنی زیادتی کا اعتراف نہیں کرو گے۔" ڈگلس کو خاموش دیکھ کر مارگریٹ نے کہا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم خود بھی کبھی کبھی دل پر جرم و گناہ کا بوجھ محسوس کرتے ہو گے، تمھارا ضمیر ملامت ضرور کرتا ہو گا کیونکہ میرا خیال ہے تم ایک حساس آدمی ضرور ہو لیکن.... لیکن شاید تمھارا ذہنی توازن صحیح نہیں ہے ورنہ احساسِ جرم تمھیں پاگل کر دیتا۔ غالباً خود میرا ذہن بھی اب معمول کے مطابق کام کرنے سے معذور ہو چکا ہے جبھی تو میں نے ان بدترین حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے، میں روزانہ یہ کمرے صاف کرتی ہوں جو میرا قید خانہ ہیں، تمھارے لیے کھانا پکاتی ہوں حالانکہ تم نے مجھے زبردستی قید میں ڈال رکھا ہے، میں برتن بھی دھوتی ہوں، ان مسلسل خدمات اور اطاعت گزاری کے ساتھ ساتھ تین سال سے میں تمھاری داشتہ بھی بنی ہوئی ہوں، میں نکاح کے بغیر تمھاری بیوی بن کر رہ گئی ہوں، تمھاری سفاکی کے باعث میں اپنے محبوب جارج کی بیوی نہیں بن سکی جس سے میری شادی ہونے والی تھی، آہ بے چارہ جارج۔ اُس نے مستقبل کے لیے کیسے کیسے شاندار منصوبے بناتے تھے، مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خمار آ جاتا تھا، اُسے کس بے چینی سے شادی کی تاریخ کا انتظار تھا۔ افسوس، اب اُسے کبھی یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ اُس کی ہونے والی دُلھن کا کیا ہوا اور وہ دُکھیاری کس حال میں ہے۔"

ڈگلس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں اس کا دل چاہا کہ وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے "مارگریٹ؟" ڈگلس نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا ہمارے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ ہم اس موضوع پر گفتگو نہیں کریں گے کیونکہ اس سے تلخیاں بڑھنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

مارگریٹ صوفے سے اُٹھ گئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈگلس کی نظریں برابر اُس پر لگی ہوئی تھیں۔

**لڑکیوں** کی پیدائش سے لوگوں میں بددلی اور آزردہ خاطری پیدا ہوگئی تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اپنے ذمّے یہ خدمت لی کہ جہاں لڑکیاں پیدا ہوتیں وہاں پہنچ جاتے اور لڑکیوں کی فضیلت میں وعظ فرمانے لگتے۔ اسی طرح ایک محفل میں تقریر فرما رہے تھے۔

" لوگو! جب ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جنّت کا ایک دروازہ کھُل جاتا ہے جب دوسری پیدا ہوتی ہے تو دُوسرا دروازہ کھُل جاتا ہے۔ جب تیسری پیدا ہوتی ہے تو تیسرا دروازہ...."

کسی شخص نے مولوی صاحب سے دریافت کیا "جناب والا! یہ تو ارشاد فرمائیں کہ جنّت میں کُل کتنے دروازے ہیں؟" مولوی صاحب نے جواب دیا "نو دروازے"۔ اس شخص نے کہا "لیکن میری تو بارہ لڑکیاں ہیں اُن کے لیے کیا فرمائیں گے آپ؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا "نو تک تو جنّت کے دروازے کھُلتے ہیں اس کے بعد دسْویں سے جہنّم کے دروازے کھُلنے لگتے ہیں۔"

مارگریٹ کے ہر قدم پر اُس کا دل زور سے دھڑکنے لگتا تھا، سروقامت مارگریٹ کی کمر بہت پتلی تھی، جب وہ چلتی تھی تو اس کا بدن موجیں مارتا تھا، جب وہ باتیں کرتی تھی تو اس کی زبان رس گھولتی تھی، اُس کے ہیجان انگیز جسمانی نشیب و فراز کی حرکت سے ڈگلس کے دل میں جذبات کی آندھیاں چلتی تھیں، وہ اسے فخر کے ساتھ دیکھتا جیسے وہ اُسی کا تخلیق کیا ہوا شاہکار ہو وہ اس کے سنہری پنجرے میں بند ایک ایسی مینا تھی جس کے پُر تیلنج ہونے کے بعد بھی دیدہ زیبی اور دلفریبی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور چمکدار پنڈلیوں کی جنبش سے ڈگلس کے جذبات برانگیختہ ہو رہے تھے، مارگریٹ ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی، اس کا چہرہ ڈگلس کی جانب تھا "اب تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے یہ مکان، یہ قید خانہ میری قبر ہو، میں کبھی اِن بے دریچہ دیواروں سے مفاہمت نہیں کر سکی، میں کسی طرح باہر کی دنیا کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکتی، البتہ گزشتہ سال کرسمس کے موقع پر ضرور تم مجھے آدھی رات کے بعد باہر چہل قدمی کی غرض سے لے گئے تھے وہ بھی صرف دس منٹ کے لیے، اس بات کو پورا ایک سال بیت گیا اس ایک سال میں میں یہ بھی بھول گئی کہ باہر کی دُنیا آخر کیسی ہے؟"

" مارگریٹ! میری زندگی، میری رُوح! دُنیا بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے وہاں فریب ہی فریب ہے۔ پریشانیوں اور مصیبتوں کے سوا باہر رکھا کیا ہے؟ یہاں تمھیں ہر آسائش میسّر ہے تم یہاں ہر طرح محفوظ ہو میں تمھارا محافظ اور تمھارا عاشق ہوں ایک عورت کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ تمھیں تو بے حد مطمئن اور خوش رہنا چاہیے۔"

"مطمئن اور خوش؟" مارگریٹ نے زہریلی ہنسی سے کہا "اُکتا دینے والی یکسانی کا ایک سال اور گزر گیا، تین سو پینسٹھ محروم اور مایوس دن اور بیت گئے، سارے دن ایک جیسے تھے، کوئی دن گزرے ہوئے دن سے ذرا بھی مختلف نہیں تھا۔"

ڈگلس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا "ٹہلنا اور بکواس کرنا بند کرو۔ مارگریٹ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

" میں تم سے ایک مرتبہ پھر یہ کہنا چاہتی ہوں ڈگلس" مارگریٹ نے تیز لہجے میں جواب دیا "کہ مجھے اس دلکش قبر سے رِہا کر دو؟"

ڈگلس نے کھڑے ہو کر اس کے رُخسار چھوتے اور مسکراتے ہوئے فیصلہ کُن انداز میں کہا "میرا جواب ایک بار پھر یہ ہے کہ ہرگز نہیں، اب تمھاری رِہائی نہ صرف میرے لیے تباہ کُن ہوگی بلکہ خود تم بھی برباد ہو جاؤگی، اچھا میں برابر والے کمرے میں ہوں، کھانا گرم ہو جائے تو آواز دے لینا۔"

نئے سال کی آمد کا منظر ان دونوں نے رنگین ٹی وی پر دیکھا، ٹی وی پر مختلف شہروں میں نئے سال کی تقریبات دکھائی جا رہی تھیں، لوگوں کے چہرے گلنار ہو رہے تھے، وہ خوشی سے چیخ رہے تھے چلّا رہے تھے، ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے، مارگریٹ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب اداکاری کر رہے ہوں، جیسے یہ سب کچھ فرضی اور تخیلی مناظر ہوں، رات کے بارہ بجے ڈگلس نے اس کے رخساروں پر بوسے لے کر اسے نئے سال کی مبارکباد دی، مارگریٹ نے مایوسی و بے دلی سے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اور جب ڈگلس نے یہ کہا کہ وہ سونے کے لیے خوابگاہ میں جا رہا ہے تو مارگریٹ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، اس نے ڈگلس کے اشارے اور بے تابیاں نظر انداز کر دیں اسے ٹی وی کے پروگراموں میں بڑا لطف آ رہا تھا اس نے سپاٹ لہجے میں ڈگلس سے کہا "تم جاؤ مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

ڈگلس کے خوابگاہ میں جاتے ہی مارگریٹ ٹی وی کی آواز دھیمی کر کے صوفے پر گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکا کر بیٹھ گئی، نفرت بھری نظروں

سے اُس نے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ یہ کیسی تنہائی تھی، شدت سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسکرین پر نمودار ہونے والے ہنستے مسکراتے چہرے نوچ نوچ کر لہولہان کر دے اور ٹی وی کو اتنی مرتبہ زمین پر پٹخے کہ اس کا ایک پرزہ بھی سلامت نہ رہے۔

رات کے دو بج رہے تھے اور وہ سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکی تھی لیکن وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی، اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ خوابیدہ ڈگلس کو قتل کر کے اس قید خانے سے فرار کیوں نہیں ہو جاتی؟ اس آرام دہ قید خانے میں وہ مسلسل تین سال سے قید تھی، اس کا بدن قید تھا اور اس کی روح قید تھی، صرف اس جرم میں کہ وہ بے حد حسین اور پُرکشش عورت ہے، اس کی جوانی اور شباب نے ڈگلس کو دیوانہ بنا رکھا تھا اور وہ قابلِ نفرت بوالہوس مرد جونک کی طرح اس سے اس وقت تک چمٹا رہنا چاہتا تھا جب تک اس کا بدن، حسن اور جوانی کے نشاط انگیز رس سے خشک نہیں ہو جاتا۔ وہ ڈگلس سے شدید نفرت کرتی تھی، اُس کے باوجود وہ اُسے خوابیدہ حالت میں سبزی کاٹنے والی چھری سے ہلاک کر کے وہاں سے فرار نہیں ہو سکتی تھی، آخر کیوں؟

ڈگلس نے اسے تنبیہ کر دی تھی کہ ”اگر تم نے کبھی مجھے ہلاک کر کے بھاگنے کی کوشش کی تو تم خود بھی اسی جگہ بھوک سے سسک سسک کر مر جاؤ گی اور زندگی بھر فرار نہیں ہو سکو گی کیونکہ خفیہ دروازہ کھولنے کا راز صرف اور صرف مجھے معلوم ہے۔“

جب ڈگلس صبح کے وقت خواب گاہ سے اپنے دفتر جاتا تھا، اُس وقت مارگریٹ کو راہداری میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مارگریٹ پُرپیچ، اپنی قید کے دوران میں بارہا چھپ چھپ کر دروازہ کھولنے کا راز معلوم کرنے کی کوشش کی، شروع شروع میں تو اسے اس کے متعلق کچھ ٹہلتے ٹہلتے نہ ہو سکا۔ ڈگلس دروازے کے قریب کھڑا ہو جاتا اور دروازہ خود محسوس ہوتے ہوئے اُٹھ جاتا اور پھر اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ پہلے کی طرح دوبارہ بند ہو جاتا تھا۔ پہلے مارگریٹ کا خیال تھا کہ ڈگلس ضرور اپنے پاؤں سے قالین کے نیچے کوئی پوشیدہ لیور یا بٹن وغیرہ دباتا ہوگا لیکن مہینوں کی ناکام تلاش ضرور تم مجھے آدھی راہ خیال بدلنا پڑا۔ وہ اس مدت میں متواتر اپنی محدود معلومات وہ بھی صرف دروازہ کھولنے کے مختلف طریقوں پر غور کرتی رہی تھی اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ دروازہ کسی ایسی چیز سے کھلتا ہے جو ڈگلس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ٹرانسمیٹر قسم کی چیز جسے ڈگلس اپنے ساتھ رکھتا ہے اور سوتے وقت بھی وہ چیز اس کے پاس ہی رہتی ہے، ڈگلس بہت کچی نیند سوتا تھا اس لیے مارگریٹ رات کو بھی وہ ٹرانسمیٹر تلاش نہیں کر سکتی تھی، البتہ اسے یہ یقین ضرور تھا کہ اگر وہ ہمت کر کے کسی طرح ڈگلس کو ہلاک کر دے تو ٹرانسمیٹر آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے، اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ناکام ہونے کی صورت میں اسے بھوک سے سسک سسک کر اسی مکان میں مرنا ہوگا اس کے نزدیک اس قید خانے میں عمر بھر محبوس رہنے سے مر جانا بہتر تھا، تین سال کش مکش کے گزر گئے تھے۔

وہ رات کو چار بجے کے قریب خواب گاہ میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں سبزی کاٹنے والا لمبے پھل کا چھرا تھا۔ وہ اندھیرے میں لباس تبدیل کرنے لگی۔ اسی اثنا میں ڈگلس نے کروٹ بدلی لیکن وہ جاگا نہیں، لباس تبدیل کر کے وہ بستر پر پہنچی اور ڈگلس کے برابر لیٹ گئی، کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑی رہی، ڈگلس لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد مارگریٹ نے چھرا ہاتھ میں تانا اور سوتے ہوئے ڈگلس پر جھک گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے لحاف ہٹا کر دوسرے ہاتھ سے چھرا اس کے سینے میں بھونک دے گی۔ لیکن کئی منٹ تک وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کا چاقو والا ہاتھ پتھر بن گیا ہو، شاید اس کا ضمیر ایک سوتے ہوئے بے بس شخص کو قتل کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا، نہ جانے کیسے اُسے ڈگلس جیسے سنگدل شخص پر رحم آ گیا۔ آخر مارگریٹ ایک لاش کی طرح بستر پر ڈھیر ہو گئی اور تاریکی میں چپکے چپکے رونے لگی، قریب لیٹا ہوا ڈگلس اس کی سسکیوں کی آواز سن کر مسکرانے لگا۔ اسے شاید اپنی احتیاط اور دور اندیشی پر فخر محسوس ہو رہا تھا کیونکہ مارگریٹ قوتِ برداشت کے جواب دینے اور اپنے شدید ارادے کے باوجود اسے ہلاک نہیں کر سکی تھی، ڈگلس نے خواب گاہ میں داخل ہونے کے بعد بجلی گُل کر دی تھی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن کان جاگ رہے تھے، اسے مارگریٹ کے انتہا پسند ہونے سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ آج اس کے جذبات آتش فشاں کی طرح کسی بھی لمحے پھٹ سکتے ہیں، تین سال کی رفاقت نے اُسے مارگریٹ کے بارے میں بہت کچھ سکھا دیا تھا، وہ پوری طرح اس کا مزاج داں ہو گیا تھا۔ اسی لیے اسے احساس تھا کہ اگر آج رات نہیں تو آئندہ جلد ہی کسی رات مارگریٹ اسے قتل کر کے فرار ہونے کا فیصلہ کر لے گی، اسے مارگریٹ کے اس یقین کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اُسے ہلاک کر کے اس قید خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکتی ہے

## مہاراجہ رنجیت سنگھ

کی ایک آنکھ نہیں تھی۔ دبدبہ بہت تھا۔ لوگ آنکھ ملا کر بات تک نہ کرسکتے تھے۔ دربار میں ایک طویل القامت میراثی بھی تھا۔ اُس کی حاضر جوابی بہت مشہور تھی۔ رنجیت سنگھ اس کی طویل القامتی کا اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک دن از راہِ مذاق میراثی سے کہا۔ "کیا تو اپنی طویل القامتی کا راز جانتا ہے ؟" درباری میراثی کو از راہِ تمسخر دیکھنے لگے۔

میراثی نے جواب دیا۔ "کچھ حضور ہی ارشاد فرمائیں، بندے کو کیا معلوم ؟"

رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔ "تو نے دنیا میں آنے میں انتہائی سستی اور تامل سے کام لیا تھا۔ اگر بروقت آجاتا تو اتنا طویل ہرگز نہ ہوتا"

میراثی نے مہاراجہ کی غائب آنکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برجستہ عرض کیا۔ "حضور! غلام عجلت کے انجام سے واقف ہو چکا تھا کہ جلدی میں ایک آنکھ ہی چھوڑ کر چلے آئے۔"

درباری سناٹے میں آگئے لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے میراثی کی حاضر جوابی کی دل کھول کر داد دی۔

جب مارگریٹ لباس تبدیل کر رہی تھی تو اس نے آنکھیں ذرا سی کھول کر اسے دیکھا تھا اور اسے اندھیرے میں کوئی شے چمکتی ہوئی نظر آئی تھی، وہ چوکنا ہو گیا تھا اور کسی بھی لمحے کروٹ بدل کر وار خالی دینے کے لیے تیار تھا۔

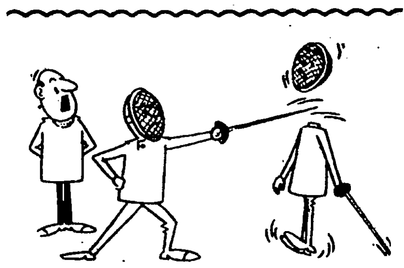
ڈگلس کو اپنے بارے میں یہ خوش فہمی تھی کہ وہ عورتوں کی فطرت کو خوب سمجھتا ہے، خاص طور پر مارگریٹ کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ مارگریٹ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے اس لیے وہ اپنے دفاع کے لیے مجبوراً تو کسی شخص کو قتل کر سکتی ہے یا پھر اس پر مسلسل اتنا ظلم کیا جائے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو دے اور قتل جیسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے۔ ان دو صورتوں کے سوا وہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتی، یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی مارگریٹ سے تیز لہجے میں بات نہیں کرتا تھا، وہ اس پر بے حد مہربان رہتا تھا اور اس سے اس حد تک محبت کا اظہار کرتا تھا جس حد تک وہ اسے اجازت دیتی تھی، آخر مارگریٹ ایک ایسے آدمی کو کس طرح ہلاک کر سکتی تھی جو اس سے اتنی محبت کرتا تھا اور جو اس کے ساتھ بے حد نرمی سے پیش آتا تھا۔

دوسری صبح جب ڈگلس خواب گاہ سے چلا گیا تو مارگریٹ نے سبزی کاٹنے والا چھرا دوبارہ باورچی خانے میں رکھ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی کوئی چار گھنٹے تک وہ ڈگلس کو قتل کیے بغیر نکل بھاگنے کے مختلف منصوبوں پر غور کرتی رہی، حالانکہ ڈگلس واقعی اس قابل تھا کہ قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ذہن میں ایسا کوئی منصوبہ نہیں آسکا جس کی کامیابی یقینی ہو۔

شام کو ڈگلس واپس آیا تو فکر مند نظر آرہا تھا، مارگریٹ خاموش رہی پھر اگلے دو روز تک اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا، وہ چاہتی تھی کہ ڈگلس اس کی مستقل خاموشی سے تنگ آکر اس پر گرم ہو جائے اسے مارے پیٹے، تاکہ مارگریٹ کے لیے اسے قتل کرنے کا جواز پیدا ہو جائے لیکن ڈگلس نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ اس نے مارگریٹ کی مکمل خاموشی کا جواب خود بھی مکمل خاموش رہ کر دیا۔ وہ ٹی وی دیکھنے یا کتاب پڑھنے میں مصروف رہا یا پھر بے حد مطمئن انداز میں کچھ سوچتا رہا۔ اس سناٹے نے مارگریٹ کو پاگل کر دیا، جو کھیل اس نے خود شروع کیا تھا۔ اس میں ڈگلس نے اسی کو شکست دے دی تھی۔

پانچویں روز ڈگلس نے صبح دفتر جاتے وقت حسب معمول مارگریٹ کے رخسار تھپتھپائے اور ایک لفظ کہے بغیر دفتر چلا گیا، مارگریٹ پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، وہ بہت دیر تک سسکیاں لے کر روتی رہی، جب مطلع صاف ہوا تو مارگریٹ کو اپنے اس کھیل کی حماقت کا شدت سے احساس ہوا۔ پھر اچانک اس پر شدید غصے کا دورہ پڑ گیا۔ جو چیز بھی سامنے آئی اس نے توڑ پھوڑ کر رکھ دی، لیمپ، تصویریں، بوتلیں، سنگھار میز، کپڑوں کا نمبر آیا بے حد خوبصورت اور قیمتی لباس اب اس کی نظروں میں بے معنی تھے بہترین گاؤن، اس نے وہ ملبوسات پھاڑ دیے، ان نفیس ملبوسات کی کیا ضرورت جو کسی کو دکھائے نہ جاسکیں ؟ اس قید خانے میں کوئی برہنہ ہو یا لباس سب برابر ہے، اس توڑ پھوڑ سے باہر کی دنیا کا عکاس ٹیلیو... نہیں رہا۔

پھر وہ کمرے کے درمیان کھڑی ہو کر طائرانہ نظروں سے اُن صحیح و سالم چیزوں کا جائزہ لینے لگی جنھیں وہ تباہ نہیں کرسکتی تھی، اس کے



ریفری: "ذرا آہستہ جناب۔"

ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس مکان کو آگ لگا دے اور خود بھی جل کر بھسم ہو جائے؟ لیکن اس نے یہ خیال ذہن سے فوراً نکال دیا کیوں کہ اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش بے حد شدید تھی، جب غصے اور غضب کا طوفان گزر گیا تو اس کی خوبصورت غزالی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری ہو گئے اور جب آنسو بھی خشک ہو گئے تو وہ کچھ دیر خالی الذہن سی بیٹھی رہی، پھر کچھ سوچتی رہی، غصے میں کھولتی رہی، پھر اچانک وہ اٹھی، اس مرتبہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پیتل کا بنا ہوا قدِ آدم لیمپ باہر نکلنے والے دروازے پر اتنے زور سے مارے کہ دونوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور ٹوٹ جائے، جنون کے عالم میں اس نے بھاری بھرکم لیمپ اٹھا لیا اور دوڑتی ہوئی راہداری کی طرف گئی جیسے ہی اس کی نظریں خفیہ دروازے پر پڑیں، وہ بت کی طرح جم کر رہ گئی، لیمپ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔

پُرپیچ، دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا، تقریباً ایک فٹ اُوپر اُٹھا پنڈلیرہ گیا تھا۔ مارگریٹ نے کئی مرتبہ آنکھیں مل کر دروازہ دیکھا، بے شک ٹہلتے ٹہلتے وہ مکمل طور پر بند نہیں ہو سکا تھا۔ صبح ڈگلس غالباً عجلت میں تھا محسوس ہوتے ہیے اس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ دروازہ ٹھیک سے بند ہوا ہے و۔ یا نہیں، تین سال کے بعد کہیں اس سے یہ چھوٹی سی غلطی سرزد ہوئی تھی۔

مارگریٹ کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہی پھر سب کچھ بھول بھال ضرور تم مجھے آدھی رات طرف دوڑی، اس کی رگوں میں بجلیاں گردش کر رہی تھیں وہ بھی صرف دار نے بل لیٹ کر دروازے کے نیچے سے باہر کی طرف کھسکنے لگی۔ جگہ تنگ تھی، گھبراہٹ اور عجلت کی بنا پر اسے باہر نکلنے میں دس منٹ لگ گئے۔ آخر خواب کی سی حالت میں اس نے دیکھا کہ وہ کوٹھی سے باہر کھڑی ہے، وہ ایک وحشی ہرنی کے مانند سرپٹ دوڑنے لگی، تھوڑی دور بعد اسے ایک ٹیلیفون بوتھ نظر آیا۔ اس نے جھٹ اندر داخل ہو کر بوتھ کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پہلے پولیس کو فون کرے یا جارج کو؟ جارج جس کے ساتھ آج سے تین سال سترہ دن قبل اس کی شادی ہونے والی تھی، ذہن کے پردے میں پر تین سال پہلے کے واقعات کسی فلم کی طرح ایک ایک کر کے گزرنے لگے۔

ڈگلس اور جارج دونوں اس سے شادی کے خواہش مند تھے، اس کا اپنا فیصلہ جارج کے حق میں تھا۔ ڈگلس نے ایک شریف آدمی کی طرح اس کا فیصلہ تسلیم کر لیا، مگر اس کے بعد بھی اس سے ملتا رہا۔ صرف ایک دوست کی حیثیت سے، جارج سے اس کی شادی ہونے والی تھی، شادی سے تین روز قبل جب وہ دفتر سے گھر لوٹی تو اس نے ڈگلس کو اپنا منتظر پایا۔ ڈگلس نے کہا کہ وہ آج اس کی دعوت کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی اور شادی کے بعد اس کا ارادہ مکمل طور پر مارگریٹ کی زندگی سے نکل جانے کا ہے، مارگریٹ انکار کرنا چاہتی تھی لیکن جب اس نے ڈگلس کو حد سے زیادہ جذباتی دیکھا تو دعوت قبول کر لی۔

ڈگلس، اسے ایک ایسے ہوٹل میں لے گیا جو اس کے لیے نیا تھا، وہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھی کہ یہ ہوٹل ڈگلس کے نئے مکان سے بہت کم فاصلے پر واقع ہے اور یہ کہ تھوڑی دیر بعد وہ تین سال کے لیے ایک خوبصورت قید خانے میں "ہوس اور محبت کے نئے تاج محل میں" بند کر دی جائے گی۔

کھانے کے بعد ڈگلس نے اپنے لیے وہسکی اور اس کے لیے شیری کا آرڈر دیا۔ وہسکی کے دو گلاس پینے کے بعد ڈگلس کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا اس کی زبان بہکنے لگی، وہ اس سے بار بار یہ کہتا تھا کہ "آخر تم نے مجھ پر جارج کو کیوں فوقیت دی؟ مگر اس نے وعدہ کیا کہ میں اس کے باوجود مرتے دم تک تم سے یک طرفہ محبت کرتا رہوں گا" خاموش پرستش۔

ڈگلس نے گفتگو کے دوران یہ اعتراف بھی کیا کہ اس کا خوش قسمت رقیب اس سے نہ صرف عمر میں آٹھ سال چھوٹا ہے بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی وہ اس سے زیادہ مضبوط اور خوبصورت ہے، اس کے باوجود نہ جانے کیوں اسے یقین ہے، مارگریٹ کو یاد تھا کہ اس جملے کے دوران وہ بے حد معصومانہ انداز میں مسکرایا تھا، اس نے پیشگوئی کی تھی یا بد دعا دی تھی کہ

وہ جارج کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی کیونکہ جارج انسان نہیں ہے بلکہ ایک عمدہ مشین کی طرح مضبوط پائدار اور بے عیب شخص ہے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے اس لیے وہ کسی ایسے انسان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی نہیں گزار سکتا جس میں کوئی عیب نہ ہو یہی وجہ ہے کہ جارج اتنا بڑا ہونے کے باوجود اب تک اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک مشین ہی کی طرح اس میں خود اعتمادی کا فقدان ہے اس کی ماں اسے روز صبح اسٹارٹ کرتی ہے اور وہ دن بھر ایک خود کار مشین کی طرح چلتا رہتا ہے۔

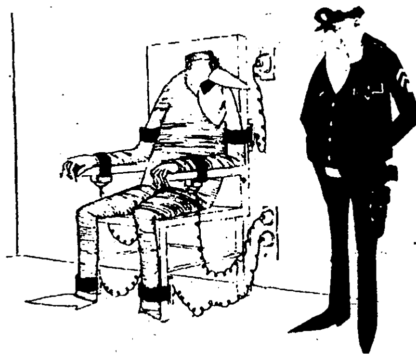
جب یہ باتیں سنتے سنتے مارگریٹ کا غصہ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو ڈگلس نے جلدی سے اس سے معذرت کرلی اور ہنس کر کہا کہ وہ صرف اسے چڑا رہا تھا۔ مارگریٹ کو اس کی دلی حالت کا احساس تھا اسے معلوم تھا کہ بہت کم مرد اپنی شکست فراخدلی سے قبول کرتے ہیں اس نے ڈگلس کو معاف کر دیا کیونکہ اسے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے نظر آرہے تھے اب وہ یہ اصرار کر رہا تھا کہ مارگریٹ کم از کم شادی کی تاریخ ہی بڑھا دے اور اس کے بارے میں اپنے فیصلے پر ایک مرتبہ نظرِ ثانی کرے۔

مارگریٹ نے اس کی یہ درخواست فوراً رد کر دی اس پر اس نے جرأت مندی سے کہا کہ "مجھے تم سے یہی امید تھی اسی لیے میں آج تمھیں شادی کا تحفہ پیش کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں مگر چونکہ وہ تحفہ اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ میں تمھیں کاغذ وغیرہ میں لپیٹ کر پیش کر سکوں اس لیے کیا تم میرے ساتھ چل کر اسے دیکھنا پسند کرو گی؟"

مارگریٹ کا جواب ایک غیر یقینی مسکراہٹ تھی' ڈگلس نے کہا۔ "مجھے گھر جلد پہنچنا ہے۔ وقت کم ہے اس لیے براہِ کرم جلدی میرے ساتھ چلو" تب مارگریٹ کو معلوم ہوا کہ اس کا مکان ہوٹل سے چند منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔

وہ ڈگلس کی عالی شان کوٹھی دیکھ کر حیران رہ گئی' ڈگلس نے یاس زدہ لہجے میں کہا "میں نے یہ مکان تمھارے لیے خریدا تھا تاکہ ہم شادی کے بعد اس نئے مکان میں اپنی بہترین زندگی کا آغاز کر سکیں لیکن چونکہ تم جارج سے شادی کر رہی ہو اس لیے میں یہ مکان تمھیں تحفے میں پیش کرنا چاہتا ہوں"۔

مارگریٹ نے فوراً یہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا جب ڈگلس نے اسے اندر سے پورا مکان دکھانے کی پیش کش کی تو اس کی تجسس پسند



"اگر آج بھی بجلی غائب رہی تو کیا ہو گا؟"

طبیعت اس کے گریزاں دل پر حاوی ہو گئی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مکان کے اندر داخل ہو گئی اور ڈگلس اسے ایک ایک کمرہ دکھلانے لگا جب وہ اوپری منزل پر پہنچے اور اچانک ایک دیوار میں دروازہ نمودار ہوا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ اسے اس خفیہ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے ایک ثانیے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اب تین سال اور ستر دن سے پہلے اس دروازے سے باہر نہیں نکل سکے گی۔

مارگریٹ کو قید ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ ایک روز ڈگلس نے شام کو دفتر سے واپس آکر اسے بتایا کہ "آج پولیس میرے دفتر آئی تھی' وہ لوگ تمھیں ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں میں نے پولیس والوں سے کہا کہ تمھیں ہفتوں سے نہیں دیکھا اور نہ ہی تم سے فون پر گفتگو ہوئی ۔۔۔ والے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد وہ سادہ لباس والے آئے انھوں نے بھی مجھ سے تمھارے بارے میں بے شمار سوالات ۔۔۔ وہ بھی واپس چلے گئے۔ کسی کو بھی مجھ پر تمھارے اغوا کا شبہ نہیں ہے اس ۔۔۔ میں نے خاصی احتیاط برتی تھی۔

مارگریٹ کا اس بھری دنیا میں ایک لوڑ ۔۔۔ اس کے لیے ملازمت بھی اس کے باپ ہی نے ۔۔۔ میں مال خریدنے پر ملازم تھا جارج بھی اسی کمپنی میں ۔۔۔ بہت اہم اور بہت بڑا تھا۔ مارگریٹ کی ملازمت کا آغاز بھی ۔۔۔ ہوا اور اسے جارج کی پرائیویٹ سیکرٹری کی جگہ دے دی گئی' پھر مارگریٹ

بہت جلد جارج کی محبت میں گرفتار ہوگئی لیکن وہ اس کی سیکرٹری تھی اس لیے یہ سمجھتی تھی کہ شاید جارج نے کبھی اُس کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے لیکن جب ایک روز اس نے جارج کو یہ بتایا کہ وہ ڈگلس کے ساتھ شادی کے بارے میں غور کر رہی ہے تو غیر متوقع طور پر اچانک جارج کے خوابیدہ جذبات اُبھر کر سامنے آ گئے اور پھر حالات نے مارگریٹ کے حق میں تیزی سے پلٹا کھایا مارگریٹ بہت خوش تھی اور تین روز بعد اس کا خواب حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا کہ اچانک ڈگلس نے اسے دبوچ کر ایک سنہرے پنجرے میں بند کر دیا۔

مارگریٹ نے اپنے خیالوں سے چونک کر ایک گہری سانس لی اور ٹیلیفون ڈائرکٹری میں جارج کا نمبر تلاش کرنے لگی اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ جارج کے گھر کا فون نمبر اور پتہ تبدیل ہوگیا ہے' مارگریٹ کچھ پریشان سی ہوگئی' مارگریٹ نے سوچا گویا تین سال کے عرصے میں کچھ بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جن کے بارے میں اسے کوئی صحیح علم نہیں ہے' بہرحال اس وقت جارج اپنے دفتر میں ہوگا وہ اس سے دفتر میں ملاقات کر سکتی ہے وہ ٹیلیفون بوتھ سے باہر نکل آئی۔

اس کے پاس ایک دمڑی بھی نہیں تھی' پیسوں کے بغیر وہ اس ـــ شہر میں چند قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی وہ پریشان تھی کہ جارج تک پہنچنے کے لیے پیسے کہاں سے حاصل کرے پھر اسے یاد آیا کہ تین سال قبل اُس کے گھر میں میز کی دراز میں چند ڈالر موجود تھے' اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں بھی کئی سو ڈالر موجود ہیں' وہ سڑک پر چلتی رہی پھر اس نے ایک خالی ٹیکسی اشارے سے روکی اور اسے بینک کا پتہ بتا کر بیٹھ گئی' بینک پہنچ کر اس نے ڈرائیور سے انتظار کرنے کے لیے کہا اور سیدھی اسسٹنٹ منیجر کے کمرے میں گئی اس نے منیجر کو [illegible] کی چیک بک کھو گئی ہے اور اُسے اس وقت پیسوں کی شدید ضرورت [illegible] نے ایک سادہ چیک پر دستخط کر کے بینک سے سو ڈالر نکلوا لیے اور [illegible] بیٹھ گئی۔

[illegible] چاہتی تو سیدھی اپنے گھر جا سکتی تھی اور اپنے بوڑھے باپ سے اُسے [illegible] اطلاعات مل سکتی تھیں لیکن وہ جارج سے جلد از جلد ملنا اور سب [illegible] کے منہ سے سننا چاہتی تھی

ضرور تم مجھے [illegible] وہ بھی صرف [illegible] طویل ہوتا ہے تین سال میں سب کچھ بدل سکتا [illegible] ہو رہی تھی کہ ممکن ہے اس کے محبوب جارج [illegible] جگہ تنگ تھی [illegible] کسی اور لڑکی سے شادی کر لی ہو لیکن اگر اُس نے اب تک شادی نہ کی ہو تو اس صورت میں اس کا ردِعمل میرے اچانک پہنچنے پر کیا

ہوگا؟ اور اس کی بپتا سن کر وہ اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے گا؟ جارج پہلے ہی ڈگلس کو پسند نہیں کرتا تھا اور اب جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ ڈگلس کے ساتھ تین سال گزار کر آ رہی ہے تو وہ کیا سوچے گا کیا وہ اسے قبول کر لے گا؟

چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوراً ہی جارج کو سب کچھ نہیں بتائے گی بلکہ پہلے اسے کریدے گی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ جارج اب اُس سے کتنی محبت کرتا ہے؟ کرتا بھی ہے یا نہیں؟ کیا وہ بدل تو نہیں گیا۔

جب وہ جارج کے دفتر میں داخل ہوئی تو استقبالیے پر بیٹھی ہوئی جارج کی نئی سیکرٹری نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا' تین سال قبل وہ اسی جگہ بیٹھتی تھی' اور اسی طرح جارج سے ملاقات کرنے والوں کا استقبال کرتی تھی

"کیا مسٹر جارج اپنے کمرے میں موجود ہیں؟" مارگریٹ نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"کیا آپ نے ملاقات کے لیے وقت لیا ہے؟"

"نہیں۔ بس اُن سے یہ کہہ دیجیے کہ مارگریٹ اُن سے ملنا چاہتی ہے وہ فوراً مجھ سے ملاقات پر تیار ہو جائیں گے۔" مارگریٹ نے اعتماد سے کہا۔

"مارگریٹ" جارج کی نئی سیکرٹری نے ناقابل یقین لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں مارگریٹ' آپ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں؟"

جارج کی نئی سیکرٹری نے اپنی بدلتی ہوئی حالت پر قابو پا لیا۔

"آپ یہاں ٹھہریں' میں دیکھتی ہوں کہ مسٹر جارج مصروف تو نہیں ہیں" سیکرٹری جارج کے مخصوص کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے میں گئی اور داخل ہوتے ہی اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور مارگریٹ کو اپنے محبوب جارج کا حیرت زدہ چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

"میرے خدا' چند لمحوں بعد جارج نے کہا "یہ تم ہو مارگریٹ؟"

"ہاں میں ہی ہوں' خود مجھے بھی چند لمحوں پہلے یقین نہیں تھا جارج کہ یہ واقعی میں ہوں" مارگریٹ نے بدحواسی میں مسکرانے کی کوشش کی وہ جارج کی طرف بڑھی' اس کے ذہن کے کسی گوشے سے یہ خواہش سر اُبھار رہی تھی کہ جارج بھاگ کر اس سے لپٹ جائے اور اس کے لب رخسار پر محبت کی بارش کر دے' لیکن جب وہ جارج کے قریب پہنچی تو وہ دروازے سے پیچھے ہٹ گیا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ غور سے جارج کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھی' لیکن اُس کے ردِعمل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی' مارگریٹ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ جارج ہونٹ سکیڑتا ہوا

اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے ناقدانہ انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا۔" مارگریٹ تم آخر اتنے عرصے ...... ؟" جارج الزام لگانے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔" تین سال اس دوران تم نے کسی کو خط بھی نہیں لکھا۔ تم کہاں غائب ہوگئی تھیں ؟"

" کیا تم تین سال سے میرا اس لیے انتظار کررہے تھے جارج کہ مجھے زندہ دیکھ کر طعنوں کا ہدف بناؤ۔" مارگریٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔" کیا تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ اور نہیں ؟"

" تین سال تک میری نظروں سے اوجھل رہنے کے بعد اور تمہیں کیا اُمید تھی مارگریٹ ؟ تین سال کوئی کم مدت تو نہیں ہوتی۔ تم خود مجھے چھوڑ کر گئی تھیں، میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ نہ معلوم کتنے دنوں تک تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ تم ... تم مجھے چھوڑ کر جا چکی ہو پھر رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اب جب کہ زخم بھر چکے ہیں، تو تم دوبارہ انھیں ہرا کرنے آ پہنچیں تاکہ پھر ان سے خون رسنے لگے ؟"

مارگریٹ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔" یہ درست ہے کہ مجھے اپنے استقبال کے لیے پھولوں کے ہار کی اُمید نہیں تھی لیکن اتنی امید ضرور تھی کہ میں ایک انسان سے ملنے جا رہی ہوں جو انسانوں ہی کی طرح گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہے گا۔ وہ جو میرا محبوب ہے، جارج تمہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ممکن ہے میں مصیبت میں مبتلا ہوگئی ہوں ؟"

" کیوں نہیں، میں نے نیویارک کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پولیس کا پورا محکمہ تمہاری تلاش میں سڑکوں پر نکل گیا تھا لیکن تم نے اپنے پیچھے ان کے لیے ایک سراغ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ خیر خیر" جارج نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔" تم اس وقت بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی ہو۔ صرف تمہارا رنگ کچھ زرد پڑ گیا ہے۔ اگر تم واقعی کسی مصیبت میں مبتلا تھیں تو تم نے مدد طلب کیوں نہیں کی ؟"

" میں ایسا کرنے سے قاصر تھی "۔

" ہو سکتا ہے" جارج نے سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔" ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے شروع سے پوری بات بتاؤ "۔

" سر دست میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں جارج " مارگریٹ نے کہا" خاص طور پر اس وقت تمہارا رویہ دیکھتے ہوئے ایسا کرنا میرے لیے بیکار ہے لیکن میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی تھی، اور واپس آنے سے قطعاً معذور تھی، آج سے پہلے میرے

**چمار** کے سامنے سے جب منطقی عالم گزرتا تو اُسے بڑی تکلیف ہوتی۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ عالم جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بالکل نہیں کرتا۔ اُس نے طے کیا کہ عالم کی اسی ایک کمزوری کا سہارا لے کر وہ کسی دن شرمندہ ضرور کرے گا۔

ایک دن منطقی عالم اپنی جُوتی میں چند ٹانکے لگوانے کے لیے چمار کی دُکان پر کھڑا ہوا تو چمار کو موقع ہاتھ آ گیا۔ اُس نے جُوتی میں ٹانکے لگاتے ہوئے دریافت کیا۔" کیوں جناب عالم صاحب! کیا آپ جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہیں یا کہتے ہیں اُن پر عمل بھی فرماتے ہیں ؟"

منطقی عالم نے صاف گوئی سے کام لیا۔" نہیں، میں بیشتر پر عمل نہیں کرتا "۔

چمار نے شرمندہ کرنا چاہا، بولا۔" واہ جناب، تب تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے !"

منطقی عالم نے پوچھا۔" کیوں آخر اس میں افسوس کی کیا بات ہے ؟"

چمار نے جیسے ہی نظریں اُٹھا کر عالم کو دیکھا، اُس نے کہا۔" ذرا ایک بات تو بتاؤ۔"

چمار نے کہا۔" پوچھیے "۔

منطقی عالم نے پوچھا۔" کیا تم وہ تمام جوتیاں جن کی تم مرمت کرتے ہو، خود بھی پہنتے ہو ؟"

چمار نے جواب دیا۔" نہیں تو ؟"

منطقی نے جواب دیا۔" جب تمہارے لیے اتنا آسان کام ممکن نہیں ہے تو اس مشکل کام کو میں کس طرح انجام دے سکتا ہوں "۔

لیے واپس آنا بالکل ناممکن تھا۔

" مجھے تم پر یقین ہے مارگریٹ اور یقین کرو میں تمہاری واپسی پر خوش بھی ہوا ہوں "۔ جارج نے سپاٹ لہجے میں کہا۔" ٹھیک ہے جب تم مناسب سمجھو مجھے اپنی کہانی ضرور سُنانا "۔

مارگریٹ نے جھجکتے ہوئے وہ سوال کر ہی دیا جسے معلوم کرنے کے لیے وہ بے تاب تھی۔" جارج تم نے ... تم نے شادی کر ...؟"

" نہیں "۔ جارج نے پائپ سلگاتے ہوئے ... میں انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، تم نے میری نئی ... وہ جلد ہی میری بیوی بننے والی ہے "۔

" تمہاری سیکرٹری ؟" مارگریٹ کا چہرہ اُتر گیا۔

"ہاں" جارج نے گنگناتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا وہ میری جگہ آئی تھی؟"
"ہاں، میرا مطلب ہے۔"
"خوب" مارگریٹ نے مایوسانہ تلخی سے کہا۔ "شادی اور کام ایک ساتھ چلتے ہیں۔ تم اگر ایک مرتبہ شادی کا فیصلہ کرلو تو یہ تک نہیں دیکھتے کہ کس سے شادی کر رہے ہو، بس اس لڑکی کے لیے تمہاری سیکرٹری ہونا ضروری ہے؟ تمہارا یہ کاروباری انداز بلاشبہ منفعت بخش ہے۔" مارگریٹ عجیب انداز میں ہنسی۔ "خیر اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میری واپسی پر مجھے خوش آمدید کہنے والا صرف میرا باپ ہے، معلوم نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ کم از کم وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"
"مارگریٹ تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"
"کہو کہو میرے جارج، میرے پرستار۔"
"مارگریٹ تمہارے والد۔۔۔ وہ پچھلے سال بیمار ہوگئے تھے اور آپریشن بہت ضروری تھا لیکن۔۔۔۔۔"
"لیکن ان کے پاس آپریشن کے لیے پیسے نہیں تھے اس لیے وہ مر گئے؟" مارگریٹ ہذیانی انداز میں چیخی۔ "یقیناً تم یہی کہنا چاہتے ہو، تم اور کہہ بھی کیا سکتے ہو، جتنے تیر ہیں، ابھی چلالو۔"
"مجھے بے حد افسوس ہے مارگریٹ" جارج نے دھیمے لہجے میں کہا۔
مارگریٹ اپنے آنسو ضبط نہ کرسکی۔ جارج کرسی سے اُٹھ کر بے وقوفوں کی طرح اسے تسلی دینے لگا۔

پولیس والوں میں بھی انسانی ہمدردی کی رمق تو ہوتی ہوگی مگر اس پُرہجوم پنڈ لیہ۔۔۔ وہ لوگ بے حد مصروف تھے اور شکایتیں درج کرانے والوں کا تھانے ٹہلتے ٹہلتے۔۔۔ محسوس ہوتے۔۔۔ تھا۔ مارگریٹ بھی قطار میں لگ گئی۔ وہ ایک لمبی سی بنچ پر بیٹھی بے د۔۔۔ پنی باری کا انتظار کر رہی تھی، اس کا ذہن مستقبل کے متعلق گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
ضرور تم مجھے آدھی زندگی۔۔۔ اپنی نئی سیکرٹری سے شادی کرنے والا تھا۔ اس کے والد کا وہ بھی صرف دو۔۔۔ منزلہ فلیٹ۔۔۔ گئے کار اور تنہا تھی، بینک میں اس کے صرف دو سو سے جگہ تنگ تھی۔ گھر۔۔۔ کے ساتھ ہمدردی اور تسلی کا برتاؤ کرنے کے لیے اب لگے۔۔۔ گیا۔۔۔ رہ گیا تھا جو دنیا کے ہر قانون کی طرح کاغذ کے

بے جان صفحات پر خوبصورت انداز میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔
اس کے آگے والی عورت اپنی شکایت درج کرانے لگی تو مارگریٹ اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھی اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر دوبارہ ڈگلس کی عالیشان کوٹھی پر پہنچ گئی۔ اس نے ڈرائیور سے دس ڈالر انعام کے عوض انتظار کرنے کے لیے کہا اور بھاگتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوگئی، اس نے اطلاعی گھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔
ڈگلس نے دروازہ کھولا، وہ بے حد تھکا ہوا اور شکست خوردہ نظر آرہا تھا۔ اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بوجھل تھیں۔
"تم۔ تم آگئیں" ڈگلس نے حیرت زدگی سے پوچھا۔
"اوہ میرے خدا، تم گھر میں موجود ہو، ڈگلس" مارگریٹ نے جلدی جلدی کہا "میں خوفزدہ تھی کہ مجھے گھر میں نہ پاکر کہیں تم خود بھی فرار نہ ہوجاؤ"
"نہیں، مارگریٹ" ڈگلس نے اُداسی سے جواب دیا "تمہارے جانے کے بعد مجھے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ میرا کیا حشر ہوگا۔ بھلا تمہارے بغیر میرے لیے زندگی میں کیا کشش ہے؟ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ تم پولیس کو اس واقعے کی اطلاع نہیں دو گی، نہ جانے کیوں؟ شاید اس لیے کہ تین سال کی یہ رفاقت میرا اعتماد بحال کیے ہوئے تھی جب اتنے دنوں تک دو انسان ساتھ رہیں تو چاہے حالات کیسے بھی ہوں وہ ضرور ایک دوسرے سے مانوس ہوجاتے ہیں، محبت کرنے ہی لگتے ہیں اور پھر میں نے تو تم سے محبت کی ہے۔"
"ہاں یہ سچ ہے" مارگریٹ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
"سنو ڈگلس، چلو کہیں دور چلو۔ اس قید خانے سے مجھے ہول آتا ہے، شاید تم بھی اس میں میری ہی وجہ سے رہنے پر مجبور تھے، اب ہم یہاں ایک رات کے لیے بھی نہیں رہ سکتے۔ جلدی سے تم ضرورت کی چند چیزیں سوٹ کیس میں رکھ لو ہم یہاں سے ہمیشہ کے لیے چل رہے ہیں"
ڈگلس نے آگے بڑھ کر مارگریٹ کو زور سے باہوں میں سمیٹ لیا جس کی سپردگی کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ اس کے لبوں میں آج شیرینی تھی۔ وہ دیر تک ایک دوسرے میں گم رہے۔
"سنو ڈارلنگ" مارگریٹ نے کسمسانے اور روتے ہوئے کہا "مجھے چھوڑ دو، میں اب تمہارا اعتبار ہوں، جلدی سے اندر جاکر سامان لے آؤ باہر ٹیکسی کھڑی ہے ٹیکسی والا زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرسکتا۔"

